جلد سوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ

مرتب

مولوی محمد زبیر قاسمی

فیضان معرفت

جلد سوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور
وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ
ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب
محمد زبیر
(استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

ناشر:

فیصل پبلیکیشنز دیوبند

اجمالی فہرست

فہرست مضامین

عناوین **صفحہ**

اللہ تعالی کی محبت کیسے ملتی ہے

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

ایک حدیث کی جدید اور انوکھی تشریح

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

معرفت الٰہی اوراس کے آثار

شیطانی حربے

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنایئے

نماز کو نماز کیسے بنائیں

بیعت کیا اور کیوں؟

اطاعت مومن کی حیات ہے

ملنے کا پتہ

مکتبہ مسیح الامت

۸۴ر آر مسٹرانگ روڈ، بیدواڑی، بنگلور

فون: 9036701512

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لأ هله و الصلوة لأهلها:

اللہ تعالی نے انسان کوصرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے ،اسی مقصد خداوندی کی تبلیغ کے لئے انبیاءکرام کا مبارک سلسلہ جاری ہوا، جوامام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم ہوا، آپ کے بعد اس عظیم کام کو حضرات اہل علم اور بالخصوص اولیاءعظام نے سنبھالا ،اورانہوں نے تصنیف وتالیف ،درس وتدریس ، وعظ ونصیحت کے ذریعہ امت تک اس امانت کوامانت داری کے ساتھ بحسن وخوبی پہنچایا۔ان صلحاء واولیاء کی صحبتیں اور مجلسیں انسانوں کے دلوں کو معرفت الٰہی ومحبت الٰہی کے نور سے منور کرنے میں ہرزمانہ میں مؤثر رہی ہیں۔

اسی سلسلۂ عالیہ کی کیمیااثری کانمونہ مربی ومرشدی فداہ ابی وامی حضرت اقدس دامت برکاتہم ہیں اور ویران دل کے تاروں کوچھونے والی آپ کی نورانی مجالس وملفوظات ہیں، جس کے مجموعہ ''فیضان معرفت'' کی جلد اول ودوم کو اللہ تعالی نے بے پناہ مقبولیت عطاءفرمائی، اور الحمد للہ سالکین طریقت کو اس سے بہت فائدہ پہنچا، جس کی وجہ سے بہت سارے احباب تیسری جلد کے منتظر تھے۔

اب اللہ تعالی کی توفیق اوراساتذۂ کرام کی محنتوں اوردعاوں کے نتیجہ میں بندہ کو جلد سوم کی ترتیب کی سعادت ملی۔ان مجالس کے مجموعہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ

حضرت والا اس پر از اول تا آخر نظر فرماتے ہیں، اور نہایت مفید اضافے فرما کر ترتیب کی خامی کی وجہ سے پیدا شدہ مضامین کی تشنگی کو دور فرماتے ہیں۔

نیز اپنے قیمتی مشوروں سے نواز کر احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہیں، اسی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ مجالس کی ترتیب کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔

اخیر میں میں حافظ سید محمد صہیب متعلم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم اور حافظ ومولوی حبیب الرحمٰن صاحب نائب امام مسجد بید کا ممنون ومشکور ہوں کہ انہوں نے مجالس کی ترتیب کے سلسلہ میں میرا بھرپور تعاون فرمایا، جس کے لئے میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطاء فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ پہلی اور دوسری جلد کی طرح تیسری جلد کو بھی مقبولیت عطاء فرمائے، اور ان مجالس کی ترتیب کے سلسلہ کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطاء فرمائے اور امت کو نفع پہنچائے اور میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے، اور حضرت اقدس دامت برکاتہم کا سایہ ہم پر تادیر قائم ودائم رکھے تاکہ ہم آپ کے علوم ظاہری وباطنی سے اور آپ کے مواعظ حسنہ سے اور آپ کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہیں۔

محمد زبیر
استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم
۱۵؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے

باسمہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے

الحمدللّٰه و کفیٰ وسلام علی عباده الذين اصطفیٰ . أما بعد فقد قال النبی ﷺ قال اللّٰه تعالی:"وجبت محبتی للمتحابين فیَّ و المتجالسين فیَّ والمتزاورين فیَّ والمتباذلين فیَّ (أو كما قال عليه الصلاة والسلام)(مؤطا امام مالك :١٧٤٨، مسند احمد:٢٢٦٥١)

میں نے ایک حدیث قدسی آپ کے سامنے پڑھی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ خبر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''میری محبت واجب ہوگئی ان لوگوں کے لیے جو میرے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اوران لوگوں کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی، ضروری ہوگئی، جو میری محبت کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہیں اوران کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی، جو میری محبت کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اورآخری جملہ میں فرماتے ہیں کہ ''ان لوگوں کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی جو میری ہی محبت کی خاطر مال ودولت خرچ کرتے ہیں)

یہ حدیث ایک عجیب قسم کی حدیث ہے، اس میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میری محبت کیسے ملتی ہےاور کب ملتی ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

سن لے اے دوست جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

اللہ اکبر! جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اور اس کا اچھا وقت آجاتا ہے تو خود وہی بتاتے ہیں کہ کیسے ملنا ہے ہم سے؟ کہاں ملنا ہے ہم سے؟ اور ملنے کی راہ کیا ہے؟ یہ سب باتیں وہ خود ہی بتلا دیتے ہیں۔ اور اگر کسی کے ایام بھلے نہیں آتے تو آدمی ٹکروں پر ٹکّریں کھاتا رہتا ہے، نماز بھی جاری، ذکر بھی جاری، تلاوت بھی جاری، سب جاری اور دوسری طرف سے فضیحت بھی جاری، اس لیے کہ اس کا بھلا وقت نہیں آیا۔

شیطان نے بہت سجدے مارے لیکن کیا اس کا کوئی سجدہ اس کے کام آیا؟ بہت سجدے کیے یہاں تک کہ بعض علماء لکھتے ہیں کہ زمین کا کوئی چپہ ایسا نہیں جہاں اس نے سجدہ نہ کیا ہو، چپہ چپہ پر اس کا سجدہ، لیکن اس کا سجدہ اسے کچھ بھی کام نہیں آیا، کیوں؟ اس لیے کہ اس کے لیے کہ بھلے ایام آئے ہی نہیں۔

اب دیکھئے کہ اللہ نے اپنی محبت کے حصول کا کیا پتہ دیا ہے؟ اس حدیث میں کل چار قسم کے لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ اپنی محبت عطاء فرماتے ہیں، ایک وہ جو ایک دوسرے سے اللہ کے لئے محبت کرتے ہیں، دوسرے وہ جو اللہ کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہیں، تیسرے وہ جو اللہ کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور چوتھے وہ جو اللہ کے لئے مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔

اور یہ چار الگ الگ قسم کے لوگ نہیں ہیں، بلکہ یہ چار وہ ہیں جن کے اندر یہ چاروں صفات یکجا ملتی ہیں، گویا کہ یہ چاروں کی چاروں صفات ایک ہی ذات کے اندر ملتی ہیں، اس لیے کہ وہ آپس میں لازم ملزوم ہیں، ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں۔ اور جب ایک پایا جائے تو دوسرے کے نہ پائے جانے کا کوئی سوال نہیں۔ لہٰذا اس حدیث سے یہ سمجھ میں آیا کہ اللہ کی محبت ان لوگوں کو ملتی ہے جن کے

اندر یہ چار صفات موجود ہوں۔لہذا اللہ کی محبت کا پتہ یہ ہے کہ ان چار صفات کو پالیں،جس کو یہ چار صفات مل گئیں اس کو اللہ کی محبت مل گئی۔

ہرایک اللہ کی محبت کا خواہاں ہے

بھائیو!ہم میں کون ایسا ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالی کی محبت اسے ملے؟ سب چاہتے ہیں کہ اللہ کی محبت ہم کو مل جائے، ہر آدمی کی آرزو ہے، جستجو ہے، تلاش ہے، تمنا ہے، خواہش ہے کہ اللہ کی محبت ملے، حتی کہ جو لوگ گناہوں میں ملوث ہیں، وہ لوگ بھی چاہتے ہیں کہ ان کو اللہ کی محبت حاصل ہو، آپ کسی شرابی سے پوچھ کر دیکھئے، اور کسی زناکار سے پوچھ کر دیکھئے، کسی فاسق اور فاجر سے پوچھ کر دیکھئے بلکہ کافر سے پوچھ کر دیکھئے وہ بھی اللہ کی محبت چاہتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے کہ اس چیز کی الفت اور محبت خدا نے سب کے دلوں میں ڈال رکھی ہے، اسی لیے اللہ کی معرفت انسان کی طبعی خواہش ہے، اللہ سے محبت انسان کی فطری آرزو ہے۔

جو مضطرب ہے اس کو ادھر التفات ہے

آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے

یہ الگ بات ہے کہ اسے شیطان بھٹکا بھٹکا کر غلط راہوں پر ڈالتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا، لیکن جہاں تک مسئلہ ہے نفس کی خواہش کا تو وہ ہر انسان کے دل میں ہے کہ اللہ کی محبت چاہئے اور اللہ کی معرفت چاہئے۔

پہلی صفت-اللہ والوں سے محبت

اب دیکھئے کہ اللہ کی محبت کن کن کو ملتی ہے؟ اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے سب سے پہلے فرمایا کہ ’’**وجبت محبتی للمتحابیین فی**‘‘ کہ اللہ کی محبت

ایک تو ان کو ملتی ہے جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

یہ بات بہت واضح ہے کہ اللہ کے لیے محبت اسی آدمی سے ہوسکتی ہے جو اللہ کا محبوب ولاڈلا ہے، ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ مثلاً کسی کافر سے محبت کریں اور کہیں کہ میں اللہ کے لیے ایک کافر سے محبت رکھتا ہوں؟ کسی فاجر سے، کافر سے اور کسی غلط کار انسان سے آپ محبت کریں اور پھر یہ دعویٰ کریں کہ میں اس آدمی سے جو محبت کر رہا ہوں وہ محض اللہ کی محبت کے لیے ہے تو یہ بات حدیث کے منشاء کے خلاف ہے، اور اس دعوے کے اندر کوئی واقعیت اور کوئی حقیقت نہیں۔

اس لیے یہاں لامحالہ مراد یہ ہے کہ اللہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں یعنی نیک لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد اولیاء اللہ کی اور نیک لوگوں کی محبت ہے۔

دوسری بات اس میں سمجھنے کی یہ ہے کہ ''متحابین'' عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ ''تحابب'' سے بنا ہے اور اس میں اشتراک پایا جاتا ہے، اس لئے اس کا ترجمہ ہے ''آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنا'' لہذا ''متحابین'' دو قسم کے لوگ ہوں گے: ایک محبت کرنے والے ہوں گے اور ایک وہ ہوں گے جن سے محبت کی جائے، اسی وقت ''متحابین'' کا اطلاق صحیح ہوتا ہے، تو اب مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ محض اللہ کی محبت میں اللہ کے محبوب بندوں سے محبت کریں گے اور دوسرے وہ لوگ جو اللہ کے محبوب ہیں وہ بھی ان لوگوں سے اس لیے محبت کریں گے کہ یہ اللہ کو چاہتے ہیں، اور اللہ کی محبت حاصل کرنے ان کی خدمت میں آئے ہیں۔ادھر سے بھی محبت کا تحقق ہو، ادھر سے بھی محبت کا تحقق ہو، جب دونوں طرف سے تحقق محبت کا ہوا تو اشتراک ہوگیا۔

لہٰذا اولیاء اللہ کی خدمت میں جانا ہے؛ کیوں؟ ان سے محبت رکھنا ہے؛ کیوں؟ ان سے تعلق رکھنا ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ ان سے محبت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنی محبت ضرور بالضرور دیتے ہیں۔

ان سے ملنے کی ہے یہی یک راہ
ملنے والوں سے راہ پیدا کر

ارے جناب! اگر آپ اللہ کو چاہتے ہیں تو انہیں لوگوں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس اللہ ملے گا، چاول خریدنے انھیں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس چاول ملے گا، سونا خریدنے انھیں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس سونا ملے گا، اگر کسی آدمی کو سونا چاہئے اور وہ چلا گیا لوہار کے پاس تو اسے کبھی بھی سونا نہیں ملے گا۔ اسی طرح کافر کے پاس کفر ملے گا، فاسق کے پاس فسق ملے گا، خدا کی محبت نہیں ملے گی، جن کے پاس خدا کی محبت ہے وہ ہیں اولیاء اللہ، ان کے دلوں کے اندر جو خدا کی محبت ہے، اس کو پانے کے لیے ان سے محبت کیجئے۔ یہ ہے حاصل اس حدیثِ پاک کا۔

اللہ کے لئے محبت کرنے والوں کا مقام

ایک حدیث میں ہے، اللہ کے نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ فرماتے ہیں: ''أَلْمُتَحَابُّوْنَ فِي جَلَالِي لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّوْنَ وَ الشُّهَدَاءُ'' (جو لوگ میرے جلال کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں، ان کے لیے قیامت کے دن نور کے ممبر بچھائے جائیں گے اور ان کو دیکھ کر انبیاء اور صدیقین بھی رشک کریں گے)۔ (ترمذی: ۲/ ۶۴، مسند احمد: ۲۲۰۸۰)

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام دعاؤں میں مسلسل

ایک دعا یہ بھی کرتے تھے:

﴿ أَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يَّنْفَعُنِي حُبَّهٗ عِنْدَكَ ﴾

(اے اللہ! مجھے تیری محبت عطاء فرما اور اس شخص کی بھی محبت عطاء فرما جس کی محبت تیرے نزدیک کام آنے والی ہے) (ترمذی:۲/۱۸۷)

اللہ کے نبی دعاء میں کہہ رہے ہیں: اے اللہ! اس شخص کی بھی محبت عطاء فرما جس کی محبت تیرے پاس مجھے کام آنے والی ہے۔ سب سے بڑے تو حضور ہی ہیں، ان سے بڑا تو کوئی نہیں حتی کہ انبیاء بھی نہیں، آپ سردارِ انبیاء ہیں، آپ سید الاولین والآخرین ہیں، آپ سید الکائنات ہیں، آپ سید الانبیاء ہیں، سید المرسلین ہیں، آپ امام الانبیاء ہیں، آپ سے بڑا تو کوئی نہیں، اس کے باوجود یہ دعاء مانگنا دراصل ہمیں اور آپ کو اللہ والوں کا مقام بتانے اور سمجھانے کے لیے ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ والوں کی محبت مطلوب عندالشرع ہے۔ اور دوسری بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اللہ کے ولیوں سے محبت رکھیں گے تو اللہ کے نزدیک وہ کام بھی آئے گی، کبھی ان کی سفارش ہو جائے گی، کبھی ان کی دعاء لگ جائے گی۔

بعض بزرگانِ دین نے ایک عجیب بات فرمائی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے دلوں میں جھانکتے ہیں، اور ان کے دلوں میں جن جن کی محبت ہوتی ہے ان کو بھی مقبول بنا دیتے ہیں۔

اللہ اکبر! گویا اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: یہ میرے بندے کا دل ہے اور اس دل میں دیکھو فلاں فلاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ بندہ ان بندوں سے محبت کرتا ہے، جب ان سے یہ بندہ محبت کرتا ہے تو پھر میں ان کو بھی قبول کر لیتا ہوں۔

اہل اللہ کے جلیس محروم نہیں ہوتے

اسی لیے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو اولیاء اللہ سے تعلق رکھنے والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو ہمیشہ محفوظ و مامون رکھتا ہے، جو اولیاء اللہ سے محبت کے ساتھ دین سیکھتے ہیں، اولیاء اللہ کی سرپرستی میں عمل سیکھتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دین پر چلنا انگلی پکڑ پکڑ کر سیکھتے ہیں، جیسے بچہ اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھتا ہے تو انشاء اللہ! اللہ تعالیٰ ان کو کفر سے، شرک سے، بدعت سے، ضلالت وگمراہی سے محفوظ و مامون رکھیں گے۔

ایک حدیث ذہن میں آ گئی، وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے ایک طویل حدیث میں فرمایا کہ اللہ کے فرشتے راستوں میں ذاکرین کو تلاش کرتے رہتے ہیں، جب وہ اللہ کے پاس جاتے ہیں تو اللہ تعالی ان سے اہل ذکر کے بارے میں پوچھتے ہیں پھر فرماتے ہیں کہ تم گواہ رہنا کہ میں نے ان کی مغفرت کر دی، تو ایک فرشتہ کہتا ہے کہ اے اللہ! ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو ذکر کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی حاجت کی وجہ سے وہاں آیا تھا، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ: ''**هُمُ الْجُلُسَاءُ لَايَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ**'' (یہ اہل ذکر وہ لوگ ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں ہے)
(بخاری: ۶۴۰۸، صحیح ابن حبان: ۱۳۵/۳)

اولیاء اللہ سے محبت وتعلق کا فائدہ، امام رازی کا واقعہ

اولیاء اللہ سے تعلق ومحبت رکھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالی ان کی وجہ سے ہمیں نواز دیتے ہیں، اور ایمان محفوظ رہتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ امام رازیؒ ایک جلیل القدر عالم، فاضل، مفسر اور اسی کے ساتھ ساتھ آپ بہت بڑے

فلسفی منطقی تھے، آپ نے محبت خداوندی کی خاطر ایک اللہ والے سے بیعت کی، شیخ نے اذکار ووظائف بتائے رات میں اٹھکر تہجد پڑھنے کو کہا، ذکر کرنے کا حکم دیا۔

امام رازی حکم کے مطابق جب ذکر کے لیے رات میں بیٹھتے تو ان کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اندر سے ایک دھواں نکل رہا ہے، انھوں نے چند دن تو دیکھا، اس کے بعد اپنے شیخ کے پاس جا کر شکایت کی کہ حضرت! میں ذکر کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کے اندر ایک آگ ہے، اس کا دھواں نکل کر میرے منہ سے باہر جا رہا ہے۔

شیخ نے کہا کہ یہ اللہ کی محبت کی آگ ہے جو دل میں لگ رہی ہے، اور تمہارے فلسفہ اور منطق کے علوم کو جلا رہی ہے، اسی کا یہ دھواں ہے۔ امام رازی کو یہ سن کر بڑا افسوس ہوا، اس لیے کہ ان علوم کے پیچھے تو عمر لگائی تھی، زندگی کھپائی تھی، بڑا پیسہ خرچ کیا تھا، رات رات جاگتے رہے تھے، اپنا سارا آرام اور عیش اس کے پیچھے گنوا ڈالا تھا، یہاں تک کہ دنیا میں منطقیوں اور فلسفیوں کے امام قرار پائے۔

تو امام رازی نے کہا کہ اتنا سارا علم جو میں نے اتنی محنت اور مجاہدہ سے حاصل کیا ہے، اگر وہ جل کر خاک ہو جاتا ہے تو یہ مجھے منظور نہیں ہے۔ اس لیے واپس چلے آئے، لیکن آگ تو اندر لگ چکی تھی، وہ ایک چنگاری کی شکل میں اندر دبی رہی، زمانہ گزرتا رہا، گزرتا رہا، پھر ایک وقت وہ آیا جو ہر انسان کے لیے اللہ نے مقدر کر رکھا ہے یعنی موت کا وقت۔ موت کے وقت شیطان بہکانے کے لیے آیا اور اس نے امام رازی سے بحث شروع کر دی کہ تم اللہ کو ایک مانتے ہو؟ بتاؤ کیا دلیل ہے؟ امام رازی نے اپنے دماغ سے ایک سو دلیلیں اللہ کی وحدانیت پر فلسفیانہ منطقیانہ تیار کی تھیں۔

امام رازی نے دلیل پیش کی، لیکن شیطان تو ان سے بھی بڑا فلسفی تھا، اس نے

اس دلیل میں نقص وعیب نکال دیا، امام رازی نے کہا کہ یہ دلیل چھوڑو، دوسری لو۔ اس نے اس دلیل میں بھی کوئی کسر نکال دی۔ انھوں نے تیسری دلیل پیش کی، شیطان نے اس کے اندر بھی کوئی کھوٹ نکال دیا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ انھوں نے ننانوے دلیلیں پیش کیں اور اس نے سب کو توڑ دیا۔ اب روح قبض ہونے والی ہے، شیطان ادھر بہکانے میں مشغول ہے، اسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے شیخ کو الہام کیا، وہ اس وقت وضو کر رہے تھے، ان کے قلب پر الہام ہوا کہ تمہارے وہ مرید جو آئے تھے تمہارے پاس اور تم نے میری محبت کی آگ ان کے دل میں لگا دی تھی لیکن وہ پھر بھی واپس ہوگئے تھے۔ آگ لگ جانے کے بعد میں کسی کو محروم نہیں کیا کرتا، ذرا ان کی طرف آپ توجہ کریں۔ امام رازیؒ کی وہ گفتگو جو شیطان کے ساتھ چل رہی تھی، اللہ نے اِن بزرگ کو پہنچا دی، شیخ کو آواز آئی اور وہ سن رہے تھے۔

شیخ نے کہا کہ یہ کیا بحث ومباحثہ میں مبتلا ہو، کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں بے دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں۔ یہ دلیل، وہ دلیل، یہ کیا دلیلیں ہیں؟ اللہ نے کہہ دیا کافی ہے ہمارے لیے، اب کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ امام رازی کو اللہ نے شیخ کی آواز سنائی، شیخ کی وہ آواز کان میں آتے ہی امام رازی کی زبان سے نکلا کہ میں بے دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں۔ جب یہ کہا تو اسی وقت ان کی روح قبض ہوگئی اور شیطان بھاگ گیا۔

معلوم ہوا کہ جو اس راستہ پر چل پڑا، جو اس راستہ میں داخلہ لے لیا وہ کبھی محروم نہیں ہوگا، اللہ کبھی نہ کبھی اس کو پہنچا ہی دیتے ہیں۔

اللہ کے ولی کا ادب اور مغفرت، امام احمد بن حنبل کا واقعہ

بزرگوں کے واقعات میں لکھا ہے کہ امام احمد ابن حنبلؒ کے زمانہ میں ایک شخص کا انتقال ہوا۔ کسی کے خواب میں وہ شخص آیا تو اس نے پوچھا کہ بھائی! تیرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا معاملہ ہوا؟ تو اس نے کہا کہ اللہ کے فضل سے میری مغفرت ہوگئی۔ پوچھا کہ کس بنیاد پر مغفرت ہوئی؟ کہا کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھے وضو کرنے کی ضرورت پڑی تو میں وضو کرنے کے لیے ایک نہر کے کنارے پہنچا، میں نے دیکھا کہ نیچے کی طرف امام احمد بن حنبلؒ بیٹھ کر وضو کر رہے ہیں تو میں نے یہ خیال کیا کہ وہ وہاں وضو کر رہے ہیں، مجھے بھی وضو کرنا ہے، اگر میں یہاں بیٹھ کر وضو کروں گا تو میرا غسالہ (اعضاء کا دھویا ہوا پانی) ان کی طرف جائے گا اور ان کے وضو کے پانی میں ملے گا، یہ ادب کے خلاف ہے، اس لیے مجھے وہ جہاں بیٹھے ہیں اس سے نیچے بیٹھ کر وضو کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں وہاں سے اٹھا اور امام احمد بن حنبل جہاں بیٹھے تھے، اس کے نیچے جا کر میں نے وضو کیا تا کہ ان کا غسالہ میری طرف آئے گا تو مجھے بھی کچھ تبرک حاصل ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس ادب پر میری بخشش ہوگئی۔

اس واقعہ میں غور کیجئے کہ اللہ والے کا ایک معمولی ادب کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مغفرت جیسی عظیم دولت عطاء فرمادی، جو شخص ہمیشہ ان کی اتباع کرے تو اسے کیا کچھ اللہ تعالیٰ نہیں دیں گے۔ اسی لئے بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ: "هُمْ قَوْمٌ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ" کہ یہ اولیاء اللہ کی قوم وہ قوم ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ (بخاری: ۶۴۰۸)

دوسری صفت - مجالست

آگے حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی محبت پانے والوں کی دوسری صفت

بیان کی کہ "والمتجالسین فیّ"(جو میرے لئے مصاحبت اور مجالست اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی)

مجالست ومصاحبت کیا ہے؟ کہ نیک لوگوں کی صحبت ومعیت میں رہا جائے، ان کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا ہو۔ اس حدیث میں مجالست پر اللہ کی محبت دیئے جانے کا ذکر ہے کہ جو اللہ والوں کے پاس اٹھتا بیٹھتا ہو اس کے لئے بھی اللہ کی محبت واجب ہوگئی۔

اے اللہ کو چاہنے والو! اگر تم واقعۃً اللہ کے طالب ہو تو جاؤ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو۔ اس سے اللہ کی محبت تم میں بھی منتقل ہو جائے گی۔

کیسے؟ سنو کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "نیک لوگوں کی صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی عطار ہو اور آدمی اس کے پاس پہنچے تو جب تک اس کے پاس رہے گا، ہوسکتا ہے کہ وہ خود اسے عطر لگا دے، عطر پیش کر دے، اگر نہیں تو کم از کم جب تک وہاں بیٹھا رہے گا، اس کا دل ودماغ عطر کی خوشبوؤں سے معطر ہوتا رہے گا اور فرمایا کہ بری صحبت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی کسی لوہار کے پاس اس کی بھٹی میں جا کر بیٹھ جائے، جب تک وہاں بیٹھے گا یا تو یہ ہوگا کہ اس کے کپڑے جلیں گے، کہیں چنگاریاں آئیں گی، اس کو جلائیں گی، اگر یہ نہیں ہوگا تو کم از کم از کم وہاں کے دھوئیں سے اس کا دماغ مکدر ہو جائے گا۔ (بخاری: ۲۸۲/۱، مسلم: ۳۳۰/۲)

اسی طرح نیک صحبت میں جب بیٹھے گا، اللہ کے ولیوں کی صحبت میں بیٹھے گا، نیک کردار لوگوں کی صحبت میں بیٹھے گا تو وہاں اللہ کا ذکر ہوتا رہے گا، رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہوتا رہے گا، دین کا ذکر ہوتا رہے گا، دین کی فکر ہوتی رہے گی، دل ودماغ اس کی

وجہ سے معطر ہو جائے گا اور جب تک ان کے ساتھ بیٹھے گا دماغ کے اندر صالح تبدیلیاں بھی شروع ہو جائیں گی، اگر طبیعت میں ایسی تبدیلی پیدا ہوگئی جو پائیدار ہو تو پھر بیڑہ پار ہو جائے گا، اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو جب تک بیٹھے گا اس وقت تک تو یہ ہوگا کہ اس کے دل میں نیکی کا جذبہ وخیال، آخرت کی فکر وتڑپ پیدا ہو جائے گی۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے ایک عمدہ مثال سے سمجھا دیا ہے۔

معلوم ہوا کہ نیک صحبت بہت ضروری ہے، نیک لوگوں کی مجلس کا اثر ضرور مرتب ہوتا ہے، دنیا کے اندر آپ دیکھ لیجئے، بڑی مجلسیں ہوتی ہیں، بری بھی ہوتی ہیں، اور اچھی بھی ہیں، مختلف قسم کی ہیں، دنیوی بھی ہیں، دینی بھی ہیں۔ ہر مجلس کا رنگ الگ ہوتا ہے، ہر مجلس کا اثر الگ ہوتا ہے، ہر مجلس کی کیفیت الگ ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ مجالس وصحبتوں کا اثر ضرور ہوتا ہے اور مجالس کا اثر صاحب مجلس کی وجہ سے ہوتا ہے۔

خود قرآن کریم نے بھی اس کا حکم دیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہا کرو) (التوبة: ۱۱۹)

اس میں "كُوْنُوْا" فرمایا گیا، اس کے معنی ہیں "رہا کرو" ایک دفعہ رہو نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر استمرار ہے، ہوسکتا ہے کہ کوئی طالب علم سوال کر بیٹھے کہ اس میں استمرار کہاں سے آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی داں جانتے ہیں کہ امر کا صیغہ مضارع سے بنتا ہے، جب مضارع سے بنتا ہے تو مضارع کی خصوصیات بھی اس کے اندر رہتی ہیں، لہذا مضارع میں تجدد بھی ہوتا ہے، مضارع کے اندر استمرار بھی ہوتا ہے، تو امر میں بھی استمرار اور تجدد پایا جائیگا۔

تو "کونوا" کا ترجمہ ہے، اولیاء اللہ ساتھ مستقل رہا کرو، یہ نہیں کہ ایک دفعہ جا کر پھر اس کے بعد بند کردو۔

مجالس کا اثر مرتب ہونے پر ایک حسی مثال

بھائیو! مجالس کا اثر کس طرح مرتب ہوتا ہے اس کو ایک حسی مثال سے سمجھئے، کہ اگر کسی جگہ دو چار آدمی بیٹھ کر ہنس رہے ہوں، کسی بات پر کوئی تبصرہ انہوں نے کیا، کسی بات کا تذکرہ کیا اور اس میں کسی بات پر ہنسی آ گئی اور سب ہنسنے لگے، اسی ہنسی کے موقعہ پر آپ وہاں پہنچ گئے، اور وہ لوگ برابر ہنسنے میں مشغول ہوں۔تو آپ بتائیے کہ آپ وہاں روئیں گے یا خاموش بیٹھے گے، یا آپ بھی ہنسیں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ بھی ضرور ہنسیں گے۔اب یہاں سوال یہ ہے کہ آپ نے تو کچھ سنا نہیں کہ بات کیا ہے، آپ کو بالکل معلوم نہیں ہے کہ اہل مجلس کیوں ہنس رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ بھی ہنسیں گے۔ یہ ہے اثر کا منتقل ہونا، ان کے ہنسنے کا اثر آپ کے دل پر پڑ رہا ہے، اور آپ کو بھی ہنسی آ رہی ہے۔

بالکل اسی طریقہ پر ایک جگہ پر چند لوگ بیٹھے ہوئے رو رہے تھے اور آپ کو بالکل خبر نہیں تھی کہ وہ کیوں رو رہے ہیں، اپنی کسی بیماری سے رو رہے ہیں، کسی پریشانی سے رو رہے ہیں، کسی کے مار دینے سے رو رہے ہیں، یا اور بھی کوئی بات ہوسکتی ہے۔اتفاق سے آپ اس مجلس میں پہنچ گئے تو خود بخود آپ کو بھی رونا آ جائے گا، بغیر وجہ کے جانے آپ بھی رونا شروع کردیں گے۔اگر آپ سے پوچھا جائے کہ آپ کیوں رو رہے ہیں۔آپ کہیں گے کہ مجھے پتہ نہیں ہے۔ یہ ہے مجلس کا اثر۔

اسی طرح مجالسِ اولیاء کے ذریعہ سے غیر شعوری طور پر علوم منتقل ہوتے ہیں، معرفت منتقل ہوتی ہے، محبت منتقل ہوتی ہے، اور دیگر کیفیات باطنی منتقل ہوتی ہیں،

اس کا انکار کرنا بداہت کا انکار ہے، اس کا انکار دن کے اجالے میں سورج کے انکار کے مرادف ہے۔

مجلس کا اثر کیسے ہوتا ہے؟ ایک حکیم صاحب کا واقعہ

حضرت مولانا حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ کے ایک مرید تھے، انھوں نے ایک دفعہ حضرت تھانوی کے پاس خط لکھا کہ حضرت! میرے اندر غصہ بہت زیادہ ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ میری اصلاح ہو جائے۔ لہٰذا اس کے لیے کوئی نسخہ تجویز فرمادیں۔ وہ صاحب لکھنؤ سے قریب کے رہنے والے تھے۔

حضرت نے ان کو جواب لکھا کہ لکھنؤ میں میرے خلیفہ فلاں حکیم صاحب رہتے ہیں، فلاں جگہ پران کا مطب، کلینک ہے، تم ان سے اجازت لے کر ان کے پاس بیٹھ جایا کرو، وہ تو اپنے کام میں مشغول رہیں گے لیکن تم ان کے پاس جا کر بیٹھ جایا کرو اور یہ بھی لکھا کہ پندرہ دن تک بیٹھنے کے بعد مجھے خط لکھنا کہ کیا اثر ہوا۔

چنانچہ وہ صاحب پتہ تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے، حکیم صاحب کی کلینک مل گئی، اوران سے ملاقات کی اور کہا کہ حضرت نے مجھے ایسا لکھا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں بیٹھا کروں، اگر آپ اجازت دیں تو یہاں بیٹھ جایا کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ حکیم صاحب تو اپنے کام میں مشغول رہتے، بیماروں کی نبض دیکھتے، دوائیاں تجویز کرتے تھے، اور یہ صاحب ان کے قریب بیٹھے رہتے تھے۔ پندرہ دن کے بعد انھوں نے حضرت تھانوی کو خط لکھا کہ اللہ کا فضل ہے کہ غصہ بالکل کافور ہوگیا، انھوں نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ حضرت! غصہ تو میرا کافور ہوگیا، لیکن ایک سوال ذہن میں آگیا ہے کہ حکیم صاحب نے نہ مجھے کچھ کہا اور نہ میں نے ان سے کچھ کہا، صرف ان کے پاس بیٹھنے سے میرا غصہ کیسے ختم ہوگیا؟ یہ

فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت کے پاس خط آیا تو اس کا جواب لکھا کہ جی! نہ انہوں نے کچھ کہا، نہ تم نے کچھ کہا، لیکن ان کے دل میں جو حلم کا مادہ ہے، صحبت کی تاثیر سے وہ منتقل ہو کر تمہارے دل میں آ گیا۔ اللہ اکبر! یہ ہے تاثیر صحبت اولیاء کی۔

لہذا یہ نیک لوگوں کی مصاحبت ومجالست بہت ضروری ہے، مجالست ایک ذریعہ ووسیلہ ہے اللہ کی معرفت کو پانے کا، اللہ کی محبت کو پانے کا، اسی کا ذکر مذکورہ حدیث کے اندر کیا گیا ہے۔

تیسری صفت - اہل اللہ کی زیارت

اب تیسری صفت سنئے، اس حدیث میں آگے فرمایا کہ: ''والمتزاورين فی'' (کہ میری محبت ان کے لئے بھی واجب ہوگئی جو میری خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں) لہذا اللہ کی محبت پانا ہو تو ایک کام یہ کرنا ہوگا کہ اہل اللہ کی زیارت وملاقات کی جائے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ: ایک شخص نے اپنے ایک مومن بھائی کی زیارت کی جو دوسرے گاؤں میں رہتا تھا، تو اللہ نے اس کی حفاظت کے لئے ایک فرشتہ کو اس کے راستے پر مقرر کر دیا، جب وہ شخص چلتے ہوئے اس فرشتے کے قریب سے گزرا تو فرشتہ نے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے کہا کہ میرے بھائی جو اس گاؤں میں ہیں ان کے پاس جانے کا ارادہ ہے۔ فرشتہ نے پوچھا کہ کیا تمہاری کوئی اس سے رشتہ داری ہے؟ اس نے کہا نہیں، بلکہ صرف اللہ کے واسطے اس کی زیارت کو جا رہا ہوں، فرشتہ نے کہا کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اللہ نے تم کو بتایا ہے کہ اللہ بھی تم سے محبت کرتا ہے جس طرح تم اللہ کے لئے اس بندے سے محبت کرتے ہو۔ (مسلم: ۶۷۱۴، احمد: ۹۵۲۹)

بھائیو! جب اللہ کے واسطے اللہ کے محبوب بندوں کی زیارت کی جاتی ہے تو اللہ خوش ہوتے ہیں اور اس کو اپنی محبت عطا کر دیتے ہیں۔ اور بارگاہ الٰہی کے مقربین کی زیارت پر صرف آخرت ہی کی نعمتیں نہیں بلکہ دنیا کی نعمتیں بھی ملتی ہیں۔ ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی بندے کی اللہ کے لئے زیارت کرتا ہے اس کو ایک منادی پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ: تو خوش رہے اور تیرا سفر (یعنی آخرت کا سفر) بھی آرام سے ہو اور تو جنت میں اپنی منزل بنائے۔ (ترمذی:۲۱۳۹)

غور فرمائیے کہ اس میں دین و دنیا دونوں کی بھلائی کی اللہ کا فرشتہ دعاء دے رہا ہے، کہ تو دنیا میں خوش رہے اور آخرت کا سفر بھی آرام سے ہو اور جنت میں منزل بھی بنالے۔ یہ کس بات پر دعاء دی جاتی ہے؟ اللہ کے نیک بندوں کی زیارت کرنے پر، معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں کی زیارت و ملاقات کے لئے جانا چاہئے۔ یہ کام بہت بہترین کام ہے۔

مگر آجکل لوگوں میں اس کا رواج ہی ختم ہو گیا کہ اللہ والوں کی ملاقات و زیارت کی خاطر سفر کریں، ان کے مقام پر پہنچ کر ان سے استفادہ کریں۔ بلکہ اب کوئی بزرگ آجاتے ہیں تو لوگ بھیڑ کر کے ان کو دیکھ لیتے ہیں، اور وہ بھی ان کو تکلیف واذیت پہنچا کر دیکھ لیتے ہیں۔ مصافحہ کے لئے ایک دوسرے پر تشدد کرتے ہیں، خود ان کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ یہ زیارت کوئی زیارت نہیں۔ ادب کے ساتھ ان کے پاس جائیے، اگر دور ہوں تو سفر کیجئے۔

چوتھی صفت: اہل اللہ پر خرچ

اب ایک صفت آخری رہ گئی جس پر اللہ کی جانب سے محبت عطا ہوتی ہے، اور

اس کا ذکر اس جملہ میں کیا گیا ہے: ''والمتباذلین فی'' (کہ میری محبت ان کے لئے بھی واجب ہوگئی جو ایک دوسرے پر محض میرے واسطے خرچ کرتے ہیں) لہذا اللہ کی محبت پانا ہوتو اللہ کے راستہ میں اللہ کی خاطر خرچ بھی کرنا چاہئے۔ اس میں مدارس ودینی کاموں پر خرچ بھی داخل ہے، کیونکہ دین پر اور اہل دین پر خرچ اللہ ہی کے لئے ہوتا ہے، اس کا اور کوئی مقصد نہیں، اور نہ ہونا چاہئے، لہذا تمام دینی خدمات وکاموں پر، خواہ وہ مدارس ہوں یا خانقاہیں ہوں، یا مساجد ہوں یا تبلیغی ودعوتی کام ہوں، جہادی ضرورتیں ہوں، یا طلبہ کی ضروریات ہوں، ان سب پر خرچ اللہ کی خاطر خرچ میں داخل ہے، اور اس پر اس حدیث میں یہ وعدہ ہے کہ اللہ کی محبت ملے گی۔

سخاوت اولیاء اللہ کی صفت ہے

بزرگو! اسی وجہ سے سخاوت کو ولی کا خاصہ کہا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ:

﴿وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّأَسِيْرًا﴾ [الدھر:۸]

(وہ اللہ کی محبت میں مسکین ویتیم وقیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

ایک اور جگہ فرمایا گیا کہ:

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ [البقرۃ:۱۷۷]

(لیکن بھلائی یہ ہے کہ کوئی اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر، اور اللہ کی کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے، اور اللہ کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں،

مسکینوں اور مسافر کو مال دے)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: " مَا جَبَلَ اللّٰهُ تَعَالَى وَلِيًّا لَهُ اِلَّا عَلَى السَّخَاءِ " (اللہ نے اپنا کوئی ولی ایسا نہیں پیدا کیا جس میں سخاوت نہ ہو)(جمع الجوامع للسیوطی: ۶۵۰، بسند ضعیف)

حضرت علیؓ کی سخاوت کا واقعہ

ابھی جو سورہ دہر کی آیت او پر سنا تا آیا ہوں، وہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی کے یہاں فاقہ تھا، کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں تھی، آپ نے اس موقعہ پر ایک رات کسی کے باغ کو پانی سینچ کر ڈالنے کی مزدوری کی، اور اس کام پر صبح کو باغ والے نے کچھ ''جو'' دئے، آپ اس کو لیکر آئے اور گھر میں اس ''جو'' کے تین حصے بنا کر ایک حصہ چکی میں پسوایا اور اس سے خزیرہ نام کا ایک کھانا پکایا گیا، اور کھانے کے لئے بیٹھے تو ایک مسکین آیا اور دستک دی کہ اللہ کے نام پر کچھ دیدو، آپ نے اور گھر کے افراد نے وہ سارا کھانا فقیر کو دیدیا، پھر باقی آٹے میں سے کچھ نکال کر پکایا اور کھانے بیٹھے تو ایک یتیم آیا کہ اللہ کے نام پر کچھ دیدو، آپ نے یہ کھانا بھی اللہ کے نام پر اس یتیم کو دیدیا، اور آٹے کے آخری بچے ہوئے حصہ کو لیکر اس کو پکایا، اور کھانے بیٹھے تو ایک قیدی آیا اور سوال کیا، آپ نے یہ بھی اللہ کے نام پر دیدیا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اور اس میں آپ کی تعریف فرمائی گئی۔ (اسباب النزول واحدی: ۴۰۷)

بھائیو! یہ اللہ کا کرم ہی ہوتا ہے کہ کوئی سخاوت کا کام کیا کرے، اور یہ کرم حضرات صحابہ پر اللہ کا بے حد تھا، اس لئے وہ حضرات حیرت انگیز قسم کی سخاوت بھی کرتے تھے۔ جس کا ایک نمونہ یہ ہے۔

ؓبیک وقت ایک لاکھ اسی ہزار کی سخاوت

لیجئے، ایک اور حیرت ناک سخاوت کا واقعہ سنئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی خدمت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دو بوروں میں ایک لاکھ اسی ہزار درہم بھیجے، حضرت عائشہ نے ایک طباق منگوایا اور یہ ساری رقم لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا، جب شام ہوئی تو اپنی باندی سے فرمایا کہ میری افطاری لاؤ، باندی نے ایک روٹی اور زیتون کا تیل پیش کیا، حضرت عائشہ کی ایک خادمہ ام درہ تھیں، انھوں نے عرض کیا کہ کیا آپ نے جو مال تقسیم کیا اس میں ایک درہم کا گوشت ہمارے لئے نہیں خریدا جا سکتا تھا جس سے ہم لوگ افطار کرتے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اگر تم نے مجھے یاد دلایا ہوتا تو میں خرید لیتی۔

یہ حیرت انگیز قسم کی سخاوت ہے کہ خود تو یاد نہیں رہے، اور ساری دنیا پر لٹا دیا، اور رقم بھی کوئی معمولی نہیں، بلکہ ایک لاکھ اسی ہزار درہم، کیا ٹھکانہ ہے اس سخاوت کا!

حضرت ابن عباسؓ کی سخاوت کا ایک واقعہ

اسی طرح ایک واقعہ حضرت ابن عباس کا کتابوں میں لکھا ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس شہرہ بصرہ کے چند علماء آئے، اس وقت حضرت ابن عباس بصرہ کے گورنر تھے، انھوں نے کہا کہ ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں جو صوام وقوام یعنی دن بھر روزہ رکھنے والے اور رات بھر نماز پڑھنے والے، بڑے عابد وزاہد اور اللہ والے ہیں، ہم میں سے ہر شخص کی خواہش ہے کہ ان جیسے بن جائیں، انھوں نے اپنی لڑکی کا نکاح اپنے ایک غریب بھتیجے سے کر دیا ہے، اور وہ اس قابل نہیں کہ اپنی بیٹی کی رخصتی کا انتظام کر سکیں۔ یہ سن کر حضرت ابن عباس ان علماء کو

اپنے گھر لے گئے اور ایک صندوق کھولکر اس میں سے درہموں کی چھ تھیلیاں نکالیں اور فرمایا کہ یہ لے جاؤ، پھر کہنے لگے کہ ٹھیرو، یہ کوئی انصاف کی بات نہیں کہ ہم ایک شخص کی عبادت میں خلل ڈالدیں، لہذا مجھے بھی ساتھ لیتے چلو تا کہ ہم سب اس کی بیٹی کی رخصتی میں اس کی مدد کریں، دنیا اتنی قابل قدر نہیں کہ مومن کی عبادت میں اس سے خلل ڈالا جائے، اور ہم اتنے بڑے نہیں کہ اولیاء اللہ کی خدمت نہ کریں۔

ایثار سخاوت کا اعلی درجہ

بھائیو! ایک بات یہاں اور جان لیں کہ ایثار سخاوت کا اعلی درجہ ہے، اور ایثار کہتے ہیں خود پر دوسروں کو ترجیح دینا، خود کو بھوک لگی ہے مگر خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے، خود پیاسا ہے مگر دوسروں کو پلاتا ہے۔ حضرات صحابہ کی یہی خصوصیت تھی کہ وہ محض سخی نہیں تھے، بلکہ ایثار کرتے تھے۔ اسی لئے قرآن نے ان کی تعریف میں فرمایا کہ:

﴿ وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [الحشر: ۹]

(وہ حضرات اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود ان کو تنگی ہو)

یعنی خود کو بھوگ و پیاس وغیرہ کی پریشانی ہے، مگر اس کے باوجود وہ حضرات دوسروں کو دیتے ہیں اور خود صبر کر لیتے ہیں۔

صحابہ کا ایثار- واقعات کی روشنی میں

یہاں ان حضرات کے ایثار کی چند مثالیں سناتا ہوں، ان سے ان کے بلند مقامات کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوسکتا ہے۔

حدیث و تفاسیر کی کتابوں میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے

پاس آئے اور انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے سخت فاقہ لگا ہے۔آپ نے اپنی عورتوں سے معلوم کیا کہ کوئی چیز تم لوگوں کے پاس ہے؟ لیکن کسی جگہ بھی کوئی کھانے کی چیز نہیں تھی۔آپ نے اعلان کیا کہ کوئی ہے جو ہمارے مہمان کی آج رات مہمان نوازی کرے؟ تو حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے ،انھوں نے کہا کہ میں ان کی مہمان نوازی کروں گا۔پھر ان کو اپنے گھر لے گئے،اور اپنی بیوی سے کہا کہ مہمان رسول کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ چھوڑنا،ان کی بیوی نے کہا کہ آج ہمارے گھر سوائے بچوں کے کھانے کے کوئی چیز نہیں ہے۔انھوں نے کہا کہ بچوں کو بہلا پھسلا کر سلا دو،اور ہم بھی آج اللہ کے نبی کے مہمان کی خاطر بھوکے رہ جائیں گے اور جو کھانا ہے،اس کو لے آؤ،اور جب ہم کھانے بیٹھیں تو کسی بہانے سے چراغ بجھا دو،تا کہ مہمان سمجھیں کہ ہم بھی ان کے ساتھ کھا رہے ہیں۔ چنانچہ ان کی بیوی نے ایسا ہی کیا۔اس طرح مہمان کو سارا کھانا کھلا دیا اور خود وہ اور ان کے بیوی بچے سب بھوکے رہ گئے۔ جب صبح ہوئی اور یہ حضرات رسول اللہ کی خدمت میں گئے تو آپ نے فرمایا کہ فلاں مرد و فلاں عورت سے اللہ نے تعجب کیا اور ان کے بارے میں آیت نازل کی ہے۔

پھر یہ آیت سنائی: ﴿ وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [الحشر:۹]

(وہ حضرات اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود ان کو تنگی ہو) (الدر المنثور:۸/۱۰۷،الکشف والبیان للنیسابوری:۹/۲۶۹)

اسی آیت کے شان نزول میں بعض مفسرین کرام نے یہ واقعہ بھی روایت کیا ہے کہ ایک صحابی کو کسی نے بکری کی سری ہدیہ میں بھیجی،ان صحابی نے کہا کہ فلاں

بھائی صاحب اولاد ہیں، وہ مجھ سے زیادہ اس کے محتاج ہیں، لہذا ان کو دیدو۔ لہذا وہ سری ان کے گھر بھیج دی گئی۔ وہ دوسرے صحابی کہنے لگے کہ میرے سے فلاں صاحب محتاج ہیں، لہذا ان کو دیدو، وہ سری وہاں سے ایک تیسرے صحابی کے پاس پہنچی، اس طرح ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے گھر ہوتی ہوتی سات گھروں کا چکر لگا کر، اور بعض روایات میں ہے کہ نو گھروں کا چکر لگا کر وہ سری پھر پہلے صحابی کے پاس ہی آگئی۔ اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

(الدرالمنثور: ۸/۱۰۸، الکشف والبیان للنیسابوری: ۹/۲۶۹)

ایک اور حیرت انگیز واقعہ تاریخ نے محفوظ کیا ہے، وہ یہ کہ حضرت ابوجہم بن حذیفہ ایک صحابی ہیں اور انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی تھی، زمانہ جاہلیت بھی دیکھا اور زمانہ اسلام بھی دیکھا تھا، وہ کہتے ہیں کہ جنگ یرموک میں میرے چچازاد بھائی کو تلاش کرنے نکلا اور ساتھ میں ایک پانی کا مشکیزہ لے لیا تاکہ اگر وہ مل جائیں اور پانی کی ضرورت پڑے تو پریشانی نہ ہو، کہتے ہیں کہ میں نے ان کو ایک جگہ پالیا، وہ نزع کی حالت میں زخمی پڑے ہوئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ کیا میں تمہیں پانی پلاؤں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! اتنے میں ان کے قریب ایک اور شخص زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے انھوں نے آہ کی، میرے چچازاد بھائی نے کہا کہ پہلے ان کو پانی پلاؤ، دیکھا تو وہ حضرت عمرو بن العاص کے بھائی ہشام بن العاص تھے، میں ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ کیا پانی پلاؤں؟ تو انھوں نے کہا کہ ہاں! اتنے میں ایک اور شخص کے کراہنے کی آواز آئی، تو ہشام کہنے لگے کہ اس کو پہلے پلادو، حضرت ابوجہم کہتے ہیں کہ میں اس کے پاس پہنچا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا، لہذا میں ہشام کے پاس آیا، دیکھا تو ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے، یہ دیکھ کر میں اپنے چچازاد بھائی کے پاس آیا

کہ ان کو پانی پلا دوں، مگر جب ان کے پاس پہنچا تو ان کا بھی وصال ہو چکا تھا۔
(مختصر تاریخ دمشق: ۱۴۲/۸)

یہ تھے حضرات صحابہ جن کے دلوں میں اللہ و رسول کی محبت اس طرح سمائی گئی تھی کہ وہ ہر چیز کو اس کے لئے قربان کر سکتے تھے۔ یہ اللہ و رسول کے عاشقین بھی تھے اور محبوبین بھی تھے۔

ایک اللہ والے غلام کا کتے پر ایثار

صحابہ تو بہرحال صحابہ تھے، ان کے علاوہ بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے بے مثال سخاوت و ایثار کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ مجھے ایک غلام کا قصہ یاد آیا کہ عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنی ایک زمین کے سلسلہ میں ایک مقام پر گیا، وہاں ایک صاحب کے باغ میں بیٹھا تھا، دیکھا کہ ایک کالا غلام وہاں موجود ہے، اور کھانا کھا رہا ہے، اس کے پاس تین روٹیاں تھیں، اتنے میں ایک کتا آیا، اور اس غلام نے اس کتے کو ایک روٹی ڈالدی، کتا وہ روٹی کھا کر پھر آیا ، اس غلام نے ایک اور روٹی اس کو ڈالدی، کتے نے وہ بھی کھالی اور پھر آ کھڑا ہوا، اس غلام نے آخری روٹی بھی اس کو ڈالدی۔ عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں کہ میں یہ سارا ماجرا ایک طرف بیٹھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس غلام سے پوچھا کہ روزانہ تجھے کتنی خوراک ملتی ہے؟ اس نے کہا کہ یہی جو آپ نے دیکھی یعنی تین روٹیاں، عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ تو نے تو ساری روٹیاں کتے کو ڈالدیں، اب تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا کہ میں بس بھوکا رہ جاؤں گا۔ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو وہ کہنے لگا کہ اصل یہ ہے کہ یہ علاقہ کوئی کتوں کا نہیں ہے، یہ کتا کہیں دور سے بھوکا آیا ہے، میں نے یہ

اچھا نہیں سمجھا کہ میں تو کھالوں اور کتا کھڑا دیکھتا رہے۔

اللہ اکبر! یہ حیرت انگیز سخاوت وایثار ہے، جس کی نظیر ملنی مشکل ہے کہ خود بھوکا رہ کر کتے کو سارا کھانا کھلا دیا، آج لوگ اپنے بھائیوں تک کی طرف نظر نہیں کرتے، سگا بھائی پریشان ہے، خود فضول خرچی کرتے ہیں مگر اپنے بھائی کے کھانے پینے اور دوا دارو کا بھی خیال نہیں کرتے۔ ہمارے اسلاف کے یہ واقعات بتاتے ہیں کہ انھوں نے سخاوت کے ذریعہ مال لٹا کر محبت الٰہی کا خزانہ پالیا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ایک شخص کو اللہ کی محبت اپنا مال خرچ کر کے مل جائے تو اس سے سستا سودا کوئی نہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ

جیسے ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالی سے عرض کیا کہ اے اللہ! میں آپ کو پانا چاہتا ہوں۔ آپ کی قیمت کیا ہے؟ اگر آپ کی قیمت معلوم ہوجائے تو کوشش کر کے آپ کو پالوں گا۔ اللہ نے فرمایا کہ میری قیمت معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو کہ میری قیمت دونوں عالم ہیں۔ اس پر وہ بزرگ وجد میں آگئے اور اللہ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ! اگر آپ کی قیمت صرف یہ ہے کہ دو عالم دے دیئے جائیں تو یہ تو بہت سستا سودا ہے۔ کہنے لگے کہ

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ   نرخ بالا کن، ارزانی ہنوز

یعنی آپ نے اپنی قیمت دو عالم بتائی ہے، اپنی قیمت میں اضافہ کیجئے، کہ یہ تو بہت کم ہے۔ اس طرح اللہ کی محبت اگر دنیا کے ان معمولی ٹکوں کے بدلہ میں مل جائے تو بہت سستا سودا ہے۔

سخاوت کی بہت سی شکلیں ہیں

اب یہاں ایک بات اور سمجھ لیں کہ سخاوت صرف مال کی نہیں ہوتی ، بلکہ سخاوت بہت سی چیزوں کی ہوتی ہے۔ایک سخاوت تو مال کی ہوتی ہے جو مالدار لوگ کریں گے۔اور ایک سخاوت علم کی ہوتی ہے جو حضرات علماء کی جانب سے ہوتی ہے ،ایک سخاوت محنت و خدمت کی ہوتی ہے جو قوت و طاقت والوں کی طرف سے ہوتی ہے۔لہذا ہر شخص اپنے بساط اور اپنی استعداد کے مطابق سخاوت کر سکتا ہے۔کسی کے پاس مال نہیں ہے تو وہ اپنے علم یا محنت و خدمت کے ذریعہ سخاوت کرے،کسی کے پاس علم نہیں ہے تو وہ نیک لوگوں کی خدمت کرے ، اس طرح کسی نہ کسی طرح سخاوت کا درجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔اور اس سخاوت کا بھی یہی پھل ہے کہ اللہ اپنی محبت سے نوازتے ہیں۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی محبت و معرفت سے نوازیں اور اپنے محبوب بندوں میں شامل فرمائیں۔آمین۔

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

باسمہ تعالیٰ

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

ایک حدیث کی جدید اور انوکھی تشریح

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ . اما بعد : فقد قال النبی ﷺ ﴿ **أَلَا اِنَّ فِي الْجَسَدِ لَمُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّه وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّه ، اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ** ﴾

(بخاری:۱۳/۱، مسلم:۸۲/۲)

دینی بھائیو! میں نے ایک حدیث پڑھی ہے جس میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ:'' کان کھول کر سن لو کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ صحیح رہتا ہے تو جسم کا پورا نظام صحیح رہتا ہے اور اگر وہ ٹیڑھا ہو جائے ،خراب ہو جائے تو جسم کا پورا نظام خراب ہو جاتا ہے، جان لو کہ وہ لوتھڑا دل ہے''۔

یہ ایک بہت ہی اہم حدیث ہے، جس میں اصلاح قلب کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دل جسم کے اندر سب سے اہم ہے اور اسی پر جسم کا ظاہری نظام بھی قائم ہے اور باطنی نظام بھی ، لہٰذا دل کا نظام و سسٹم صحیح ہو تو جسم کا نظام صحیح رہتا ہے اور اگر دل کا سسٹم خراب ہو جاتا ہے تو جسم کا پورا نظام و سسٹم برباد ہو جاتا ہے۔

اس وقت میں اس حدیث کی تشریح کرنا چاہتا ہوں، اور اللہ نے اس حدیث کی توضیح وتشریح میں ایک بات میرے دل میں ڈالی ہے، اسی کو اس وقت پیش کروں گا۔

بزرگو! ابھی کچھ دیر پہلے یہاں جامعہ میں دوصاحبان ملاقات کے لئے آئے تھے، جوایک سافٹ ویر کمپنی میں کام کرتے ہیں، انھوں نے کچھ اصلاحی باتیں سننے کی خواہش کی، ان سے گفتگو کے دوران ایک مضمون دل میں آیا اوراسی کے ساتھ مذکورہ حدیث کامفہوم اوراس کی شرح بھی سامنے آگئی، میں نے ان کے سامنے اسی کوپیش کردیا، میں اسی کو یہاں آپ حضرات کوبھی سنانا چاہتا ہوں۔

خطاب میں مخاطب کی رعایت

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ موجودہ دور کمپیوٹر کا دور ہے، سافٹ ویر کا دور ہے، بنگلور بھی اس سافٹ ویر کی دنیامیں بہت آگے ہے، جوصاحبان آئے تھے وہ بھی سافٹ ویر کمپنی میں ملازمت کرتے ہیں، اس لئے میرے ذہن میں ایک بات اسی کے حوالہ سے آئی، کیونکہ خطاب میں مخاطب کی رعایت ضروری ہے، اگرمخاطب ہو جاہل اوراس سے خطاب کیا جائے عالمانہ وفاضلانہ تو وہ پوری بات نہیں سمجھ سکتا، اسی طرح مخاطب ہوعالم وفاضل اورخطاب میں وہ طریقہ استعمال کیاجائے جوایک عامی کے مناسب ہے تو یہ مناسب نہ ہوگا۔ پھراس میں بھی اگر ڈاکٹر سے اس کی اپنی اصطلاحات وزبان میں گفتگوکی جائے تو وہ بہت جلد مانوس ہوجاتا ہےاور بات کا اثر جلد قبول کرتا ہے، اگرمخاطب انجینئر ہےاوراس سے گفتگو میں اس کی اصطلاحات کا سہارالیاجائےتواس کا بڑااثر مرتب ہوتا ہے۔علماءکواس کی بھی رعایت کرنا چاہئے۔ الغرض میں نے جب دیکھا کہ یہ لوگ سافٹ ویرانجینئر ہیں تو میں نے انہی کی زبان میں گفتگوشروع کی۔

کمپیوٹر میں تین چیزیں ہیں

ان کے سامنے جوعرض کیا گیا خلاصہ اس مضمون کا یہ ہے کہ کمپیوٹر میں دو چیزیں

ہوتی ہیں: ایک کو ہارڈ ویر(HARD WARE) کہتے ہیں ،اور ہارڈ ویراس کا ظاہری جسم ہے، جونظر آتا ہےاور دوسری چیز سافٹ ویر(SOFT WARE) ہے، یہ دراصل کمپیوٹر کی جان وروح ہے۔پھر ہارڈ ویر میں ایک تو اس کی ہارڈ ڈسک (HARD DISK)ہوتی ہےاورایک اس کا مانیٹر(MONITOR)ہوتا ہے۔ اس طرح کمپیوٹر میں کل تین چیزیں ہوتی ہیں: ایک ہے مانیٹر،دوسری ہے ہارڈ ڈسک اور تیسری ہے سافٹ ویر(SOFT WARE)۔

اب سنئے کہ مانیٹر تو صرف یہ کام کرتا ہے کہ کمپیوٹر کے اندر کی چیزوں کو اسکرین پر دکھاتا اور ظاہر کرتا ہے،اس کے سوا اس کا کوئی کام نہیں۔اور ہارڈ ڈسک اس میں اصل چیز اور اس کی روح ہے،اسی سے کمپیوٹر کا پورا سسٹم چلتا ہے۔اور سافٹ ویر اس ہارڈ ڈسک میں ایک چیز ڈالی جاتی ہے،جب آپ سافٹ ویر اس میں ڈالیں گے تو وہ اس کو اخذ یعنی (catch) کرلے گا ،اور پھر اسی چیز کو مانیٹر کے ذریعہ دکھائے گا، مانیٹر کا کام صرف مظاہرہ کا ہے ،یعنی دکھانے کا،ڈسپلے کرنے کا ، اصل چیز یہ نہیں ہے، یہ دراصل کمپیوٹر کا جسم ہےاور ہارڈ ڈسک اس کمپیوٹر کے جسم کا دل ہےاور جو اس کے اندر سافٹ ویر بھرا ہوا ہوتا ہے، وہ دراصل اس کی روح ہے۔

ہارڈ ڈسک کو آپ پکڑ سکتے ہیں ، چھو سکتے ہیں ، دکھا سکتے ہیں، بتا سکتے ہیں، خرید کے اسے ہاتھ میں اٹھا کر لا سکتے ہیں،لیکن سافٹ ویر جو ہارڈ ڈسک کے اندر ڈالا جاتا ہے اس کو آپ پکڑ نہیں سکتے ،اس کو آپ چھو نہیں سکتے ، یہ ایک معنوی چیز ہے، جو ہارڈ ڈسک کے اندر داخل کردی جاتی ہے، جب آپ اسے اس کے اندر داخل کریں گے تو مانیٹر دکھائے گا کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں،اس کے اندر جو جو عجیب وغریب چیزیں ہیں، وہ سب اس کے اندر سے نظر آئیں گی ۔اور سافٹ ویر

ڈالے بغیر کمپیوٹر کوئی کام نہیں کرسکتا، اس کو کام میں لانا ہوتو سافٹ ویر اس میں داخل کرنا پڑے گا۔

انسان کی تمثیل کمپیوٹر سے

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب یہ سمجھو کہ اسی طرح انسان کی مثال ایک کمپیوٹر کی سی ہے، اور اس میں بھی دو چیزیں ہیں: ایک ہارڈ ویر ہے یہ اس کا جسم ہے، اور اس میں ایک ظاہری جسم ہے، یہ مانیٹر کے مانند ہے اور ایک اندرونی جسم ہے، یہ دل ہے، یہ ہارڈ ڈسک کی طرح ہے، اور یہ دونوں چیزیں انسان میں ہارڈ ویر کی طرح ہیں، اور اس ہارڈ ویر کو آپ پکڑ سکتے ہیں،، دیکھ سکتے ہیں، کسی کو دکھا بھی سکتے ہیں، دل کو بھی آپ نکالیں گے تو ہاتھ میں آ جائے گا، اور یہ دیکھا بھی جا سکتا ہے، اور دکھایا بھی جا سکتا ہے۔ اور دوسری چیز اس دل میں ڈالی جانے والی چیز ہے، جیسے ایمان وکفر، نیکی یا برائی، طاعت یا معصیت وغیرہ، یہ اس انسانی کمپیوٹر کا سافٹ ویر ہے۔

بھائیو! اب غور کرو کہ جس طرح کمپیوٹر سافٹ ویر کے بغیر کام نہیں کرتا، اسی طرح دل کے اندر ایمان ونیکی کا سافٹ ویر داخل کئے بغیر انسان بھی صحیح طور پر کام نہیں کرسکتا، لہذا ایک سافٹ ویر آپ کو اپنے دل کے اندر داخل کرنا پڑے گا، جو سافٹ ویر داخل کریں گے وہی آپ کے اعمال وافعال سے نظر آئے گا، وہی آپ کے اندر سے نظر آئے گا، اور یہ نظر آئے گا کہاں؟ مانیٹر میں، اور وہ مانیٹر انسان کا جسم ہے۔ سافٹ ویر کو رکھنے والی چیز ہارڈ ڈسک ہے اور ہارڈ ڈسک کے اندر جس سافٹ ویر کو آپ نے داخل کر دیا ہے، اس کا مظاہرہ کرنے کے لیے جسم مانیٹر ہے، اس میں آپ کے سارے عمل جو اندر سے آئیں گے، وہ مظاہرہ میں آئیں گے، اچھا عمل،

برا عمل، نیکی وطاعت کا عمل، برائی ومعصیت کا عمل، شر کا عمل، خیر کا عمل، شیطانی عمل، رحمانی عمل، سب اسی جسم پر ظاہر ہوگا، لیکن ظاہر کیسے ہوگا؟ دل کی وجہ سے ظاہر ہوگا، لیکن دل بھی یہ کام خود نہیں کرتا، بلکہ جو سافٹ ویر آپ اس میں ڈالیں گے، اسی سافٹ ویر کو آپ کے اعضاء سے دکھائے گا۔

یہ مثال میری سمجھ میں آئی اور مجھے یہ حدیث بھی سمجھ میں آئی کہ اللہ کے نبی کہتے ہیں کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے وہ دل ہے، جب وہ صحیح رہتا ہے، یعنی جب اچھا سافٹ ویر اس میں داخل کیا جاتا ہے، جب اسے صالح بنایا جاتا ہے، اسے ڈھنگ کا بنایا جاتا ہے، اس کے اندر بہترین چیزیں داخل کی جاتی ہیں تو جسم بھی صحیح وسالم رہتا ہے، اور اگر دل کی ہارڈ ڈسک میں کوئی گندہ سافٹ ویر ڈال دیا تو جسم سے بھی برائی وخباثت ہی ظاہر ہوگی۔

دل کے لئے ایمانی سافٹ ویر

اب سنئے کہ اعمال واخلاق جو جسم سے ظاہر ہوتے ہیں ان کے صحیح واچھے ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دل میں ایمانی سافٹ ویر داخل کئے جائیں، یہ ایمانی سافٹ ویر کیا ہیں؟ یہ محبت وعشق الٰہی، ذکر ویاد الٰہی، خوف وخشیت الٰہی، توکل و اعتماد علی اللہ، انابت وتوجہ الی اللہ، اخلاص وللّٰہیت، خشوع وخضوع، عشق رسول، عظمت رسول، خوف وفکر آخرت، زہد وقناعت، وغیرہ کے سافٹ ویر ہیں۔ مثال کے طور پر خوفِ خداوندی کا سافٹ ویر اس میں آپ داخل کردیں، محبت خداوندی کا سافٹ ویر آپ اس میں داخل کردیں، اور عشقِ محمدی کا سافٹ ویر آپ اس میں داخل کردیں اور اسی طریقہ پر آپ اس کے اندر اخلاص کا سافٹ ویر داخل کردیں، تواضع کا ایک سافٹ ویر داخل کردیں، اسی طرح بہت سارے یہ سافٹ ویر داخل

کئے جا سکتے ہیں، جب اس قسم کے سافٹ ویر اس میں داخل کردیں گے تو اب آپ کے اس مانیٹر سے یعنی جسم کے اعضاء سے، اسی طرح کے نیک وعمدہ اعمال وافعال آنے لگیں گے، اب اس سے تواضع چھلکتی ہے، اخلاص اس سے ظاہر ہوتا ہے، اللہ کا خوف محسوس ہوتا ہے، کبھی آنسو چھلک پڑتے ہیں، کبھی دل میں اللہ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہونے لگتی ہے، آدمی کا دل بھی، دماغ بھی سب اس سے متاثر ہوتے ہے، اللہ کی محبت آجاتی ہے، نمازوں کی طرف دل چلنے لگتا ہے، خشوع وخضوع کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، دماغ آخرت کے کاموں کی طرف چلنے لگتا ہے۔

یہ ساری باتیں جو آپ کے جسم کے مانیٹر سے ظہور میں آتی ہیں، یہ دراصل دل کی ہارڈ ڈسک کی وجہ سے ہیں بلکہ اس کے اندر جو پڑا ہوا سافٹ ویر ہے اس کی وجہ سے ہیں۔

شیطانی سافٹ ویر

اس کے برخلاف دل کو بگاڑنے والے سافٹ ویر بھی ہوتے ہیں، جو ایمانی سافٹ ویر کے برخلاف دل کو تباہ وبرباد کرتے ہیں، جیسے مثال کے طور پر اللہ سے غفلت کا سافٹ ویر، دنیا کی محبت کا سافٹ ویر، تکبر کا سافٹ ویر، یا ریا کاری کا سافٹ ویر، خواہش نفس کا سافٹ ویر، آخرت سے غفلت کا سافٹ ویر، وغیرہ۔ اور فرض کیجئے کہ آپ نے دل کی اس ہارڈ ڈسک میں جیسے دنیا کے لوگ کمپیوٹر میں غلط سافٹ ویر بھی داخل کردیتے ہیں۔ مثلاً اس کے اندر ناچ گانا، فحش وعریاں تصاویر، حیا سوز مناظر، یا ایمان سوز باتیں، اسی طرح مختلف قسم کی گندی اور خبیث قسم کی چیزیں، شیطانی قسم کے اعمال کے سافٹ ویر اس میں داخل کردیتے ہیں، اس طرح

کے شیطانی سافٹ ویر انسٹال کر دئے تو جو سافٹ ویر اس میں رہے گا، وہی نظر آئے گا، آپ اسے کھولیں گے تو ننگے ناچ بھی نظر آئیں گے، خباثتیں بھی نظر آئیں گی، شرارتیں بھی نظر آئیں گی۔

اسی طرح دل کے اندر اگر غلط سافٹ ویر آپ نے داخل کر دیا تو آپ کے اعمال سے بھی اور آپ کے جسم کے مانیٹر سے بھی وہی سب چیزیں چھلکیں گی۔

لہٰذا جو خبائث ورذائل ہمارے اعمال سے صادر ہوتے ہیں وہ دراصل دل کی ہارڈ ڈسک کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

حدیث مذکور کی شرح

اس تمہید کے بعد اب سنئے کہ اللہ کے نبی ﷺ اسی کو فرماتے ہیں کہ جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے:

''اِذَا صَلُحَتْ ''(جب یہ لوتھڑا صحیح رہتا ہے)، اچھا سافٹ ویر اس میں داخل کیا جاتا ہے ایمان کا، طاعت وعبادت کے چسکہ کا، محبت الٰہی کا، خوف الٰہی کا، تقوی وتزکیہ کا اخلاص وللّٰہیت کا، خوف وفکر آخرت کا تو پھر کیا ہوتا ہے:

''صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّه''(پورے جسم کا نظام صحیح طور پر قائم رہتا ہے) اور اس کے مانیٹر سے بھی اچھے اچھے اعمال، اچھی اچھی باتیں صادر ہوتی ہیں۔ زبان سے اللہ کا ذکر، دین کی باتیں، لوگوں کی بھلائی کی باتیں صادر ہوں گی، ہاتھ پیر سے نیک اعمال واخلاق کا ظہور ہوگا، کانوں اور آنکھوں سے بھی صلاح وتقوی نکلے گا۔

''وَاِذَا فَسَدَتْ''(اور اگر یہ لوتھڑا خراب وفاسد ہو جاتا ہے) غلط سافٹ ویر اس میں داخل کر دیا جاتا ہے، بے ایمانی کا، غفلت کا، معصیت کا، تکبر وعجب کا، دنیا

کی محبت کا، اور یہ دل کا ہارڈ ڈسک خراب ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

" **فَسَدَالْجَسَدُ کُلُّه** " (تو پورا جسم کا نظام خراب ہوجائے گا) پھر پورے جسم سے غلط ہی غلط چیزیں نظر آئیں گی، حیا سوز وایمان سوز اعمال صادر ہوں گے، کفر وشرک دکھائی دے گا، معصیت وگناہ کی باتیں ظاہر ہوں گی، نہ زبان ٹھیک چلے گی، نہ ہاتھ پیر صحیح کام کریں گے، نہ آنکھ وکان ڈھنگ وسلیقہ کے ہوں گے، الغرض سارا جسم غلط ہی کام کرے گا۔

حضرات صوفیاء کا کام

لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے دل میں اچھے اچھے سافٹ ویر داخل کرے اور برے وگندے سافٹ ویر سے پرہیز کرے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرات صوفیاء کا یہی کام ہے، وہ آپ کے دل کو نیکی وطاعت کے جذبات سے بھر دینا چاہتے ہیں، وہ اللہ کی محبت ومعرفت سے قلوب کو لبریز کرنا چاہتے ہیں، دنیا کی محبت سے دلوں کو خالی کرنا چاہتے ہیں، لہذا حضرات مشائخ کے یہاں جو محنت ہوتی ہے، اس محنت کا خلاصہ اگر آج کی کمپیوٹر کی زبان میں، سائنس کی زبان میں پیش کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ مشائخ دو کام کرتے ہیں: ایک یہ کہ آپ کو اچھے سافٹ ویر اپنے جسم میں داخل کرنے کی تلقین اور گندے سافٹ ویر سے دور رہنے کی تعلیم دیا کرتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ وہ خود یہ سافٹ ویر فراہم بھی کرتے ہیں، اس کی دکان انہی کے پاس ہے۔

دل کا سافٹ ویر کہاں ملے گا؟

اگر آپ کہیں کہ وہ ایمانی وروحانی سافٹ ویر کہاں ملے گا؟ یہ دنیا کے سافٹ ویر تو ہم کو مل جاتے ہیں، بہت سی کمپنیاں ان کو بناتی ہیں، اور اس کے ایڈورٹائیز آتے

رہتے ہیں ،اخبار میں ایڈورٹائیز، رسائل وجرائد میں ایڈورٹائیز،اسی طرح ٹیلی ویژن میں اس کا ایڈورٹائیز، ہر جگہ پر اس کا ایڈورٹائیز ہوتا ہے، بورڈ بہت بڑے بڑے لگے ہوئے ہیں، اوران کی کمپنیاں بڑی بڑی عمارتوں میں قائم ہیں ،نظر آتی رہتی ہیں۔مگر دل کا سافٹ ویر کہاں ملے گا؟

قرآن کریم نے اس کا جواب دیا ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴾ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور نیک لوگوں کے ساتھ رہو)

اگر جدید انداز میں موجودہ حالات کے پیش نظر یوں ترجمہ کریں تو بھی صحیح ہے کہ ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈر کا سافٹ ویر خرید لو) یہ آج کا جدید ترجمہ ہے،لوگ چاہتے بھی ہیں کہ جدید جدید ترجمے ہوں، لیجئے جدید ترجمہ میں کر رہا ہوں۔

اس پر سوال پیدا ہوا کہ یہ سافٹ ویر کہاں سے خریدیں؟ تو اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ:﴿وَكُوْنُوْامَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (نیک لوگوں کی مجلسوں کو چلے جاؤ، ان کے پاس یہ سافٹ ویر مل جائے گا) نیک لوگوں کی معیت میں،مجلس میں،صحبت میں،نیکوں کے قریب رہنے سے وہ سافٹ ویر تم کو مل سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی مجالس میں ، اولیاء اللہ کی صحبتوں میں اللہ نے وہ سافٹ ویر رکھ دیا ہے، جو آدمی ان کی صحبت میں بصدق دل رہتا ہے،اسے خریدنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، دنیا کے سافٹ ویر تو ہزاروں روپے دے کر خریدنا پڑتا ہے ،لیکن یہاں اولیاء اللہ کے پاس سے تو یہ سافٹ ویر مفت میں کاپی (copy) ہو جاتا اور منتقل ہوتا رہتا ہے۔یہ اللہ والے دل کی ہارڈ ڈسک میں داخل کئے جانے والے سافٹ ویر کے ''سافٹ ویر انجینیر '' بھی ہیں،اوراس کے ڈیلر بھی

مگران کے یہاں کی ڈیلنگ بھی عجیب ہے کہ سب کو مفت میں دیتے ہیں۔لہذا جس کو یہ روحانی و ایمانی سافٹ ویر چاہئے اس کو اولیاء اللہ و صالحین کی خدمت میں جانا چاہئے،اور ان سے یہ حاصل کرنا چاہئے۔

دل کا وائرس[virus]

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لیں کہ کمپیوٹر کی دنیا میں ایک چیز اور بھی ہوتی ہے،وہ یہ ہے کہ کمپیوٹر والے کہتے ہیں کہ کمپیوٹر میں وائرس[virus] آجاتا ہے،جس کی وجہ سے کمپیوٹر کھولتے ہیں تو اسٹارٹ ہی نہیں ہوتا،اور کبھی اسٹک ہوجاتا ہے اور کبھی بہت دیر سے چلتا ہے،اور اس کی وجہ سے اس میں ڈلے ہوئے سافٹ ویر خراب ہوجاتے ہیں۔

اب سافٹ ویر انجینیر دیکھ کر کہتا ہے کہ اس میں وائرس[virus] آ گیا ہے۔ کیا ہے وائرس؟ کیا بلا ہے یہ؟ وائرس کہتے ہیں زہریلے مادہ کو، جب یہ وائرس زہریلا مادہ کمپیوٹر پر حملہ کرتا ہے تو اس کے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے، یہ تو کمپیوٹر کا وائرس ہے،اور ہمارے دل کے لحاظ سے اور آپ کو سمجھانے کے لیے وائرس کا ایک ترجمہ میں یہ کرسکتا ہوں کہ وائرس ہے''شیطان''، وائرس کیا ہے؟ اس ہمارے کمپیوٹر کے شیطان کا نام''وائرس'' ہے۔لہذا یہ بھی جب ہم پر حملہ کرتا ہے تو ہمارے پورے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے ، دل خراب ، دماغ خراب ، آنکھیں خراب ،کان خراب ،زبان خراب، ہاتھ پیر خراب ،سارے اعضاء نکمے ہوجاتے ہیں۔

اس شیطانی وائرس کا ذکر حدیث میں آیا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:''**اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِیُ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّم**''

(کہ شیطان انسان کے اندر خون کی طرح یا خون کی رگوں میں دوڑتا ہے) (صحیح بخاری:۲۰۳۸،صحیح مسلم:۵۸۰۷،صحیح ابن حبان:۳۷۴۱)

اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے:''مجری الدم''اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ یہ لفظ''مجری'' مصدر ہو اور دوڑنے کے معنے میں ہو،اس صورت میں اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ شیطان انسان کے اندر اس طرح دوڑتا ہے جس طرح اس کے اندر خون دوڑتا ہے۔اور یہ مجری اس صورت میں ''یجری'' کا مفعول مطلق ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ یہ''مجری''اسم ظرف ہو،اور دوڑنے کی جگہ کے معنے میں ہو،اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ: شیطان انسان کے اندر خون دوڑنے کی جگہ میں یعنی اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔پہلی صورت میں یہ بتایا ہے کہ شیطان انسان کے اندر دوڑتا ہے،مگر کہاں دوڑتا ہے؟ یہ نہیں بتایا گیا۔اور دوسری صورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیطان انسان کے اندر کہاں دوڑتا ہے؟ خون دوڑنے کی جگہ میں دوڑتا ہے،یعنی رگوں میں دوڑتا ہے۔الغرض شیطان انسان کے اندر دوڑتا ہے،داخل ہوتا ہے۔اور اس طرح یہ وائرس اس کو بیکار و خراب کرتا ہے۔

دل کا اینٹی وائرس(Anti-Virus)

اس لئے جس طرح کمپیوٹر کو وائرس سے بچایا جاتا ہے اسی طرح ہمیں بھی خود کو شیطان سے بچانا ضروری ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اس وائرس سے کیسے بچیں؟ کمپیوٹر والے کہتے ہیں کہ وائرس بڑا خبیث ہوتا ہے،اس کو ختم کرنے کے لیے اینٹی وائرس (Anti - Virus)سافٹ ویر بھی کمپیوٹر میں داخل کیا جاتا ہے ۔ اینٹی وائرس کا مطلب''زہر مخالف'' سافٹ ویر،اور وہاں جس طرح اینٹی وائرس ضروری ہے اسی طرح دل کے لئے ایک اینٹی وائرس یعنی''شیطان کا مخالف'' سافٹ ویر

چاہئے۔ اینٹی'' کے معنی'' مخالف''، جیسے اینٹی اسلام کے معنی کیا؟ اسلام مخالف۔ اسی طرح اینٹی وائرس کا مطلب ہوا'' وائرس مخالف'' یہ وائرس اس میں آ گیا، اس کا ایک مخالف ایک سافٹ ویراس میں داخل کرنا پڑتا ہے، جب آپ اس میں وہ ڈالیں تو جونہی وائرس اس میں داخل ہوگا، فوراً وہ بتائے گا کہ آپ کے کمپیوٹر میں وائرس آ گیا ہے، مجھے کام میں لاؤ، میں اس کو پکڑ کے ختم کردوں گا۔ اگر آپ نے اس پر کلک کردیا، تو کلک کرتے ہی وہ فوراً اسے پکڑ کر جہاں بھی ہوگا اسے ختم کردے گا۔ یہ ہے اینٹی وائرس سافٹ ویر۔

اسی طرح بھائیو! ہمارے دل کے لئے بھی ایک اینٹی وائرس سافٹ ویر کی ضرورت ہے، تاکہ ہمارا نظام دل وجسم خراب نہ ہوجائے۔ یہ اینٹی وائرس کیا ہے؟ وہ اللہ کا ڈروخوف ہے، اور یہ'' خوف الٰہی کا اینٹی وائرس سافٹ ویر'' بھی حضرات اولیاء اللہ ہی ہمارے دل میں داخل کرتے ہیں۔ اور اسی کا نام'' اینٹی شیطان'' ہے۔ تو خوفِ الٰہی کے اینٹی وائرس کو دل میں ڈال کے چھوڑ دو، اب وہ دل میں پڑا رہے گا، جہاں کہیں شیطان آپ کے جسم پر حملہ کرے گا، یا دل میں گھس کر بہکائے گا تو وہ فوراً پکڑ لے گا، اور اس کو باہر نکال دے گا۔

خلاصہ کلام

میرے بھائیو! اس تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اندر دل اصل ہے، اس کی اچھائی و برائی کا اثر ہمارے ظاہر پر پڑتا ہے، دل اچھا تو سب اچھا، دل برا تو سب برا، لہذا ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اپنے دل کی اصلاح وتزکیہ کا کام کریں، اور اس کا طریق یہ سمجھ میں آیا کہ اس میں ایمانی وروحانی سافٹ ویر داخل کریں، یہی کہنا ہے کہ ہمارے دلوں میں بہترین سافٹ ویر داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ

کے عشق کا، اللہ کے خوف کا، اللہ کے تقویٰ کا اور اسی طریقہ پر اخلاص کا، اور تواضع کا، اور نیکیوں کا، نماز سے لگاؤ کا اور دین کے کاموں سے الفت ومحبت کا، یہ سب سافٹ ویر ہیں اور ایک کمپیوٹر میں بہت سارے سافٹ ویر داخل کیے جاسکتے ہیں، اور وہ سب کام کرسکتے ہیں۔ اسی طرح برے وخبیث سافٹ ویر سے اس کو دور رکھیں، نیز شیطانی وائرس سے اس کو بچائیں، مگر یہ ایمانی وروحانی سافٹ ویر کہاں ملے گا؟ یہ اہل اللہ کی خدمت میں جانے سے ملے گا، اسی طرح وائرس سے بچانے کے لئے اس دل کی ہارڈ ڈسک میں اینٹی وائرس داخل کرنے کی ضرورت ہے، اور یہ بھی اہل اللہ کے پاس ملے گا، لہذا ان کی خدمت میں جایا جائے اور ان کو حاصل کیا جائے۔

اسی طرح دل کی اس ہارڈ ڈسک کے اندر آپ ان سافٹ ویروں کو داخل کردیجئے وہ سب اندر پڑے پڑے آپ کو بہترین انسان بنائیں گے، اور آپ کے مانیٹر سے یعنی جسم کے اعضاء سے بہترین اعمال صادر کرکے لوگوں کو بتائیں گے۔

اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی سمجھ عطا فرمائے اور عمل کی بھی توفیق عطا فرمائے۔

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

باسمہ تعالیٰ

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . اما بعد فقد قا ل اللّٰہ تعالیٰ فی القرآن الکریم :

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(الاحزاب:۲۱)
(تحقیق کہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے)

بلا اتباع نبی کوئی اللہ تک نہیں پہنچ سکتا

قرآن اور حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لئے قابل تقلید بنانے کا مختلف جگہ متعدد عنوانات کے ساتھ ذکر موجود ہے اور اولیاء اللہ کا بلکہ تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر کوئی بھی شخص اللہ کے دربار میں کوئی مقام حاصل نہیں کرسکتا، حضور کی اتباع کے ذریعہ ہی محبت خداوندی کا دروازہ کھلتا ہے، اگر اتباع محمدی کے بغیر کوئی شخص محبت خداوندی کا دروازہ کھٹکھٹا تا ہے تو قیامت تک نہیں کھل سکتا، یہی ایک راستہ ہے جو اللہ نے خود مقرر کردیا ہے، جب اللہ خود کسی راستے کو متعین کردے، مقرر کردے اور یہ بتادے کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے، تو پھر کسی اور راستے

پر چلنے سے کامیابی کیسے مل سکتی ہے؟

تو معلوم ہوا کہ یہی ایک راستہ ہے اللہ کی محبت کا اور اللہ کے راستے میں چلنے کا کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے ، اسی لئے قرآن میں اللہ تعالی نے دوسری جگہ فرمایا ہے : ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ (اے نبی ﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کو چاہتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے) (آل عمران :۳۱)

باقی تجارت میں ، دنیا میں ، دنیا کی چیزوں میں آگے بڑھ جائے تو وہ الگ بات ہے ، لیکن اللہ کے دربار میں کوئی مقام ، کوئی منزلت آدمی کو اسی وقت ملتی ہے اور مل سکتی ہے جبکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا ہو ، اور آپ کی اتباع تمام معاملات کے اندر ضروری ہے ، عقائد میں ، عبادات میں ، معاملات میں ، معاشرت میں ، اخلاق میں ، سیاست میں ، تعلیم میں ، تہذیب میں ، تمدن میں ، تمام چیزوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ضروری قرار دیا گیا ہے ۔

اُسوہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے :

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾

(تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے)

محض اسوہ نہیں کہا ، بلکہ اسوۂ حسنہ ، یعنی بہترین اسوہ و بہترین نمونہ فرمایا ، اسوہ اور نمونہ وہ چیز ہوتی ہے جس کو دیکھ کر دوسری چیز تیار کی جاتی ہے ، جیسے کپڑوں کا جوڑا نمونے کے طور پر دیا جاتا ہے ؛ تاکہ اسکے مطابق دوسرا کپڑا ڈھالا جائے ، سیا جائے ، گھر کا ماڈل دیا جاتا ہے ؛ تاکہ دوسرا گھر اسی کے مطابق بنایا جائے ، جوتے کا ماڈل

دیا جاتا ہے تاکہ اسی کے مطابق دوسرا جوتا تیار کیا جائے۔

اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی زندگی کا عمل ساری دنیائے انسانیت کیلئے ایک ''ماڈل'' ہے اور ''بہترین نمونہ'' ہے، عقائد ہیں تو اس میں بھی آپ نمونہ ہیں، اعمال وعبادات ہیں تو اس میں بھی آپ نمونہ ہیں، معاشرت وتہذیب ہے تو اس میں بھی نمونہ ہیں، اور اخلاق ہیں تو اس میں بھی آپ ہمارے لئے نمونہ ہیں، اسی طرح تمام معاملات میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ ہیں، پھر اسی کے ساتھ آپ کی آنکھیں نمونہ ہیں ہماری آنکھوں کے لئے، آپ کے کان نمونہ ہیں ہمارے کانوں کے لئے، آپ کا دل نمونہ ہے ہمارے دل کے لئے، اسی طرح آپ کی زبان نمونہ ہے ہماری زبان کے لئے، آپ کے ہاتھ پیر نمونہ ہیں ہمارے ہاتھ پیر کے لئے۔

انسان اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مشین ہے

اس کو اس طرح سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مشین کی طرح بنایا ہے، اس کے اندر بہت سے پرزے لگے ہوئے ہیں اور یہ ایسی مشین ہے جس کے اندر ہر پرزہ اپنا اپنا کام کرتا ہے، جیسے دل ایک پرزہ ہے، زبان ایک پرزہ ہے، آنکھ، ناک، کان ان میں سے ہر ایک ایک ایک پرزہ اور پارٹ ہے، ہاتھ، پیر یہ الگ الگ پرزے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے اجزاء، اعضاء، بہت سے پارٹس، بہت سے پرزے، اس مشین میں لگے ہوئے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ مشین ایک ہے، لیکن اس کا ہر پارٹ الگ پارٹ ادا کرتا ہے، یعنی الگ الگ کام کرتا ہے بہت سی مشینیں دنیا میں ایسی ہوتی ہیں کہ بہت سے پارٹ ملنے کے بعد کام ایک ہی کرتے ہیں۔ مثلاً: ''فریج'' ہے، فریج میں بہت سے پارٹس ہیں، لیکن پورے پارٹس مل کر کام تو ایک ہی کرتے ہیں، اسی طریقے پر ''بس'' ہے ایک مشین ہے، اس کے اندر بہت سے پارٹس

ہیں وہ پورے پارٹس مل کر جب کام کرتے ہیں تو کام تو ایک ہی ہوتا ہے۔

لیکن ہماری مشین جو اللہ نے بنائی ہے، یہ مشین ایسی ہے کہ اس کا ہر پارٹ کام کرتا ہے اور ہر ایک کا کام الگ الگ ہوتا ہے، یہ نہیں کہ پورے اجزاء اور پارٹس مل کر ایک ہی کام کرتے ہوں، مثلاً ناک کا کام الگ ہے، اس کی مستقل ایک ڈیوٹی ہے، زبان کا جو کام ہے وہ مستقل کام، آنکھ کا جو کام ہے وہ مستقل کام، اسی طرح کان کا کام ہے تو وہ مستقل کام، اس طرح ہر پارٹ الگ الگ کام کرتا ہے۔

کتاب اللہ اور رجال اللہ اس مشین کو چلانا سکھاتے ہیں

اس مشین کو چلانے کے لئے اور صحیح نہج پر اسکو (Active) کرنے کیلئے اور صحیح نہج پر اس کی نگرانی کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک تو اپنی کتاب نازل کی جس کے اندر اس کے اصول وطریقے بتادیئے کہ یہ مشین تمہیں ان ان اصولوں پر اور اس اس طرح چلانا ہے، لیکن مشین چلانے کیلئے صرف صحیفوں و کتابوں میں لکھے ہوئے حروف اور نقوش کام نہیں آتے، بلکہ اسے عملاً (Practical) بھی بتانا ضروری ہوتا ہے، اس کے لئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کوئی فیکٹری (Factory) مشین تیار کرتی ہے تو اس کا بروشر (Brochure) بھی تیار کرتی ہے اور ساتھ ساتھ کچھ اس مشین کو چلانے کے لئے اور اس کا مظاہرہ کرنے کے لئے بھی کچھ لوگ تیار کئے جاتے ہیں، وہ آکر آپ کو بتاتے ہیں کہ اس مشین کو چلانے کے لئے پہلے یہ بٹن دبانا ہے، پھر یہ بٹن دبانا ہے، اور اس طرح سے کام لینا ہے، اگر ایسا ہو جائے تو ایسا کرنا ہے، اور ایسا ہو جائے تو یوں کرنا ہے۔ ایک طرف بروشر میں بھی یہ پورا طریقہ لکھا ہوا ہوتا ہے، اور اس کے اندر ہر ہر پارٹ کی تصویر بھی ہوتی ہے اور ان کے نام کی نشاندہی بھی کی جاتی

ہے، پھر ہر پارٹ کا کام بھی بتایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا طریقہ بھی بتایا جاتا ہے، کہ اس کو کس طرح (Operate) کرنا چاہئے، الغرض بروشر میں سب کچھ لکھا ہوا موجود ہوتا ہے، لیکن کتنے لوگ ہیں جو صرف اس کو دیکھ کر چلانا سیکھ لیتے ہیں؟ شاید ہزاروں میں ایک ہوگا۔ جب دنیا کی مشین میں صرف لکھا ہوا کام نہیں آتا، بلکہ اس کے لئے کچھ (Practical) بتانے والے ضروری ہوتے ہیں تو پھر آپ سوچئے کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی مشین جو بہت با مقصد طور پر پیدا کی گئی ہے، اس کے ہر ہر جزء میں، ہر ہر پارٹ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑی حکمتیں، بڑی مصلحتیں رکھی ہیں اور انکا الگ الگ کام مقرر کر دیا ہے اور اس کام کو لینے کیلئے اس کا ایک طریقہ بھی مقرر کر دیا ہے کہ اس طریقہ پر اس سے یہ کام لینا ہے، تو پھر اس کو بتانے کیلئے صرف صحیفہء خداوندی کافی نہ تھا، بلکہ رجال خداوندی کی بھی ضرورت تھی، اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ اللہ نے شروع دور سے ایک طرف کتاب اللہ کا سلسلہ جاری کیا ہے تو دوسری طرف رجال اللہ کا بھی سلسلہ جاری کیا ہے، اللہ کی کتاب بھی آتی ہے اور اللہ کی طرف سے کچھ رجال کار بھی آتے ہیں، وہ آکر بتاتے ہیں کہ یہ طریقہ زندگی کرنے کا ہے، اس مشین کے چلانے کا، اس کے استعمال کرنے کا، اگر اس مشین کو اس کے برخلاف استعمال کروگے تو یہ خراب ہو جائیگی، اور اگر صحیح طریقہ پر استعمال کرو تو ٹھیک وصحیح سالم رہے گی۔

بہت سے انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام آئے اور آخر میں ہمارے اور آپ کے آقا حضرت سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور آپ نے اپنی زندگی کے اندر ایک ایک چیز کے بارے میں تفصیلی معلومات اور عملی طور پر اس کا ایک نمونہ ہمارے سامنے رکھ دیا، آنکھ کے بارے میں بھی رکھا، کان کے بارے میں بھی رکھا، دل کے بارے میں بھی رکھا، زبان کے بارے میں بھی رکھا،

ہاتھ پیر کے بارے میں بھی رکھا کہ یہ سب کے سب اجزاء اور پارٹ کس طرح استعمال میں لانا ہے اور ان کو اگر غلط استعمال کریں گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ یہی بات ہمیں اور آپ کو سیکھنا ہے، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے ذریعے سے کہ ہماری اس مشین کو جو اللہ کی بنائی ہوئی ہے، دنیا میں ٹھیک ٹھیک چلا کر اس کو استعمال کر کے کیسے اس سے کام لیں۔

یہ مشین بطور امانت دی گئی ہے

یاد رکھیں کہ یہ اللہ کی عطا کردہ مشین ہے اور ہم کو بطور امانت دی گئی ہے، بطور ملکیت نہیں دی گئی ہے، ایک ہوتا ہے بطور ملکیت دیدینا اور ایک ہوتا ہے بطور امانت اور ودیعت دینا، بطور ملکیت دیدینے پر ہم مختار کل ہوتے ہیں جو چاہیں کریں، لیکن اللہ نے ہم کو بطور ملکیت نہیں دیا، ہم کو اس کی (Ownership) نہیں دی بلکہ ہمارے پاس محض بطور امانت کے رکھی ہوئی ہے۔ اسی لئے ایک حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے اللہ کو مخاطب بنا کر عرض کیا ہے کہ: أللّٰھم ان قلوبنا و جوارحنا بیدك ، لم تملكنا منها شيئا ، فاذا فعلت ذلك بهما فكن أنت ولينا ''(اے اللہ! بلا شبہ ہمارے قلوب اور اعضاء آپ کے قبضہ میں ہیں، ان میں سے کسی چیز کا آپ نے ہمیں مالک نہیں بنایا، پس جب آپ ان کو ایسا کریں تو آپ ہی ہمارے محافظ بن جائیں) (الجامع الصغیر: ۱۵۱۲، کنز العمال: ۳۶۴۴)

معلوم ہوا کہ ہم ہمارے اعضاء کے مالک نہیں ہے کہ جو چاہیں کریں، بلکہ صرف امین ہیں۔ اسی لیے علماء نے مسئلہ لکھا ہے کہ ہمارے اس جسم کا کوئی عضو اور پارٹ اٹھا کر ہم اپنی مرضی سے کسی کو نہیں دے سکتے، مثلاً آپ کے جی میں آیا کہ اپنے بھائی کو میں اپنا گردہ دیدوں، اپنی آنکھ کسی کو دیدوں تو یہ جائز نہیں ہے۔

آپ کو کیا اختیار ہے؟ کیا یہ آپ کی اپنی Body ہے؟ آپ کا جسم ہے؟ آپ کی آنکھیں ہیں؟ آپ کے گردے ہیں؟ آپ کا دل ہے؟ نہیں، بلکہ یہ تو سب اللہ کا ہے اور اللہ کی اجازت کے بغیر اس میں کسی کو تصرف کا حق نہیں ہے، اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ ان اجزاء واعضاء میں سے کسی عضو کو بغیر اللہ کی مرضی کے نہیں دے سکتے۔

اب رہا یہ کہ اللہ کی مرضی کب ہے، کب نہیں، کیسے معلوم ہوگا؟ آپ مفتی سے پوچھیں، مفتی بتائے گا کہ اللہ کی مرضی ہے کہ نہیں، اس لیے کہ وہ قرآن میں غور کریگا، احادیث میں غور کریگا، دلائل میں غور کریگا، اور فتوی دیگا۔

اگر مشین کا غلط استعمال ہو تو خراب ہو جائیگی

ایک اور بات بھی یہاں سمجھ لیں کہ مشین کا استعمال اگر غلط ہوا اور آپ اس سے وہ کام کرنا چاہیں جو اس کے فساد وخرابی کا سبب بنے تو وہ مشین خراب ہو جائیگی اور اس کے اوپر کچھ دوسرے اثرات مرتب ہو جائیں گے۔ یہاں یہ سمجھ لیں کہ کسی بھی چیز کا استعمال صحیح اسی وقت ہوگا جب اس میں دو باتوں کا دھیان دیں گے: ایک تو یہ کہ اس چیز کو اسی کے مقصد میں استعمال کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کو اسی طریقہ کے مطابق استعمال کریں جو اس کے لئے مقرر ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے سامنے یہ ٹیوب لائٹ جل رہا ہے، اس کو ایک تو اسی مقصد میں استعمال کرنا چاہئے جس کے لئے یہ بنایا گیا ہے، یہ بنایا گیا ہے ہمیں روشنی دینے کے لئے، اگر کوئی بے وقوف اس کام کے بجائے اس کو کسی اور کام مثلاً کسی کو مارنے میں استعمال کرے یا عصا بنالے تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسی طرح کتاب پڑھنے، مطالعہ کرنے کے لئے ہے، اگر کوئی اس سے پنکھے کا کام لینے لگے تو یہ بات غلط ہوگی، کیونکہ اس کے مقصد کے خلاف استعمال کیا گیا۔

دوسرے یہ بھی ضروری ہے کہ چیز کے استعمال کرنے کا طریقہ بھی سیکھا جائے، ٹیوب لائٹ جلانے یا پنکھا چلانے کا ایک طریقہ ہے، استعمال کرنے کا ایک انداز ہے کہ کس طرح اس کو استعمال کریں، اگر خدانخواستہ اس طریقہ کے مطابق استعمال نہ کریں، تو ہوسکتا ہے کہ اس کا فائدہ نہ ہو اور خراب ہو جائے، مثلاً ایک آدمی نے دیکھا کہ ٹیوب لائٹ جل نہیں رہا ہے، اس کے جی میں آیا کہ یہ تو جلتا نہیں ہے، اس کو جلانا ہے، اس بیوقوف نے سوچا کہ یہ کیوں نہیں جلتا؟ اسکو میں جلاتا ہوں، میں روزانہ اپنے گھر کا ''اسٹو'' ماچس کی تیلی جلا کر جلا لیتا ہوں اور وہ جل جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی میں اس کو جلاؤنگا، اس نے ایک ماچس لاکر اس سے ایک تیلی نکالی اور اس کو جلایا اور اس سے ٹیوب لائٹ جلانے لگا۔

اب بتایئے کہ اس کا حشر کیا ہوگا؟ اس کو ساری دنیا کہے گی کہ یہ طریقہ نہیں ہے اس کو جلانے کا، یہ طریقہ دوسری چیزوں کے لئے استعمال ہوسکتا ہے، لیکن یہ طریقہ اس کے لئے استعمال کریں گے تو اس کے لئے خطرہ ہی خطرہ ہے۔

اولاً تو وہ کالا ہو جائیگا اور پھر ہوسکتا ہے کہ اگر تیز بھاپ اس کو لگ جائے تو پھٹ بھی جائے، اس لئے کہ یہ طریقہ اس کے استعمال کا ہرگز نہیں ہے۔

اب یہاں ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک چیز کو جلانے کا جو طریقہ مقرر ہے، اس طریقہ کے خلاف اگر اس کو استعمال کیا جاتا ہے تو اس کو خطرہ ہے کہ نہیں ہے؟

اسی طرح بھائیو! اگر ہمارے دل کو روشن کرنے کے لئے، دل کے اندر نور اور اجالا پیدا کرنے کے لئے کوئی آدمی وہ چیز استعمال نہ کرے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اور وہ چیز استعمال کرے جسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے خطرہ بتایا ہے، تو پھر اس کا دل روشن نہیں ہو سکے گا، دیکھئے ماچس سے

آپ سگریٹ جلا سکتے ہیں، موم بتی جلا سکتے ہیں، اپنی گیس لائٹ جلا سکتے ہیں، لیکن ٹیوب لائٹ ہرگز نہیں جلا سکتے، بلکہ جلائینگے تو کالا ہو جائیگا۔

اسی طرح سمجھئے دل بھی ایک روشن چیز کی طرح ہے، اس میں ایک آگ جلانے اور دھکانے کی ضرورت ہے، وہ آگ جو اس میں لگے گی وہ عشق الٰہی کی آگ ہے، اگر دل میں عشق الٰہی کی آگ جلا کر آپ اس کو روشن کریں گے تو انشاء اللہ اس کی روشنی بڑی خوبصورت ہوگی، اور بہت دور دور تک پہونچے گی، آپ کو بھی روشن کرے گی اور آپ کے پاس بیٹھنے والوں کو بھی روشن کرے گی، لیکن اگر کوئی بیوقوف صاحب اللہ کی محبت سے دل کو جلانے کے بجائے، دنیا کی محبت سے جلانا چاہیں تو دل کالا ہو جائیگا، روشن کبھی نہیں ہوگا۔

معلوم ہوا کہ دل کو روشن کرنا ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا پڑیگا کہ آپ کا اسوہ کیا ہے؟ آپ کو اللہ نے کیا طریقہ دے کر بھیجا ہے وہ طریقہ آپ ہم کو بتائیں، تا کہ ہم اس طریقہ سے اپنے دل کو روشن کریں۔ اسی طرح آنکھیں ہیں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھوں سے جو کام لیا اور جس انداز سے کام لیا، آنکھوں کو اسی طرح استعمال کرنا چاہئے اور اسی مقصد میں استعمال کرنا چاہئے اور اگر اس کو مقصد سے ہٹا کر استعمال کریں گے اور غلط طریقہ پر اس کو استعمال کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کو اجاڑنے کا ہم کام کر رہے ہیں، آنکھوں کو بسانے کا کام ہم نہیں کر رہے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھوں سے کیا کام لیا؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دل سے کیا کام لیا؟ وہی کام ان سے ہمیں بھی لینا ہے۔

دل اللہ کی معرفت کی تجلی گاہ ہے

اسلئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کے ذریعے بھی اور اپنے

عمل کے ذریعہ بھی بتایا ہے کہ دل کو اللہ کی محبت اور معرفت کا مسکن اور ٹھکانہ بناؤ، یہ ہے دل کا کام، اگر کوئی اس کے بجائے دل کے اندر دنیا بھر کی غلاظتیں لے جا کر بھر ڈالے، عورت کی محبت دل میں ہے، اور انسانوں کی محبت دل میں ہے، چیزوں کی محبت دل میں ہے اور مکانوں کی محبت دل میں ہے، پکوان کی محبت دل میں ہے، کھانوں کی محبت دل میں ہے، تو اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی آدمی بہترین قسم کا محل بنانے کے بعد اس کے اندر تمام قسم کی غلاظتیں اور مختلف قسم کی گندگیاں لا کر ڈالدے۔ دل اللہ کی معرفت کا تجلی گاہ ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت کا مسکن ہے، اس کے اندر دنیا کی اور مختلف قسم کی محبتیں لا کر ڈال رہا ہے، تو یہ گندگیاں ہیں، غلاظتیں ہیں، یہ غلاظتیں دل کے اندر آجائیں گی تو بھائی ذرا اندازہ کیجئے، آپ اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ جس نے محل بنایا اور پھر محل کے اندر غلاظتیں لا کر جمانا شروع کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کا دل کیسا تھا؟

الغرض آپ ﷺ کا دل ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے، اللہ کے نبی ﷺ کا دل کیا کیا کام کرتا تھا؟ کن کن خوبیوں کا وہ دل مالک تھا؟ کن چیزوں کو اس میں جگہ نہیں دی تھی؟ اس کے مطابق ہم کو اپنا دل بنانا ہے۔ آج ہمارے دلوں کو ہم دیکھ لیں کہ اس دل کے اندر وہ چیزیں جمع ہیں جو محمد ﷺ کے دل میں نہیں تھیں، اور وہ چیزیں ہمارے دل میں موجود نہیں ہیں، جو نبی ﷺ کے دل میں موجود تھیں، نبی ﷺ کا دل وہ دل تھا کہ اس میں دنیا کی محبت ایک رائی کے برابر نہیں تھی اور خدا کی محبت سو فیصد بسی ہوئی تھی۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں کافروں کے بہت سارے گروگھنٹالوں نے ایک آدمی کو بھیجا، وہ آپ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ: اے محمد ﷺ! مجھے فلاں اور فلاں نے آپ کے پاس بھیجا ہے، میں مکہ کے سرداروں کی طرف سے

آیا ہوں اور مجھے ایک بات آپ کے سامنے رکھنی ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہ پیغام لیکر آیا ہوں کہ اگر آپ دین اسلام چھوڑ دیں تو ہم آپ کو حکومت وسرداری دینے تیار ہیں، ہم آپ کو اپنا سردار بنالیں گے، اور آپ چاہیں تو ساری دولتیں آپ کے قدموں میں لاکر ڈالدیں گے، اور اگر آپکا مقصد عیش وراحت ہے تو ہم عرب کی خوبصورت لڑکیاں آپ پر نچھاور کردیں گے ۔ بس یہ شرط ہے کہ آپ یہ دین کا کام کرنا چھوڑ دیں، توحید وسنت کا کام بند کردیں۔

اللہ کے نبی ﷺ اس کی بات سننے کے بعد پوچھتے ہیں، آپ کی بات ختم ہوگئی؟ وہ کہتا ہے، ہاں! میں نے اپنی بات پوری کرلی۔ اللہ کے نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ: ''اب میری بات سنو''، اس کے بعد آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کردیتے ہیں، سورہ حم سجدہ کی آیتیں پڑھنی شروع کردیتے ہیں، آپ پڑھتے رہے، یہاں تک کہ وہ آیتیں آگئیں جس میں قوم عاد کا اور مختلف قوموں اور لوگوں کا ذکر ہے، ان کی ہلاکت وتباہی کا ذکر ہے تو اس آدمی سے برداشت نہ ہوا اور وہ اللہ کے نبی ﷺ کے قریب پہونچ کر آپ کے منہ پر ہاتھ رکھکر کہتا ہے: ''اللہ کے لئے اس کو بند کرو میرے سینے میں اس کو سننے کی طاقت موجود نہیں ہے، اللہ کے نبی ﷺ بند کردیتے ہیں تو وہ اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

کافر لوگ مکہ کے سردار وہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے ہیں کہ آپ کے پاس سے کیا جواب لاتا ہے؟ لیکن اس آدمی میں ان سے بات کرنے کی طاقت نہیں تھی، تو اپنے گھر چلا گیا اور تین دن تک لوگوں کو نظر بھی نہیں آیا، تین دن کے بعد وہ لوگوں کے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ محمد ﷺ ایک ایسا کلام پیش کرتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا کلام نہیں سنا ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۳۳۸/۱۵، حیاۃ الصحابہ: ۳۷/۱)

تو بھائیو! ہمارے نبی ﷺ کو دنیا دی جارہی تھی، دولت و مال آپ کے قدموں میں ڈالنے کے وعدے کئے جارہے تھے، لیکن آپ نے یہ فرمایا کہ امارت، عیش و عشرت اور مال و دولت تو میرے پیروں میں ہے، اس میں سے کسی کو بھی لینا نہیں چاہتا، دنیا کی دولت اور دنیا کی چیزوں کی محبت محمد ﷺ کے دل کے اندر ایک پائی کے برابر بھی نہیں تھی۔

مال و دولت سے نبی ﷺ کا استغناء

حدیث میں آتا ہے کہ مدینہ ہجرت کے بعد بہت سارے مما لک فتح ہوتے چلے گئے، بحرین کا ملک بھی فتح ہوگیا، اس وقت اللہ کے نبی ﷺ نے لوگوں کو بحرین بھیجا کہ جاؤ (tax) ٹیکس وصول کر کے لاؤ۔ چنانچہ حضرات صحابہ گئے، اور بحرین سے دولت کا انبار لے کر آئے، اس میں سونا، چاندی، اناج و غلہ اور کپڑا اور دیگر مختلف قیمتی چیزیں تھیں۔

یہ سب چیزیں مسجد نبوی کے صحن میں جمع کر دی گئیں، اور اللہ کے نبی ﷺ کو خبر کر دی گئی۔ ذرا سوچئے کہ اگر میں یا آپ اس جگہ ہوتے تو جا کر کم از کم دیکھتے کہ کتنی دولت آئی ہے؟ اور کیا کیا مال آیا ہے؟ لیکن اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، مسجد میں ڈال دو اور آرام کرو، صحابہؓ اپنی اپنی جگہ چلے گئے، لوگوں میں شہرت ہوگئی کہ بحرین سے بہت کچھ مال آ گیا ہے، یہ دور فقر و فاقہ کا دور تھا، ایسے دور میں بحرین سے اس قدر مال جمع ہوگیا تھا، فجر کی نماز کا وقت ہوگیا تو مدینہ کی مختلف مساجد کے نمازی بھی مسجد نبوی کے اندر آ کر جمع ہوگئے، ایک جم غفیر دوسرے دنوں کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی تھا، اب لوگ انتظار میں ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نماز فجر پڑھانے کے لئے آئیں گے۔

چنانچہ وقت ہوا تو آپ ﷺ تشریف لائے، حضرت بلالؓ ساتھ میں موجود تھے لوگوں کا خیال تھا کہ آپ ﷺ آ کر مال کا جائزہ لیں گے اور ایک ایک چیز کو اچھی طرح غور و فکر سے دیکھیں گے، لیکن دیکھتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ تشریف لائے اور ایک نگاہ بھی اٹھا کر مال کی طرف نہیں دیکھا، بلکہ سیدھا محراب کے اندر تشریف لے گئے اور نماز پڑھائی، اس کے بعد مصلیوں کی طرف چہرہ کر کے بیٹھ گئے اور پوچھا کہ تم لوگ مختلف محلوں کے یہاں جمع ہو گئے، شاید تم لوگوں کو یہ خبر ملی ہوگی کہ بحرین سے مال آیا ہے، اس لئے تم لوگ یہاں جمع ہو گئے ہو، صحابہؓ نے عرض کیا، ہاں! یارسول اللہ! ہم اسی لئے جمع ہوئے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

پچھلی امتیں جو تباہ و ہلاک ہوئیں، وہ مال و دولت میں غرق ہونے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں، مجھے کوئی خوف تمہارے فقر و فاقہ کا نہیں ہے، اگر مجھے کسی بات کا خوف تمہارے بارے میں ہے تو یہی کہ دنیا تمہارے اوپر وسیع کر دی جائے اور تم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں مسابقت (race) کرو گے اور ہلاک کر دیئے جاؤ گے، پھر اس کے بعد مال کے پاس تشریف لائے اور حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ تقسیم کرنا شروع کرو، جس کو جس چیز کی ضرورت ہو دیتے چلے جاؤ، حضرت بلال حبشی تقسیم کرتے رہے یہاں تک کہ جو کچھ آیا تھا سب تقسیم ہو گیا، جب اللہ کے نبی ﷺ وہاں سے اٹھے ہیں تو یوں اپنا دامن جھاڑ کر اٹھ گئے کہ ایک پائی بھی اپنے لئے نہیں رکھی۔ (بخاری:۱/۴۴۷، مسلم:۲/۴۰۷)

یہ اللہ کے نبی ﷺ کا اسوہ ہے کہ اتنے مال کی فراوانی کے باوجود ایک نگاہ بھی اٹھا کر آپ نے نہیں دیکھی اور حضرات صحابہؓ کے دلوں میں جو تھوڑی سی محبت جمع ہو گئی تھی، اس کو بھی کھینچ کر نکال دیا۔

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک موقعہ پرآپ ﷺ نے نمازعصر پڑھائی، نماز کے بعدآپ ﷺ لوگوں کو پھلانگتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ گھر گئے، حضرات صحابہؓ پریشان ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ کوکیاضرورت پیش آگئی کہ آپ دوڑتے ہوئے اورلوگوں کو پھلانگتے ہوئے گھرتشریف لے گئے؟.......کچھ دیربعدواپس آئے،اوردیکھا کہ ان حضرات کوتعجب ہورہاہےتو صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوکرفرمایا کہ نماز میں مجھے یادآیا کہ میرے گھرمیں ایک سونے کاٹکڑارہ گیاہے، میں نے یہ مکروہ سمجھا کہ وہ مجھے مشغول کرلے، ایک روایت میں یوں فرمایا کہ کہیں وہ میرے پاس رات میں رہ نہ جائے،لہذامیں نے اس کوتقسیم کرنے کاحکم دیدیاہے۔ (بخاری:۸۵۱،نسائی:۱۳۶۴)

یہ تھےاللہ کے نبی ﷺ، کہ آپ کے دل میں دنیا کی کوئی محبت نہیں تھی،اب اللہ کے نبی کادل دیکھوکہ کیساتھا،میں یہ سمجھاناچاہ رہاہوں کہ نبی ﷺ کی ذات میں تمہارے لئےنمونہ موجودہے،آپ کے دل کودیکھ کراپنادل بھی ویساہی بنالو۔

اللہ کے نبی کے دل میں خوف الٰہی

ایک صفت ہمارے نبی ﷺ کے دل کی یہ تھی کہ آپ کے دل میں خداکاخوف بے پناہ موجودتھا؟ حدیث میں آتاہے کہ ایک دفعہ کاواقعہ ہے، آپ ﷺ کو شدید بھوک لگی،اورکھانے کے لئے کچھ بھی موجودنہیں تھا،آپ گھرکے باہرتشریف لائے، دیکھاتوایک طرف صدیق اکبرنظرآئے،دوپہرکی شدیدگرمی کا وقت تھا،آپ نے ان سے پوچھا:"اے ابوبکر!ایسے وقت کیوں باہرآگئے؟"توانہوں نے کہا کہ یارسول اللہ! بھوک کی شدت نے باہرنکلنے پرمجبورکیا،اس لئے باہرنکل آیا۔ حضورﷺ نے فرمایا کہ مجھے بھی بھوک نے ہی مجبورکیا؛اس لئے میں بھی باہرنکل آیا

ہوں، دونوں حضرات کچھ آگے بڑھے تو حضرت عمر بن خطابؓ نظر آئے، ان سے پوچھا کہ اس وقت باہر کیوں؟ تو انکا بھی وہی عذر کہ بھوک کی شدت نے مجبور کیا۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ چلو ابوالہیثم کے باغ میں چلیں گے، یہ ایک صحابی تھے، ان کا مدینہ کے اندر بڑا باغ تھا، حضور ﷺ وہاں تشریف لے گئے، اس وقت ابوالہیثم وہاں موجود نہیں تھے، ان کی بیوی موجود تھیں، انھوں نے حضور ﷺ کو دیکھا تو وہ خوش ہوگئیں، چادر بچھائیں، اس کے بعد کھانے کے لئے انگور وغیرہ لاکر رکھ دیا، حضور اور صحابہ نوش فرمارہے تھے، اتنے میں حضرت ابوالہیثم بھی آ گئے، آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، ان کی تو عید ہوگئی، ان کے پاس ایک بکری موجود تھی، اس کو جلدی سے ذبح کیا، اور اس کو بھونا، بیوی کو حکم دیا کہ روٹی پکاؤ، گرم گرم روٹیاں پکادی گئیں، سالن بھی تیار ہوگیا، لاکر حضور کے سامنے رکھ دیا، حضور نے بھی کھایا اور دیگر اصحاب نے بھی کھایا، فراغت کے بعد حضور نے رونا شروع کر دیا، حضور ﷺ کو دیکھ کر سب کو رونا آ گیا اور ایک کہرام سا مچ گیا، لیکن کسی کو کچھ نہیں پتہ کہ کیوں رویا جارہا ہے؟ اللہ کے نبی کے رونے کو دیکھ کر سب کو رونا آ گیا، ابوبکرؓ نے آپ سے پوچھا کہ: یا نبی اللہ! آپ کیوں رورہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ: ابوبکر! جو بھی ہم نے کھانا کھایا ہے، قیامت کے میدان میں ان میں سے ایک ایک چیز کا ہمیں جواب دینا ہے؛ اس لئے رورہا ہوں۔ (ترمذی: ۶۲/۲)

ہمارا حال تو یہ ہے کہ صبح کھارہے ہیں، شام کھارہے ہیں، تین تین وقت کھارہے ہیں، اس کے علاوہ بھی کبھی لسی، کبھی چائے، اس کے باوجود ہمارے دلوں میں اللہ کا کوئی خوف نہیں ہے، جب اللہ کے نبی رورو کر یہ آخری جملہ ادا کررہے تھے تو سب کے دل میں عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔

اس لئے بھائیو! نبی کے جیسا دل بناؤ، اللہ کا خوف دل میں پیدا کرو اور اللہ کی محبت دل میں پیدا کرو، واقعات تو بہت ہیں، لیکن ایک (point) جو اس وقت میں نے اٹھایا ہے، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کم از کم اس نکتہ پر مجھے اور آپ کو اچھی طرح غور وخوض کرکے اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لینا چاہئے کہ ہمارا دل تو محمد ﷺ جیسا بن جائے، آج وہی فکر وہی خوف ہمارے اندر پیدا ہو تو انشاء اللہ ہماری پوری زندگی میں تبدیلی پیدا ہو جائیگی، اس لئے کہ اصل تو دل ہی ہے، تمام اعضاء جو بنتے ہیں وہ دل ہی سے بنتے ہیں۔

آپ کے دل میں تعلق مع اللہ کی کیفیت

اسی طرح ایک اور بات سن لیجئے، جو بہت اہم ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں اللہ سے تعلق کی جو کیفیت تھی، وہ بے مثال و بے نظیر تھی۔ یہ بھی ایک چیز ہے جس کو ہمیں اپنے نبی کے اسوہ سے لینا اور سیکھنا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اللہ کے نبی گھر میں آتے تھے تو گھر کے کام کاج کرتے تھے اور جیسے ہی اذان ہوتی یا نماز کا وقت ہوتا تو نماز کے لئے نکل جاتے۔ (بخاری:٦٧٦، ترمذی:۲۴۸۹، الادب المفرد:۲۱۵/۱)

مطلب یہ ہوا کہ آپ علیہ السلام کا معمول تھا کہ گھر میں کام کاج میں شریک ہوتے، اور ازواج مطہرات کے ساتھ ہنسی مذاق بھی فرماتے تھے، اور جیسے ہی اذان کی آواز آتی تھی تو پھر آپ سب کام چھوڑ کر نماز کی طرف اور اللہ کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے۔ ملا علی قاری نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ:" ترك جميع عمله ، و كأنه لم يعرف أحدا من أهله " کہ آپ سب کاموں کو چھوڑ دیتے گویا کہ آپ اپنے اہل میں سے کسی کو جانتے پہچانتے ہی نہیں۔ (مرقاۃ:۴۸۷/۱۰)

حالانکہ آپ کا گھر میں ایک معمول یہ بھی تھا کہ آپ اپنی ازواج کے ساتھ ہنسی مزاح بھی کیا کرتے تھے۔

جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ حضرت عائشہؓ کے مکان میں تھے، انھوں نے حضور ﷺ کے لئے حریرہ گھر میں تیار کیا، اور لے آئیں، کہنے لگیں : اے اللہ کے نبی! میں نے یہ آپ کے لئے تیار کیا ہے، اس کو کھائیے، یہاں حضرت سودہ بھی حاضر تھیں، حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا: تم بھی کھاؤ، لیکن حضرت سودہ نے فرمایا کہ میں تو نہیں کھاؤنگی، وہ روٹھ گئیں، لیکن حضرت عائشہ نے اصرار کیا کہ تمہیں کھانا پڑیگا، یہ اصرار وانکار اتنا بڑھتا گیا کہ دونوں کے درمیان میں بات ذرا آگے بڑھ گئی، حضرت عائشہ نے کہا کہ : اگر تم اسے نہیں کھاؤ گی تو میں یہ کھانا تمہارے منھ پر مل دونگی، یعنی ایک مذاق اور تفریح کا موقعہ تھا۔

چنانچہ انہوں نے حریرہ میں ہاتھ ڈالکر ان کے منھ پر مل دیا، حضور ﷺ بازو بیٹھے ہوئے ہنس رہے تھے، مسکراہٹ آپ کے چہرے پر کھیل رہی تھی، جب حضرت سودہؓ کو دیکھا کہ ان کا پورا چہرہ کھانے سے ملوث ہوگیا ہے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ عائشہ نے تمہارے منھ پر یہ لگایا ہے، اب میں ان کے ہاتھ پکڑ لیتا ہوں تم ان کے منھ پر یہ مل دو۔ چنانچہ حضرت عائشہ کے ہاتھوں کو حضور ﷺ نے پکڑ لیا تو حضرت سودہ نے حریرہ اٹھا کر ان کے منھ پر مل دیا اور پھر ایک ہنسی کا موقعہ فراہم ہوگیا۔ (حیاۃ الصحابہ:۲/۷۹۹)

یہ تھا حضور ﷺ کے گھر کا ماحول بیویوں کے ساتھ، اور اسی کے ساتھ جب اللہ کی طرف سے بلاوا آجاتا تو نماز وذکر کی جانب توجہ کا یہ عالم جو آپ نے سنا، یہ ہے خدا کی محبت، ایک طرف بیویوں کا حق بھی ادا کر رہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ جب اللہ کا پیغام آتا تھا تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اب ہمارے سے حضور ﷺ کو کوئی تعلق

نہیں، یہ اللہ کی محبت ہے جو نبی ﷺ کے سینے میں موجود تھی۔

دل کو گندگیوں سے پاک کرو، ایک واقعہ

الغرض دل تو اللہ نے اسی لئے بنایا ہے کہ اس میں اللہ کی محبت پیدا کی جائے اور ہمارے دلوں کو آپ ﷺ کے دل جیسا بنایا جائے، دل میں محبت الٰہی کی جگہ کوئی اور چیز آ جائے تو اللہ کبھی اسے برداشت نہیں کریں گے، مجھے ایک بات یاد آ گئی، میں نے چند دن پہلے اپنے دوستوں کو سنایا تھا، غالبًا دو یا تین ہفتے پہلے مجھ سے فون پر کچھ لوگوں نے رابطہ کیا اور کہا کہ یہاں ایک مکان ہے اور ایک بھائی بہن اس مکان میں رہتے ہیں، اس کے اندر غلاظتیں ہی غلاظتیں جمع ہیں، ہم محلے کے کچھ لوگ مل کر اس مکان کے اندر سے وہ گندگیاں اور غلاظتیں باہر نکال کر پھینک دینا چاہتے ہیں، تو کیا شرعاً ہم کو اس کی اجازت ہے؟ مسئلہ پوچھ رہے تھے۔

میں نے جواب دینے سے پہلے ان سے تفصیل پوچھی، کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ تا کہ تفصیل مجھے معلوم ہو جائے، تو انہوں نے جو تفصیل بتائی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، انہوں نے کہا کہ ایک صاحب ہیں جو پہلے Education Department میں بڑے آفیسر تھے، بعد میں ان کا دماغ خراب ہو گیا، بچے اور بیوی سب ان کو چھوڑ کر چلے گئے، ان کی ایک بہن ہے، اس کا بیماریوں میں عجیب وغریب برا حال ہے، نہ اٹھ سکتی ہے، نہ کچھ کام کر سکتی ہے، نہ کچھ بول سکتی ہے، اپنے بیڈ پر پڑی ہوئی ہے، پیشاب وہیں، پاخانہ وہیں، کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں، بھائی کا حال یہ ہے کہ دماغ خراب ہونے کی وجہ سے راستہ چلتے ہوئے راستے میں جتنی گندگیاں اور غلاظتیں ہوتی ہیں وہ چن چن کر لاتا اور اپنے گھر میں جماتا ہے،

کاغذ پڑا ہے، وہ لاکر گھر میں ڈال رہا ہے، کوئی اخبار پڑا ہوا ہے، اسے اٹھا کر لا رہا ہے، کوئی لوہے کی چیز ملی اسے اٹھا کر گھر میں ڈال رہا ہے، کوئی پتھر ملا اسے اٹھا کر گھر میں ڈال رہا ہے، غرض یہ کہ چلتے پھرتے ہزاروں قسم کی اچھی بری چیزیں ملتی ہیں، دماغ خراب ہونے کی وجہ سے گھر میں لالا کر ڈالتا چلا جا رہا ہے، یہاں تک کہ جو اس کا پلنگ ہے، پلنگ پر بھی یہی سب کچھ رکھا ہوا ہے، وہ خود تو نیچے سوتا ہے، اور پلنگ کے اوپر یہ سب جمع کرتا ہے، اور پھر یہ چیزیں رکھے رکھے کبھی پانی پڑ گیا یا کچھ اور ہو گیا، اور وہ چیزیں خراب ہونے لگیں، سڑنے لگیں، اس طرح پورے گھر میں سوائے غلاظت، گندگی اور بدبو کے اور کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس گھر کو خالی کرنا چاہتے ہیں، مگر ان صاحب کی اجازت نہیں ہے۔ اور وہ صاحب اسے خالی کرنے کیلئے تیار نہیں، اور وہ بہت مزاحمت کر رہے ہیں کہ تم لوگ ہمارے گھر میں کیوں آئے ہو؟ اور کیوں ان چیزوں کو نکال رہے ہو، یہ میری چیزیں ہیں، یہ اخبار مجھے کام آئیگا، پچیس سال پہلے کا اخبار بھی پڑا ہے، بیس سال پہلے کا بھی اخبار پڑا ہے، اور وہ اسے پھینکنے کے لئے تیار نہیں۔

میں نے کہا کہ جب یہ صورت حال ہے اور آپ لوگ ان کے گھر کو خالی کرنا چاہتے ہیں، اور اس کا مقصد در اصل ان کے گھر کو پاک کرنا ہے اور بیکار و بے ہودہ چیزوں سے خالی کرنا ہے تو یہ شرعاً جائز ہے، اس لئے کہ نکالنے کی چیز کو نکالنا تو گناہ نہیں ہے، کسی کے گھر کو صاف کرنا کوئی جرم نہیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ صاحب اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اس کو سمجھیں کہ یہ غلط کام ہے۔

بھائیو! بزرگو! مجھے اس واقعہ سے بتانا کیا ہے؟ یہ بتانا ہے کہ جیسے ایک اچھے گھر میں اچھی چیزیں رکھنے کے بجائے گندگی، غلاظت کوئی جمع کرتا ہے، تو دنیا کا کوئی انسان اسے برداشت نہیں کرتا بلکہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے دماغ کے اندر خرابی

ہے اور واقعی خرابی بھی ہوتی ہے، اسی طرح جو اپنے دل کے محل کو خدا کی محبت سے سجانے کے بجائے دنیا کی غلاظتوں سے ملوث کر لیتا ہے تو آپ بتائیے کہ اس کے بارے میں کیا کہا جائے، ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے اندر ہم کو یہی درس دیا گیا ہے کہ اس دل کو کیسے سجائیں؟ پاک کریں؟

نجس دل میں اللہ کی تجلی نہیں ہوتی

یاد رکھو کہ دل کی خرابی بہت بڑی خرابی ہے، اس لئے وہاں گندگی ڈالنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیا اپنی آفس روم میں کوئی گندگی غلاظت ڈالے گا؟ جہاں سارے لوگ آتے جاتے ہوں، میل ملاقات وہیں ہوتی ہو، صوفہ رکھا ہوا ہو، فرنیچر ہو، ٹیبل رکھا ہوا ہو، ان کے اوپر چار پانچ جگہ گندگی اور غلاظت ڈال دی جائے۔ سوچو کہ کون آئیگا؟ آپ کے آفس میں یا ایسے گھر میں؟

اسی طرح اس گھر (دل) میں جس کے اندر گندگیاں اور غلاظتیں ڈالدی گئی ہوں، وہاں خدا کیسے آسکتا ہے؟ نجس دل میں کبھی اللہ کی تجلی نہیں آتی، جس میں اخلاقی واعتقادی، نظریاتی و دیگر رذائل و خبائث ہوں۔ آج یہی ہمارا روگ ہے، سب سے بڑی مصیبت ہے، سب سے بڑا المیہ ہے، کہ ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور آپ کے اسوۂ حسنہ سے دل کے بنانے کا فن نہیں سیکھا، دل کو سجانے کا فن نہیں سیکھا۔

دنیا والوں سے عبرت لیجئے

بھائیو! ہمیں اس سلسلہ میں دنیا والوں سے عبرت لینا چاہئے، آج دنیا ترقی کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہونچ رہی ہے، وہ ترقی کرتے کرتے اپنے گھروں کو سجانے کے لئے کیا کیا انداز اختیار کر رہی ہے، ہر کام کے لئے الگ الگ آدمی

موجود ہیں، مختلف قسم کے ڈیزائن ہوتے ہیں، اندرونی کام (Interior)، اور باہری کام (Exterior)، اور ہر ایک کے لئے الگ الگ اشخاص ہوتے ہیں (Interior) کام کی مخلوق الگ، وہ لوگ صرف اندرون خانہ کام کرتے ہیں، ان کا کام باہر کا نہیں، اور (Exterior) کام والے باہر کا کام کرتے ہیں، یہ لوگ اندر کا کام نہیں کرتے، صوفے والے ٹیبل کا کام نہیں کرتے، ٹیبل والے صوفے کا کام نہیں کرتے، کارپیٹ بچھانے والے چھت پر ڈیزائننگ کا کام نہیں کرتے، ہر ایک کے لئے الگ الگ قسم کے لوگ ہیں، اور ہر ایک اپنے فن کا فنکار ہے، اور ہر ایک اپنا فن دکھا رہا ہے اور لوگ ہر ایک سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے گھروں کو، اپنی آفسوں کو سجا رہے ہیں کہ ہمارا گھر ایسا ہونا چاہئے، ہماری آفس ایسی ہونی چاہئے، ہمارا دکان ایسا ہونا چاہیے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اگر سجاوٹ نہیں ہو رہی ہے تو اس دل کے گھر کی نہیں ہو رہی ہے، جو خالق کائنات اللہ تعالی نے اپنے لئے بنایا ہے، کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے؟ ہمارے رہنے کے مکانات تو اتنے عالیشان ہوں، اور اللہ کا مکان ''دل'' اتنا گھٹیا اور اتنا گندا ہو کہ مت پوچھو، ساری غلاظتیں اس میں، حسد اس میں، کینہ اس میں، تکبر اس میں، بغض اس میں، مردار دنیا کی محبت اس میں، بے حساب گندگیاں اس میں۔

مرشدی شاہ ابرارالحق صاحب کا ایک مقولہ

حضرت مرشدی مولانا شاہ ابرارالحق صاحب نوراللہ مرقدہ، بار بار ایک جملہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، وہ جملہ یاد آ گیا، حضرت وہ جملہ قرآن و اذان و نماز کے بارے میں فرمایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ ''قرآن آج لوگوں کا بڑھیا نہیں ہے، اذان بڑھیا نہیں ہے''، اور کہتے تھے ''کھانا بڑھیا، پانی بڑھیا، مکان بڑھیا، دکان بڑھیا، حتی

کہ پان بھی بڑھیا لیکن قرآن بڑھیا نہیں''، یہ جملہ ہے حضرت کا۔

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح دنیا بھر کے دکان، دنیا بھر کے مکان سب عالیشان، ان کے اندر و باہر تمام سجاوٹوں کا ہم اہتمام کرتے ہیں، لیکن خدا کے دل کو بسانے اور سجانے کا کوئی اہتمام نہیں، محمد ﷺ کی سیرت میں دل کو سجانے کا بہت زیادہ اہتمام ہے، یہ فن وہاں سے سیکھنا ہے، اس کو آپ سجائیں کیسے؟ اس کو سجانے کے لئے کیا کرنا پڑیگا؟ اللہ کا ذکر، اللہ کے ذکر سے اللہ کے دل کی سجاوٹ ہوتی ہے، سبحان اللہ پڑھیں، الحمدللہ پڑھیں، اللہ اکبر پڑھیں، لا الہ الا اللہ پڑھیں، اور ذکر واذکار کریں، قرآن پاک کی تلاوت کریں، تو جوں جوں آپ قرآن پاک کی تلاوت اور ذکر واذکار کرتے جائیں گے تو اس اللہ کے گھر میں بیل بوٹے لگتے چلے جائیں گے، سبحان اللہ سے ایک پھول نکلے گا، الحمدللہ سے ایک پھول نکلے گا۔

ذکر اللہ سے معرفت ومحبت کا عکس دل پر پڑیگا، ایک واقعہ

جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اللہ ان کے دل میں بسیرا کرتا ہے، کیسا بسیرا، ایک عجیب وغریب واقعہ سنئے، آپ نے مہدوی فرقہ کا نام سنا ہوگا، اس فرقہ کے بارے میں تمام علماء کا کہنا ہے کہ یہ گمراہ فرقہ ہے، اور کافر ہے۔ اب رہی اس کی تفصیلات تو اس وقت کہنا نہیں ہے، اس فرقے کے جو بانی تھے، وہ بانی بنالئے گئے ہیں، وہ خود شاید بانی نہ ہوں، لوگوں نے ان کو بانی قرار دے لیا ہے، بہر حال یہ لوگ ان کو مانتے ہیں، ان کا نام ہے ''محمد جونپوری'' جونپور (یو، پی) کے رہنے والے تھے، ان کے بارے میں مورخین کی رائے مختلف ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ غلط قسم کے آدمی تھے، لوگوں کو ایک گمراہی پر ڈال گئے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ صوفی منش آدمی تھے، اللہ

والے تھے، بہ ہر حال وہ جیسے بھی تھے، اس وقت اس کی بھی بحث نہیں ہے، البتہ ان کا ایک واقعہ سنانا ہے، وہ یہ کہ انہوں نے اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ غیروں سے جہاد کرنا شروع کیا، مختلف جگہ ان کی فوجیں جاتی تھیں، اور جہاد کرتی تھیں، تاریخ میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ ایک جگہ راجا دلیپ راؤ اور راجا کی فوج سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی اور آپس میں دونوں کا مقابلہ ہوا اور اس مقابلہ میں سید جونپوری نے بادشاہ کے اوپر حملہ کیا، وار کاری تھا، راجا گرا اور گر کر مر گیا، یہاں تک کہ اس کا سینہ پھٹ کر دل باہر نکل آیا، جب اس کا دل نکل کر باہر آ گیا، تو لوگوں نے ایک عجیب وغریب بات یہ دیکھی کہ اس کے دل کے اوپر اس مورتی کی تصویر تھی جس کی وہ پوجا کیا کرتا تھا، اس طرح جیسے چھپی ہوئی تصویر ہوتی ہو، اس کا کیا مطلب ہوا؟ مطلب یہ کہ جب وہ کافر بادشاہ پورے دھیان وتوجہ کے ساتھ اپنی مورتی کی پوجا کرتا تھا، تو دل نے اس کا عکس قبول کرلیا۔

بھائیو! ذرا سوچو کہ جو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا تو کیا خدا تعالیٰ کی معرفت ومحبت کا عکس اس کے دل پر نہیں آئیگا، کیوں نہیں؟ ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

لِيْ حَبِيْبٌ خَيَالُهٗ نُصْبَ عَيْنِيْ

وَ اسْمُهٗ فِيْ ضَمَائِرِيْ مَكْنُوْنٗ

اِنْ تَذَكَّرْتُهٗ فَكُلِّيْ قُلُوْبٌ

وَ اِنْ تَأَمَّلْتُهٗ فَكُلِّيْ عُيُوْنٗ

یعنی میرا ایک محبوب ومعشوق ہے جس کا تصور وخیال ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، اور اس کا نام میرے ضمیر میں پوشیدہ ہے، اگر میں اس کو یاد کرتا ہوں تو میں سراپا دل ہو جاتا ہوں اور اگر میں اس کو دیکھتا ہوں تو سراپا آنکھ بن جاتا ہوں۔

لہذا اللہ کو، اللہ کی محبت کو اپنے دل میں بسانے کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کا ذکر کرو، اس کی طرف دھیان لگاؤ، اس کی طرف محبت کے ساتھ متوجہ ہو جاؤ، جب یہ کام کریں گے تو انشاء اللہ! یہ دل محمد ﷺ کی سیرت کے مطابق اور آپ ﷺ کے اسوہ کے مطابق اللہ کا واقعی مسکن بنے گا اور اس مسکن میں خدا کی محبت رہے گی، پلے گی، پھلے گی، پھولے گی۔

حضرت نبی ﷺ کی آنکھ بھی اسوہ ہے

اسی طرح ہمارے نبی ﷺ کی آنکھیں بھی ہمارے لئے اسوہ ونمونہ ہیں۔ کس طرح؟ اس طرح کہ ہم یہ دیکھیں کہ آپ کی آنکھیں کہاں اور کس طرح استعمال ہوتی تھیں؟ آپ راستوں میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نہیں چلتے تھے، بلکہ نگاہیں آپ کی نیچے کی جانب ہوتی تھیں۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۳۷۹، سبل الھدی والرشاد: ۸/ ۱۵۹)

آپ کسی حرام و ناجائز چیز کو نہیں دیکھتے تھے، کسی نامحرم پر نگاہ نہیں اٹھاتے تھے۔ نیز آپ کی آنکھیں اللہ کی محبت یا خوف سے روتی تھیں۔ ایک بار سورج گرہن ہو گیا تو آپ نے نماز کسوف پڑھائی اور لمبا لمبا رکوع اور لمبا لمبا سجدہ کیا، اور سجدہ میں روتے روتے کہتے جا رہے تھے: "ألم تعدني أن لا تعذبهم و أنا فيهم" (اے اللہ! کیا آپ نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں جب تک ان لوگوں میں موجود ہوں آپ ان کو عذاب نہیں دیں گے) یہ کہتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔ (شمائل ترمذی: حدیث: ۳۱۵)

ایک بار حضرت ابن مسعودؓ سے فرمایا کہ تم مجھے قرآن سناؤ، انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا میں آپ کو قرآن سناؤں جبکہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہے؟ آپ

نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ کسی اور سے قرآن سنوں ۔ حضرت ابن مسعود نے قرآن پڑھنا شروع کیا اور سورہ نساء پڑھی ۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے آپ کو دیکھا تو: ''رأیت عینی رسول اللّٰہ تھملان ''(دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی آنکھیں بہہ رہی ہیں)(شمائل:۳۱۴)

ساری چمک دمک تو انہی موتیوں سے ہے
آنسو نہ ہوں تو عشق میں کچھ آبرو نہیں

ہر چیز پر عبرت کے لئے نگاہ ڈالتے تھے،فضول و بے کار کسی چیز کو دیکھتے نہیں تھے ۔ یہ ہے اللہ کے نبی ﷺ کی آنکھوں کو اسوہ بنانا،لہذا اس کے مطابق اپنی آنکھوں کو بنانا چاہیئے ۔

زبان نبوی اور اسوۂ حسنہ

اسی طرح مثال کے طور پر زبان کو لیجئے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی زبان کہاں اور کس طرح استعمال ہوتی تھی؟ آپ نہ اس کو گالی بکنے میں استعمال کرتے تھے،نہ کسی بری بات میں استعمال کرتے تھے،نہ کسی کو اس سے ذیت پہنچاتے تھے، بلکہ یہ زبان یا تو اللہ کا کلام پڑھنے میں یا ذکر اللہ میں یا کسی کو اچھے امور کی تعلیم و تبلیغ میں،وعظ و نصیحت میں استعمال ہوتی تھی،لہذا ہمیں بھی اپنی اپنی زبان کا استعمال صحیح طریقہ کے مطابق اسوۂ حسنہ کی روشنی میں کرنا چاہیئے ۔

الغرض یہ چند مثالیں اور اشارے ہیں،ان سے اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ کے نبی ﷺ کو ہمیں کس طرح اسوۂ حسنہ بنانا ہے ۔ ہر ہر بات میں آپ کو نمونہ بنانا ہے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے ۔

و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین

معرفت الٰہی اور اس کے آثار

باسمہ تعالی

معرفت الٰہی اور اس کے آثار

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ، امابعد

فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذریٰت:۵۶)

محترم حضرات !

اللہ تعالی نے دنیا میں انسان کو بھی پیدا کیا اور دیگر مخلوقات کو بھی پیدا کیا، مگر علما نے لکھا ہے کہ انسان کے پیدا کرنے اور دیگر مخلوقات کے پیدا کرنے میں ایک بڑا فرق ہے، وہ یہ کہ انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالی کی معرفت ہے، اور دیگر مخلوقات کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی معرفت کا انسان کے لئے ذریعہ بنیں، زمین اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے، آسمان اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے، چاند وسورج اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہیں، درخت کو اللہ نے اس لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ درخت کو اللہ کی معرفت ہو، اور نہ جانوروں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ جانور اللہ کے عارف بندے بن جائیں، عارف تو بنے گا وہ بندہ جس کو انسان کہتے ہیں، اسی لئے زمین کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اللہ کی عارف ہے، آسمان کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے، شجر وحجر کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے ، چرند پرند کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے ، ان کو معرفت

نصیب نہیں ہے، معرفت اللہ تعالیٰ نے صرف انسان اور جنات کو عطاء کی ہے۔

قرآن کریم کی جو آیت میں نے تلاوت کی ہے، اس میں اسی طرف اشارہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (میں نے جنات اور انسانوں کو صرف میری عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) (الذاریت:۵٦)

حضرت ابن عباس و حضرت مجاهد کی تفسیر

حضرت ابن عباسؓ اور ان کے شاگرد حضرت مجاهدؒ نے " لیعبدون " کی تفسیر " لیعرفون " سے کی ہے، یعنی عبادت سے مراد یہاں اللہ کی معرفت اور پہچان ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے "سبحان الذی أسری الخ" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ: ابن عباس نے آیت: "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" کی تفسیر "الا لیعرفون" سے کی ہے۔ (روح المعانی:۱۵/۱۵)

اور حضرت مجاهد سے یہ تفسیر متعدد حضرات مفسرین نے نقل کی ہے، جیسے امام ابوحیان نے البحر المحیط میں، علامہ آلوسی نے روح المعانی میں، ابن عادل نے اللباب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (البحر المحیط :۸/۱۰۹، روح المعانی:۱۵/۱۵، اللباب: ۱/۴٦۸۰)

الغرض یہاں اللہ تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ بندے میری معرفت حاصل کریں، اس لئے انسان و جنات کو پیدا فرمایا گیا۔

معرفت کو عبادت سے تعبیر کرنے میں حکمت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "لیعبدون" کیوں فرمایا جبکہ مقصود

"لیعرفون "ہے؟ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اللہ کی معرفت کا ذریعہ عبادت ہے،اگر اللہ کی معرفت پیدا کرنا ہے تو اس کا وسیلہ اور ذریعہ ہی اللہ کی عبادت ہے، لہذا اللہ کی عبادت کے بغیر اگر کوئی معرفت کا دعوی کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے،اس کی جانب اشارہ کرنے کے لئے معرفت کو عبادت سے تعبیر فرمایا گیا۔

اس میں ان جیسے لوگوں کا رد ہو گیا جو آج کل معرفت خداوندی کا دعوی کرتے ہیں،لیکن عبادت خداوندی سے عاری وخالی ہوتے ہیں،نہ نماز ہے،نہ روزہ ہے،نہ زکوۃ ہے،نہ سنت کی پابندی ہے،نہ ذکر ہے،نہ تسبیح ہے،دن رات اللہ کی نافرمانی ہے،پھر بھی معرفت کا دعوی ہے،نماز وہ نہیں پڑھیں گے،کہیں گے کہ ہم دل کی نماز پڑھتے ہیں،ذکر وہ نہیں کریں گے،کہیں گے کہ ہمارا دل ہر وقت ذاکر وشاغل رہتا ہے،زکوۃ وہ نہیں دیں گے،کہیں گے کہ زکوۃ سے مراد طہارت ہے،وہ ہمیں حاصل ہے،اس طرح تمام عبادات اور شرعی احکامات کے اندر تاویل کی راہ اختیار کرتے ہیں،اور گمراہی میں پھنس جاتے ہیں۔اس لئے اللہ تعالی جو علام الغیوب ہیں، جسے ساری کائنات کا علم ہے،اسے یہ بھی معلوم ہے کہ لوگ کیسی کیسی تاویلیں کریں گے، اس لئے قرآن میں خود ان کا علاج ذکر کر دیا کہ اگر تم بغیر عبادت کے معرفت خداوندی کا دعوی کرتے ہو تو تم جھوٹے ہو۔

اسی لئے اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کو دنیا میں بھیجا،آپ دنیا میں سب سے بڑے عارف،سب سے زیادہ اللہ کو پہچاننے والے،اللہ کے نبی نے خود ہی فرمایا ہے :"ان أتقاكم و أعلمكم بالله أنا " کہ تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کی معرفت رکھنے والا میں ہوں۔(بخاری: حدیث:۲۰)

اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ سب سے بڑے عارف باللہ تھے،اللہ تعالی نے معرفت سمجھانے آپ کو مبعوث فرمایا،آپ سے اعمال کروائے،عبادات: نماز،روزہ

زکاۃ، حج وقربانی، ذکر واذکار وغیرہ کراوئے تاکہ دنیا والوں کو بتائیں کہ یہی راستہ ہے، جس پر چل کر اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔

معرفت کی حقیقت

اب یہ سنئے کہ معرفت کسے کہتے ہیں؟ معرفت عربی کا لفظ ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں ''جاننا پہچاننا''، شریعت وتصوف کی راہ میں معرفت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو اس طرح جانا جائے پہچانا جائے کہ اس جاننے پہچاننے کے آثار اپنی ذات پر ظاہر ہونے لگیں۔ اللہ نے انسان کو اسی لئے پیدا کیا ہے۔

لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ ہم اللہ کی ذات کو جان نہیں سکتے تو پھر اللہ کو جاننے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی صفات کو جانا جائے، دوسرے اللہ تعالی کے افعال کو جانا جائے، تیسرے اللہ تعالی کے شئون کو جانا جائے، اللہ تعالی نے قرآن کریم میں اپنے افعال، اپنی صفات، اپنے شئون جگہ جگہ بیان فرمائے ہیں، انسان جب ان چیزوں کو جان لیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کو اللہ کی پہچان حاصل ہے، اسے معرفت کی دولت مل گئی ہے۔

ذات خداوندی کی معرفت محال ہے

ابھی میں نے جو عرض کیا کہ اللہ کی ذات کو ہم نہیں جان سکتے، تو واقعی بات یہی ہے؛ اس لئے اللہ کی ذت کو جاننے کی کوشش نہ کرے، اس لئے کہ ذات کو جاننے کی کوشش کرے گا تو ناکام ہو جائے گا، کیونکہ اللہ کی ذات کو کوئی نہیں جان سکتا، ذات کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کیسے ہیں ذات کے اعتبار سے، جیسے انسان کی حقیقت ذات کے اعتبار سے یہ ہے کہ وہ مٹی سے بنایا گیا ہے، اس کے اعضاء اتنے ہیں، ان کے فلاں فلاں کام ہیں، اسی طرح دیگر مخلوقات کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ

کس چیز سے بنے ہیں، ان سب چیزوں کی پہچان ان کے مادہ سے ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی چاہے کہ مخلوقات کی طرح اللہ کی ذات کو جانوں تو یہ ناممکن بات ہے، اس لئے کہ اللہ کی ذات انسان کی عقل سے ماوراء ہے، انسان کی عقل نہ وہاں پہونچ سکتی ہے، نا اس دنیا میں اس کی آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے۔

اسی لئے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿لَاتُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ (اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں) (الأنعام:۱۰۴)

اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے: " تفکروا فی خلق اللّٰہ لا تتفکروا فی اللّٰہ "(اللہ کی مخلوق میں غور وفکر کرو، اللہ کی ذات میں غور وفکر نہ کرو) (جامع الاحادیث:۱۰۹۰۱)

اسی لئے جب حضرت موسی علیہ السلام اللہ کی طرف سے فرعون کے پاس بھیجے گئے اور آپ نے فرعون سے کہا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں تو فرعون نے کہا: ﴿وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (رب العالمین کیا چیز ہے) (الشعراء:۲۵)

یعنی ذات کے بارے میں پوچھ لیا۔ حضرت موسی سمجھ گئے کہ اسے معرفت کی ''الف ب'' بھی معلوم نہیں ہے، حالانکہ معرفت کی ''الف ب'' سے تو کوئی کافر بھی خالی نہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ جب کفار کی کشتی بھنور میں پھنس جاتی ہے، طوفان کی زد میں آجاتی ہے، تو اس وقت وہ لوگ بھی اللہ ہی کو پکارتے ہیں، اپنے بتوں کو بھول جاتے ہیں، کیا مطلب ہوا؟ مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے اپنی پہچان کافر کو بھی عطاء کی ہے، لیکن فرعون ملعون اتنا نابلد و بے وقوف تھا کہ اسے بالکل اللہ کی پہچان نہیں تھی جس کی وجہ سے ایسا غلط سوال کیا کہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ حالانکہ پوچھنا چاہئے

کہ ''رب العالمین'' کون ہے؟ جیسے آپ سے آکر کوئی پوچھے کہ آپ کیا چیز ہیں؟ تو آپ ہنسیں گے، یہ پوچھنا چاہئے کہ آپ کون ہیں؟

الغرض حضرت موسیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ﴾ (وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا رب ہے اگر تم یقین مانو)[الشعراء : ۲۴]

اور فرمایا: ﴿رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَائِكُمُ الْأَوَّلِيْنَ﴾ (اللہ وہ ہے جو زمین اور آسمان کا رب ہے، تمہارا اور تمہارے آباء واجداد کا رب ہے)[الشعراء:۲۶]

اور فرمایا: ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ مَابَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (وہ مشرق ومغرب اور ان کے درمیان کی چیزوں کا پروردگار ہے، اگر تم سمجھو) [الشعراء:۲۸]

یعنی اللہ کی صفات کو بیان فرمایا، اللہ کی ذات کو بیان نہیں کیا، اس سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات کو کوئی جان نہیں سکتا۔ لہذا معرفت کا حاصل یہ ہوا کہ اللہ کی صفات وافعال کے بارے میں قرآن وحدیث اور انفس وآفاق میں پھیلے ہوئے دلائل میں غور وفکر کرتے ہوئے اس کی پہچان پیدا کرنا۔

جھوٹے مدعیان معرفت کی بے راہ روی

بعض لوگ اس لفظ معرفت کو بالکل غلط استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ایک شریعت والے ہیں، ایک معرفت والے ہیں، ان سے پوچھا جائے کہ معرفت کیا ہے؟ تو کہتے ہیں یہ کان میں کہی جانے والی بات ہے، سب کو نہیں بتائی جائیگی۔ اللہ تو معرفت کو قرآن میں کھلے عام بیان کر رہا ہے، احادیث میں ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے کھلے عام بیان فرمایا ہے، تو یہ کون ہوتے ہیں جو یہ کہیں

کہ معرفت عام نہیں ہے، اللہ نے تو اس لئے عام کردیا تا کہ جو بندہ چاہے آسانی سے حاصل کر سکے اور جو لوگ معرفت کو خاص کرتے ہیں، ان سے ہوتا کچھ نہیں صرف دعوے کرتے ہیں۔

ہر ضروری چیز کو اللہ نے عام رکھا ہے

دنیا میں اللہ تعالی کا ایک اصول یہ ہے کہ انسان کو جس چیز کی جس قدر زیادہ ضرورت ہے، اللہ نے اسے اسی قدر عام کیا ہے، اور قیمتی بھی نہیں بنایا۔ مثلاً انسان کو کھانے کی زیادہ ضرورت تھی، اللہ نے اسے ہر جگہ عام کیا، دکان میں ملے گا، بازار میں ملے گا، ہر جگہ ملے گا۔ اسی طرح انسان کو پانی کی ضرورت کھانے سے بھی زیادہ ہوتی ہے؛ اس لئے اللہ تعالی نے پانی کو کھانے سے بھی زیادہ عام کیا ہے، اور اللہ نے ہر جگہ مفت رکھا ہے، ہم جو پانی کی بل دیتے ہیں وہ اللہ کو نہیں دیتے بلکہ پانی پہنچانے کا انتظام کرنے والوں کو دیتے ہیں، گورنمنٹ کو دیتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اس اللہ کے پانی کو گھر گھر پہنچایا تو ہم ان کو سروس چارج دیتے ہیں، یہ پانی کا چارج نہیں ہے، پانی کا سروس چارج ہے، پانی کا چارج کون دے سکتا ہے؟ اگر اللہ تعالی پانی کا بل (bill) مانگنے لگیں تو آپ کسی بِل میں گھس جائیں گے، پانی کا بل نہیں دے سکیں گے، اور پانی سے زیادہ ضرورت انسان کو ہوا کی ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالی نے ہوا کو اتنا عام کیا ہے کہ آپ جہاں میں جہاں بھی جائیں گے وہیں ہوا آپ کا استقبال کرے گی، اس کا بھی کوئی بل کسی طور پر بھی نہیں لگتا، ایک انسان چوبیس گھنٹوں میں چوبیس ہزار دفعہ سانس لیتا ہے، یعنی ایک گھنٹے میں ایک ہزار دفعہ سانس لیتا ہے، اگر اللہ تعالی ایک گھنٹے کا بھی چارج کرتے تو انسان کی حالت کیا ہوتی؟

اس کے برخلاف جس چیز کی ضرورت کم ہوتی ہے، اللہ تعالی اسے خاص کرتے

چلے جاتے ہیں ،اس پر پابندیاں لگاتے چلے جاتے ہیں ، پابندیاں لگاتے لگاتے اسے قیمتی بھی بنادیتے ہیں ،مقید کردیتے ہیں ،محبوس کردیتے ہیں ، مجبور کردیتے ہیں ، اور قیمتی سے قیمتی بنادیتے ہیں ، جیسے ''ہیرا'' انسان کی ضرورت کا نہیں ہے،اس لئے اللہ نے اسے اتنا قیمتی بنادیا کہ عام آدمی اسے خرید نہیں سکتا ، اور محبوس بھی کردیا ، ہم میں سے بہت سارے لوگوں نے ہیرے کو دیکھا ہی نہیں ہوگا ، اسی طرح سونا ، موتی وغیرہ ہیں۔

اب اس اصول کو سامنے رکھ کر میں ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ کی معرفت انسان کو سانس سے زیادہ ضروری ہے،اس کے کھانے سے زیادہ ضروری ہے،اس کے پینے سے زیادہ ضروری ہے، اتنی زیادہ ضروری چیز کو کیا اللہ تعالی خاص کر کے رکھ دیں گے کہ بعض لوگوں کو دیدیں اور کہیں کہ تم ہی اسے لئے پھرنا ، صرف کان میں بولنا۔ ہو ہی نہیں سکتا ، ناممکن بات ہے ، جیسے اللہ تعالی نے ضرورت انسانی کی اشیاء کو کھلے عام پیش کردیا ہے، اسی طرح معرفت الٰہی بھی ہماری روح کے لئے ضروری چیز ہے ، جسے اللہ تعالی نے کھلے عام بیان فرمایا ہے ، یہ کوئی مخفی اور پوشیدہ راز نہیں ہے۔

معرفت الٰہی کتنی عام ہے

اب میں آپ لوگوں کو بتاوں گا کہ اللہ تعالی نے معرفت الٰہی کو انسانی ضرورت کے پیش نظر کتنا عام کیا ہے۔ قرآن کریم کی ہر آیت کے اندر معرفت موجود ہے۔

واقعہ لکھا ہے کہ ایک آدمی مسلمان ہوا ، اس سے پوچھا گیا کہ کس چیز نے تمہیں اسلام کی طرف مائل کیا تو اس نے کہا کہ میں نے قرآن کریم پڑھا تو معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی ہر آیت میں اللہ تعالی نے اپنی کوئی نہ کوئی صفت بیان کی ہے ، کہیں

بصیر فرمایا ہے تو کہیں خبیر، کہیں علیم فرمایا ہے تو کہیں علام الغیوب وغیرہ۔اس سے میں نے سمجھا کہ قرآن و اسلام دراصل اللہ کی معرفت کی تعلیم دیتے ہیں ،اس کے برخلاف عیسائی اور دوسرے مذاہب میں خدا کا کوئی خاص تذکرہ نہیں ،نہ اس کی صفات کا بیان ہے،اس لئے مجھے اسلام نے اپیل کیا اور میں مسلمان ہوگیا۔

تو معلوم ہوا ہر آیت میں معرفت کا سامان ہے ، جو بھی قرآن کریم غور سے پڑھے گا تو وہ ضرور بالضرور اللہ کا عارف بندہ بن جائے گا ، دوسری طرف احادیث نبوی بھی معرفت سے بھری پڑی ہیں ،تیسرے یہ کہ اللہ نے ساری دنیا کی ہر چیز کو معرفت کا سامان بنادیا ہے، زمین کا ذرہ ذرہ معرفت الٰہی کا مظہر ہے، آسمان کا ذرہ ذرہ معرفت الٰہی کا مخزن ہے،سورج اللہ کی معرفت کا سامان ، چاند اللہ کی معرفت کا سامان، شجر وحجر اللہ کی معرفت کا سامان، چیونٹی اللہ کی معرفت کا سامان،خود انسان اور اس کے اعضاء اللہ کی معرفت کا سامان ہیں۔

بھائیو! اب بتاؤ کہ اللہ کی معرفت کتنی عام ہے؟ کھانا لینے تو آپ کو بازار جانا پڑے گا، لیکن معرفت حاصل کرنے کہیں جانے کی ضرورت نہیں، نیچے دیکھو تو معرفت ،اوپر دیکھو تو معرفت ، داہنی طرف دیکھو تو معرفت ، بائیں طرف دیکھو تو معرفت ،سامنے دیکھو تو معرفت ، پیچھے دیکھو تو معرفت ، ہر سو اللہ کی معرفت کا سامان جمع ہے۔

اسی لئے ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ وَّ

تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ﴾(البقرۃ:۱۶۴)

(بلاشبہ زمین وآسمانوں کی تخلیق میں اور رات و دن کے آنے جانے میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کی نفع بخش چیزیں لیکر چلتی ہیں اور پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے نازل کیا، پھراس سے زمین کے خشک ہو جانے کے بعد اس کوتر و تازہ کیا (اور کھیتیاں اگائیں) اوران سے زمین میں ہر قسم کے حیوانات پھیلائے، اور ہواؤں کی سمتوں کے بدلنے میں (کہ کبھی پرُوا ہوا چلتی ہے تو کبھی پچھوا، کبھی گرم تو کبھی سرد) اور بادل میں جو زمین وآسمان کے درمیان معلق ہے، ان سب میں عقل سے کام لینے والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں)

قرآن میں اس طرح کی سینکڑوں آیات ہیں جن میں اللہ تعالی نے انسانوں کو انفس وآفاق میں غور کر کے اللہ کی معرفت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے۔

ایک جگہ کس قدر عجیب انداز سے فرمایا گیا کہ:

﴿اَفَلاَ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ، وَ اِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ، و اِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ﴾ [الغاشیة:۱۷-۲۰]

(تو کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنایا گیا ہے، اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح کھڑے کئے گئے ہیں اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پھیلائی گئی ہے)

اس میں سبھی لوگوں کو بالعموم اور عربوں کو بالخصوص دعوت دی گئی ہے جن کے پاس اونٹ ہوا کرتے تھے کہ اللہ کی قدرت دیکھنا ہو اور اس کی معرفت پیدا کرنا ہو تو

ان اونٹوں اور دیگر مخلوقات کو دیکھو اور معرفت حاصل کرو۔

حصول معرفت کا طریقہ

الغرض اللہ کی صفات کو جاننے اور ان پر غور کرنے سے اللہ کی معرفت آتی ہے، اللہ کی بے شمار صفات ہیں، جیسا کہ اللہ کے صفاتی ناموں سے معلوم ہوتا ہے، اللہ کے ہزاروں صفاتی نام ہیں، ہر نام میں اللہ کی ایک صفت بیان کی گئی ہے، ان میں سے ایک مثال کے طور پر اللہ کا رحم وکرم ہے، یہ ایک ایسی صفت ہے کہ بچہ بچہ جانتا ہے، ہر آن اور ہر لمحہ اللہ کی طرف سے ہمارے اوپر رحم وکرم کی بارش ہو رہی ہے، یہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کھلی ہوئی حقیقت کو کھولنے کی کوشش کرنا تحصیل حاصل ہے۔

اب ہم نے اللہ تعالیٰ کو جانا کہ ہمارا رب وہ رب ہے جو ہمارے اوپر ہر وقت احسان وکرم ورحم فرما رہا ہے، میں اٹھتا ہوں تو اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، بیٹھتا ہوں تو اللہ کا رحم میرے ساتھ، میں کھاتا ہوں تو اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، سب جگہ رحم ہی رحم اور کرم ہی کرم ہو رہا ہے۔

آپ بستر سے اٹھ رہے ہیں، اگر خدا کا رحم وکرم شاملِ حال نہ ہو تو آپ بستر سے کیسے اٹھ جائیں گے؟ اگر خدا کا رحم وکرم نہ ہوا تو آپ کا کھانا آپ کے حلق کے اندر کیسے اتر جائے گا، وہی لقمہ آپ کے لیے موت کی دعوت بن سکتا تھا، لیکن وہ لقمہ آپ کھاتے ہیں، اندر بھی پہونچتا ہے، ہضم ہوتا ہے، اس سے قوت بنتی ہے اور آپ کام کاج کرنے کے قابل ہوتے ہیں، دین ودنیا کے بہت سارے کام کاج کرنے لگتے ہیں، کیا یہ اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم شامل حال ہونے ہی کی وجہ سے نہیں ہے؟

کھاتے وقت اللہ کا عجیب رحم وکرم

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ نے ایک جگہ پر فرمایا ہے کہ ہم جو روزانہ کھانا کھاتے ہیں، یہ اصل میں اگر ہم غور کریں تو دو دفعہ اپنے اوپر فائرنگ کرنے کی طرح ہے، بندوق چلانے کی طرح ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ جب آپ لقمہ لیتے ہیں اور منہ میں رکھتے ہیں اور حلق میں اتارتے ہیں تو حلق میں اتارنے کے وقت ایک ایسے کٹھن ونازک مرحلہ سے آپ کو گذارا جاتا ہے کہ اگر آدمی تھوڑی دیر سوچے تو پریشان ہوجائے، بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔

ہر انسان کے حلق میں دو نلکیاں ہوتی ہیں، ایک سامنے اور ایک پیچھے، پیچھے جو نلکی ہے، اس میں کھانا جاتا ہے اور سامنے جو نلکی ہے، اس میں ہوا کا آنا جانا ہوتا ہے، جس سے آپ سانس لیتے ہیں، تو پہلے سانس کی نلکی آتی ہے اور سانس کی نلکی کو پار کرکے کھانا پیچھے کی نلکی میں جاتا ہے، اب سوچئے کہ اگر ذرا سا پانی کا قطرہ یا ذرا سا کھانے کا دانہ پیچھے کی نلکی میں جانے کے بجائے پہلی میں اُتر جائے تو ہلاکت اور موت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا کیا نظام بنایا؟ حلق کے پاس ایک چھوٹی سے جیب بنائی ہے اور جب انسان کھانا یا پینا چاہتا ہے تو اس جیب کو حلق کے اوپر پل کی طرح بنادیتے ہیں، جب آپ کھانا کھاتے ہیں تو وہ جیب پلٹ کر اس پہلی نلکی کو بند کردیتی ہے، اور اس پر پل بن جاتی ہے اور کھانا اس پل پر سے پار ہوکر اندر دوسری اندر والی نلکی میں چلا جاتا ہے۔

یہ ہے سسٹم، اب اس سسٹم پر تھوڑی دیر کے لیے غور کیجئے کہ وہ جیب بند نہ ہوئی تو کیا ہوگا، اگر کوئی پروبلم (problem) آجائے پھر تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔

یہ رحم نہیں ہے اللہ کا؟ اگر خدا تعالیٰ کا رحم ایک منٹ کے لئے بھی بلکہ ایک منٹ

کے ۱۰۰ حصہ میں سے بھی تھوڑے حصہ میں نہ ہو تو پھر انسان کے لیے ہلاکت ہے۔اب روزانہ ہم تین دفعہ کھانا کھاتے ہیں، دراصل تین دفعہ ہم روزانہ اپنے اوپر فائرنگ کرتے ہیں۔اب کھاتے وقت آدمی یہ سوچے کہ میں کھانے جارہا ہوں، اور اندر کی جیب کھل رہی ہے، پل بن رہا ہے، وہ میرا کیسا خدا اور مالک ہے جس نے ایسا سسٹم بنا رکھا ہے۔کیا اس سے اللہ کی معرفت پیدا نہیں ہوگی؟

صفت رحمت سے قرآن کی ابتداء

قرآن کریم جہاں شروع ہوا ہے، وہاں سب سے پہلے یہ آیت ہے۔ ﴿ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ﴾ (شروع اللہ کے نام سے جو بہت رحم والا نہایت مہربان ہے) رحیم ورحمان دو لفظ لائے گئے، دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں ،دونوں کے اندر انتہائی مبالغہ ہے، رحمٰن کے معنی ہیں ،بے انتہا رحم کرنے والا ،، یہی معنی رحیم کا بھی ہے، اور دونوں میں فرق ہے، وہ فرق یہ ہے کہ رحمان اس کو کہتے ہیں جس کا رحم وکرم ہر چیز پر عام ہو، اور رحیم کہتے ہیں اس کو جس کا فضل وکرم ورحم مخصوص قسم کے لوگوں کے لیے مخصوص انداز کا ہو، جیسے انبیاء کے لیے مخصوص رحم ہے، اولیاء کے لیے مخصوص کرم ہے، اپنے خاص بندوں کے لیے مخصوص انداز کا اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، مخصوص رحم کرنے والے کو رحیم کہتے ہیں اور جس کی رحمت سب کے لیے عام ہو، چاہے کافر ہو، چاہے ماننے والا ہو، چاہے نہ ماننے والا ہو، چاہے وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز ہو، سب کے لیے جس کی رحمت عام ہو، اسے رحمان کہتے ہیں۔

اسی لیے علماء کرام نے لکھا ہے کہ کسی انسان کو رحمٰن نام رکھنا تو جائز نہیں ہے، ہاں رحیم نام رکھ سکتے ہیں، اس لیے کہ انسان اس قدر عام رحم کا معاملہ کر ہی نہیں سکتا، لہٰذا انسان رحمان نہیں بلکہ عبدالرحمٰن ہے، رحمان کا بندہ ہے، لیکن رحیم چاہے تو رکھ

سکتے ہیں، اس لیے کہ مخصوص رحم انسان بھی کسی کے ساتھ کر دیتا ہے، لیکن عام رحم جیسے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اچھوں پر، بروں پر، انسانوں و جانوروں پر، ہر مخلوق پر، ہر طرح، ہر اعتبار سے، اس طرح رحم کرنے والا صرف اور صرف اللہ ہے۔

اللہ نے سب سے پہلے یہ آیت قرآن میں ذکر کی، یہ بتانے کے لیے کہ میری ذات کا عنوان ہی رحمان و رحیم ہے۔ جب ہم اللہ کی اس صفت میں غور کریں گے تو معرفت الٰہی پیدا ہوگی۔

تصوف کا ایک مسئلہ

جب آپ کو یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اسی سے ایک تصوف کا مسئلہ بھی حل ہو گیا وہ یہ کہ جہاں تک حصول معرفت کا مسئلہ ہے، اس کے لئے کسی شیخ و مرشد کی کوئی ضرورت نہیں، ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ بات عجیب لگے، لیکن حقیقت یہی ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا دنیا و مافیہا کا ہر ذرہ اپنے اندر معرفت الٰہی کا سامان رکھتا ہے، تو حصول معرفت کے لئے کسی شیخ کی ضرورت نہیں۔ اب سوال پیدا ہوگا کہ پھر پیر کی ضرورت کس لئے ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت کے آثار اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے شیخ کی ضرورت ہے، حصول معرفت کے لئے نہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے معرفت الٰہی کے سلسلہ میں کسی بھی انسان کو معذور قرار نہیں دیا ہے

مثلاً کوئی کہنے لگے، اے اللہ! مجھے تیری معرفت ملی ہی نہیں، معلوم ہی نہیں ہوا، میں کیا کروں؟ اگر مجھے تیری معرفت مل جاتی تو میں تیری عبادت کرتا، اگر اللہ کے سامنے یوں کہے گا تو اس کا عذر معتبر نہیں ہوگا، اس لئے کہ کائنات کا ہر ذرہ معرفت کا سامان ہے۔ اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ کسی بھی انسان کو اللہ کی معرفت اور توحید بتانے کے لئے کسی نبی کا آنا ضروری نہیں، بلکہ اس کے لئے اس کی

عقل خود کافی ہے۔ معلوم ہوا جب معرفت الٰہی کے لئے نبی ہی کی ضرورت نہیں تو پھر شیخ کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں معرفت کے آثار اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے شیخ کی ضرورت ہے۔

کیونکہ معرفت کی شرعی تعریف صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کی صفات کو جان لیا جائے، کیونکہ اتنا جاننا تو ہر مخلوق میں عام ہے، حتیٰ کہ کافر بھی اتنا جانتا ہے، بلکہ معرفت کی تعریف یہ ہے کہ اللہ کو اس طرح سے جانے پہچانے کہ اس کے آثار نمایاں ہوں اور ان سے انسان متأثر ہو۔

معرفت کا علم آثارِ معرفت ہی سے ہوتا ہے

جب اللہ کی معرفت بندہ کے قلب میں آتی ہے تو اس پر اس کے کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں اور ہر چیز میں یہی بات ہے کہ جب کسی چیز کو جاننے کے بعد اُس کا اثر مرتب ہو تب کہا جاتا ہے، سمجھا جاتا ہے، عوام میں بھی، خواص میں بھی کہ اس کو وہ چیز حاصل ہوگئی۔

مثال کے طور پر ایک لڑکا ہے، وہ اپنے باپ کو گالی دیتا ہے تو آپ اُسے کہتے ہیں کہ کیا حرکت کررہا ہے، وہ تو تیرا باپ ہے باپ۔ وہ لڑکا آپ کو پلٹ کر یہ کہے گا کہ مجھے آپ سے زیادہ معلوم ہے کہ یہ میرا باپ ہے۔ باپ ہونے کا علم بیٹے کو جتنا ہے کسی اور کو کیا ہوسکتا ہے؟ ظاہر بات ہے، وہ دوسروں سے زیادہ اپنے باپ کی پہچان رکھتا ہے، لیکن اسے آپ بتاتے ہیں کہ بھائی! وہ تیرا باپ ہے باپ۔ کیوں بتاتے ہیں؟ اس لیے کہ باپ کو باپ جاننے کا جو اثر ہونا چاہئے، اس کا ادب، اس کی جلالت، اس کی عظمت، اس کا خوف، اس کی خشیت، وہ اس کے اندر نہیں ہے، اس لیے آپ اسے کہتے ہیں، بھائی! یہ تیرا باپ ہے باپ۔ وہ اگر آپ کو پلٹ کر یہ

جواب دے کہ مجھے تو آپ سے اچھا معلوم ہے کہ یہ میرا باپ ہے، تو آپ اسے کہتے ہیں کہ تو نے باپ کو جانا ہی نہیں ہے، اگر تو جان لیتا تو پھر اس کی عظمت نہ ہونے کا کیا سوال؟ اس سے محبت نہ ہونے کا کیا سوال؟ اس کا ادب نہ کرنے کا کیا سوال؟ ظاہر بات ہے کہ یہ چیزیں جاننے کا اثر ہیں، لازمہ ہیں، وہ اس کے اندر آنا ضروری ہے۔

جب تک معرفت و پہچان کا اثر نہیں پیدا ہوگا نہیں سمجھا جائے گا اور نہیں مانا جائے گا نہیں قبول کیا جائے گا کہ اسکو اس چیز کی معرفت حاصل ہے، ہوسکتا ہے کہ لغت و ڈکشنری کے معنی کے لحاظ سے حاصل ہوگئی ہو، مگر شریعت میں اس کو معرفت حاصل نہیں ہوئی۔

بالکل اسی طریقہ پر بھائیو! اللہ کی معرفت یعنی اللہ کے اوصاف اور کمالات اور اللہ کی خصوصیات کو جاننے و پہچاننے کا جو اثر ہونا چاہیئے ، جب تک وہ اثر ہمارے اندر نہیں پیدا ہوگا ، یہی سمجھا جائے گا کہ اللہ کی معرفت نصیب نہیں ہے۔ اور جب اس معرفت کے آثار پیدا ہو جائیں تو سمجھا جائے گا کہ معرفت حاصل ہوگئی۔ اس لئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ معرفت کا علم آثار معرفت ہی سے ہوتا ہے۔

اللہ کی معرفت کا پہلا اثر محبت ہے

اب آیئے یہ دیکھیں کہ معرفت الٰہی کے آثار کیا کیا ہیں؟ اللہ کی معرفت کا ایک اہم ترین اثر اللہ کی محبت ہے اور یہ قلب کی عبادت ہے، دل میں اللہ کی محبت آئے گی تو دل اللہ کا عبادت گذار بنے گا، اور جب دل کے اندر دنیا اور دنیا والوں کی محبت ہوگی تو دل گنہگار ہو جائے گا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۣاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴾ (التوبۃ:۲۴)

(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے ماں باپ، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی بہن، بیویاں، رشتہ دار، تمہارے مال جو تم کماتے ہو، تجارت جس کے خسارے کا تم کو خطرہ لگا رہتا ہے، تمہارے مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب اگر تم کو اللہ و رسول اور اللہ کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا حکم یعنی عذاب آ جائے، اور اللہ حد سے گزر جانے والوں کو ہدایت نہیں دیتے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ان لوگوں سے محبت نہ رکھو، اور تم ماں باپ سے محبت نہیں کر سکتے، بیوی سے محبت نہیں کر سکتے، جائیداد و املاک سے محبت نہیں رکھ سکتے، بلکہ یہ فرمایا کہ ان سے اللہ و رسول سے زیادہ محبت نہیں رکھ سکتے۔ ہاں والدین سے بھی محبت چاہئے، بیوی سے بھی محبت چاہئے، اگر والدین سے محبت نہ ہوگی تو والدین کا حق کیسے ادا ہوگا، ان کا ادب کیسے کریں گے۔ سب سے محبت ہو، لیکن وہ محبت کمزور ہو اور اللہ و رسول کی محبت غالب ہو۔

معلوم یہ ہوا کہ ساری چیزوں کی محبت کمزور ہونی چاہئے، اللہ اور رسول کی محبت غالب ہونا چاہئے۔ یہ معرفت کا اثر ہے، جب بندہ اللہ کو پہچان لے گا اور یہ بھی پہچان لے گا کہ ماں باپ کو بنانے والا بھی وہی، میری بیوی کو بنانے والا بھی وہی، میرے بھائی بہنوں کو پیدا کرنے والا بھی وہی، جائیداد املاک کو پیدا کر کے مجھ تک

پہونچا کر میرے لیے راحت کا سامان کرنے والا بھی وہی، تو اللہ کی محبت ضرور آئے گی، اس لیے جب معرفت آئے گی تو اللہ کی محبت ضرور آئے گی۔

معرفت سے ہی محبت پیدا ہوتی ہے، امام رَبِیْعَۃُ الرَّ ائے کا واقعہ

یاد رکھئے کہ جب تک انسان کو اللہ کی پہچان نہ ہو، اس کے دل میں اللہ کی محبت پیدا نہیں ہوسکتی، بہت زمانہ پہلے یعنی بنوامیہ کے دور کا واقعہ ہے، جب کہ امام مالک ابھی طالب علمی کی زندگی گذار رہے تھے، ان کے ایک استاذ تھے، جن کا نام رَبِیْعَۃُ الرَّ ائے تھا، بہت بڑے عالم تھے، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام مالک کے استاذ کیسے ہوں گے؟ بہت بڑے جلیل القدر فقیہ بھی تھے اور محدث بھی تھے، اور اللہ والے بزرگ بھی تھے، ان کے والد کا نام فروخ تھا۔

جب امام ربیعۃ الرائے ماں کے پیٹ میں تھے تو ان کے والد فروخ خراسان کی جانب جہاد کی مہم پر امیر المومنین کے حکم سے نکل گئے، جب جہاد میں جانے کے لیے نکلے تو چوں کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ کب واپسی ہوگی اور کیا حالات ہوں گے کہ زندہ بھی آؤں گا یا اللہ کی راہ میں شہید ہوجاؤں گا؟ اس لئے ان کے پاس جو ۳۰ ؍ ہزار دینار یا درہم تھے، انہوں نے اپنی بیوی کو دیا اور کہا کہ میں جہاد میں جارہا ہوں اور یہ تیس ہزار تمہارے حوالے ہیں، ضرورت کے مطابق اس میں سے خرچ کرتے رہنا، اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی باقی رکھی اور واپسی ہوگئی تو پھر میں تم سے آکر حساب لے لوں گا یہ کہہ کر نکل گئے۔

جو نکلے تو ایسے حالات ان کے اوپر آئے کہ تاریخ بغداد کے مطابق تقریباً اس واقعہ کے ستائیس برس بعد ان کو لوٹنا نصیب ہوا، لمبے چوڑے عرصے کے بعد واپسی ہوئی۔ مدینہ ان کی بستی تھی اور اپنی بیوی کو مدینہ میں ہی چھوڑ کر گئے تھے، جب

واپس مدینہ آئے تو دیکھا کہ وہاں کی پوری فضا بدلی ہوئی ہے، نئی نئی سڑکیں بن گئی ہیں، نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں، خیر آئے اور بہت غور وفکر کے بعد اپنی گلی وغیرہ کو پہچانا اور اپنے گھر پہنچے اور جب پہونچے تو وہ رات کا وقت تھا، اپنے گھوڑے کو ایک طرف باندھا اور نیزے سے دروازہ کھولا، اور دروازے کے اندر گھسنے لگے۔

تو ایک صاحب باہر آرہے تھے، دونوں میں ملاقات ہوئی، جب انہوں نے دیکھا کہ یہ اندر گھس رہے ہیں تو ان کو ٹوکا اور کہا کہ ارے اللہ کے دشمن! کسی کے گھر میں بلا اجازت جانا جائز نہیں ہے، تو فروخ نے کہا: یہ کسی کا گھر نہیں ہے، یہ تو میرا گھر ہے، میرے گھر میں کس سے اجازت لوں؟ اب دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگی، وہ کہتے ہیں یہ میرا گھر ہے اور وہ کہتے ہیں تم گھس نہیں سکتے، یہ تو میرا گھر ہے، دونوں میں جو گفتگو ہوئی تو پڑوسی لوگ جمع ہوگئے، ربیعہ کہنے لگے کہ میں ان کو سلطان کے پاس فیصلہ کے لئے لے جاؤں گا اور فروخ نے کہا کہ ہاں میں بھی تم کو بادشاہ کے پاس لے جاؤں گا، یہ سب باتیں ہو رہی تھیں کہ ان کی بیوی نے اندر سے سنا اور آکر دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے؟

جو دیکھا تو تماشا یہ نظر آیا کہ دونوں باپ بیٹے دست وگریبان ہیں، ان کو بڑا تعجب ہوا، اور انہوں نے کہا کہ یہ معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جھگڑا ہو رہا ہے، پہچان نہیں ہے، باپ نے بیٹے کو پہچانا اور نہ بیٹے نے باپ کو پہچانا۔ بیوی نے کہا کہ تم دونوں آپس میں کیا کر رہے ہو؟ بیٹے سے کہا: بیٹا ربیعہ! یہ تو تمہارے باپ ہیں، ملاقات کرو اور ان سے کہا فروخ یہ تمہارے بیٹے ہیں، ان سے ملاقات کرو۔ جب ماں نے پہچان کرائی تو پھر دونوں نے معافی چاہی اور روتے ہوئے آپس میں گلے ملنے لگے۔ (تاریخ بغداد: ۴۲۲/۸)

میں نے یہ مثال اس لیے دی تھی کہ جب دونوں میں پہچان نہیں تھی تو لب و لہجے میں فرق، اور انداز ایسا، اور جب بیٹے کو معلوم ہوا کہ یہ میرے ابا جی ہیں اور باپ کو معلوم ہوا کہ یہ میرا بیٹا ہے تو پھر گلے مل رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ معرفت و پہچان اتنی بڑی چیز ہے کہ جب پہچان ہوتی ہے تو دل میں محبت آتی ہے اور پہچان نہیں ہوتی تو دل میں محبت نہیں ہوتی۔ اس لیے جب انسان اللہ کی پہچان اپنے اندر پیدا کرتا ہے تو اس کے دل کے اندر اللہ کی محبت آجاتی ہے۔

معرفت کا ایک اثر خوف الٰہی ہے

معرفت کا ایک اثر خوف الٰہی ہے، کہ آدمی اللہ کی جلالت و عظمت کی وجہ سے اللہ سے خوف کھائے اور ڈرے۔ خوفِ خداوندی معرفت الٰہی کے اثرات میں سے بہت بڑا اثر ہے، جس میں اللہ کی معرفت ہوگی وہ اللہ کا خوف اور خشیت بھی رکھے گا اور جس کے دل میں خوف الٰہی نہ ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں معرفت الٰہی بھی نہیں ہے۔

اللہ کا خوف دو وجہ سے ہوتا ہے، ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیں گے، اس وجہ سے اللہ سے ڈر رہا ہے، یہ تھرڈ کلاس ڈر ہے، اور فسٹ کلاس ڈر یہ ہے کہ اس لیے ڈر رہا ہے کہ اللہ کی عظمت وجلالت اس کے دل میں ہے کہ اللہ کیسی عظیم و بھاری ذات ہے، کتنی قدرت والی ذات ہے، اس اللہ کی عظمت و کبرائی کے پیش نظر وہ اللہ سے ڈرتا ہے۔

دونوں بھی درست ہیں لیکن ان میں اعلیٰ وادنی کا فرق ہے۔ اللہ کی عظمت وجلالت کے پیش نظر ہمارے دلوں میں خوف خدا پیدا ہو جائے، اور یہ کب پیدا

ہوگا؟ جب اللہ کی معرفت ہوگی۔ جیسے ایک شخص باپ کی عظمت کو جانتا ہے تو اس کا خوف وڈر اس کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔ باپ سے نہ ڈرنے والے دراصل باپ کی عظمت وجلالت سے واقف ہی نہیں ہوتے؛ اس لئے وہ باپ کی توہین کرتے اور اس سے بے خوف ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر اللہ تعالی کی عظمت وجلالت کا مشاہدہ ہوجائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ کا ڈر نہ پیدا ہو۔ جب یہ معلوم ہو کہ اللہ کی ذات وہ ہے جس کے بارے میں خود اس نے کہا ہے کہ: ﴿يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾ (کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اس کا فیصلہ کرتا ہے) اس کی عظیم ہستی کے سامنے کسی نبی یا ولی یا فرشتہ کو لب کشائی کی مجال نہیں۔ اس کے سامنے کسی کی سفارش کرنا بھی اس کے اذن وحکم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ ان سب امور کی معرفت سے ضرور اللہ کا خوف پیدا ہوگا۔

خوف الٰہی بھی معرفت کا نتیجہ ہے، ایک واقعہ

اس سے معلوم ہوا کہ خوف بھی معرفت و پہچان کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے، اگر معرفت و پہچان نہ ہو تو خوف نہیں آسکتا، جب پہچان ہوگی تو خوف آجائے گا۔

امام جلال الدین رومیؒ نے لکھا ہے کہ ایک آدمی سفر پر نکلا، جنگل میں چلتا رہا، جنگل میں بہت دور چلنے کے بعد اسے تھکان ہوئی اور تھکان کی وجہ سے نیند غالب ہوگئی، اس نے سوچا کہ کہیں آرام کرلوں لیکن آرام کرنے اس لیے ہمت نہیں ہوئی کہ جنگل کا راستہ ہے اور جنگل کے راستہ میں کیسے آرام کروں؟ سوچتا رہا کہ کوئی چیز مجھے ایسی مل جائے جس کی وجہ سے مجھے کچھ سہارا مل جائے تو میں آرام کرلوں، بہت آگے جانے کے بعد دیکھا کہ ایک جانور سویا ہوا ہے، اس نے کہا کہ بہت اچھا،

یہ کوئی جانور سو رہا ہے، میں بھی اس کے بازو سو جاؤں۔

چنانچہ جانور کے بازو وہ بھی جا کر لیٹ گیا، نیند کا اتنا غلبہ تھا، تھکان ایسی تھی کہ بس پڑتے ہی نیند لگ گئی، کچھ دیر بعد اسی راستے سے ایک دو آدمی آ رہے تھے، پیچھے سے آتے آتے جب وہ وہاں پہنچے تو ایک عجیب منظر انہوں نے دیکھا کہ ایک انسان سویا ہوا ہے اور اس کے بازو جو جانور سویا ہوا ہے، وہ حقیقت میں شیر ہے، یہ لوگ بہت پریشان ہوئے کہ کہیں یہ شیر جاگے اور اس بیچارے کو کھا جائے۔ انہوں نے آہستہ سے سونے والے کو آواز دی اور جگایا، جب وہ جاگا تو ان لوگوں نے اس سے کہا کہ کہاں سوئے ہو؟ وہ تمہارے بازو شیر ہے شیر۔ بس جناب اتنا سنتے ہی وہ گھبرایا پریشان ہوا اور ڈر کے مارے اس کی جان نکل گئی اور مر گیا۔

دیکھئے جب تک اسے شیر کی معرفت و پہچان نہیں تھی تو اس پر شیر کا خوف بھی پیدا نہیں ہوا، جیسے ہی شیر کی معرفت حاصل ہوئی تو اس کا خوف بھی پیدا ہوا اور وہ مر گیا۔ اسی طرح جب اللہ کی پہچان انسان کو ہو جاتی ہے کہ اللہ کتنا بڑا اور زبردست ہے، کتنی بڑی طاقت والا ہے، وہ کیا سے کیا کر سکتا ہے،؟ جب یہ پہچان اللہ کی انسان کو ہوگی تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے دل کے اندر کوئی ہلچل نہ مچے اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں اللہ کا خوف پیدا نہ ہو۔

نبی ﷺ کا خوف

دیکھئے رسول اللہ ﷺ اور اولیاء اللہ کو معرفت حاصل تھی تو وہ حضرات اللہ کا ڈر و خوف بھی رکھتے تھے۔ حدیث میں ہے، ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں آیا تو دیکھا کہ :" وهو يصلي ولصدره أزيز كأزيز المرجل" (رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سینہ سے ایک آواز نکل رہی تھی

جیسے ہانڈی پکنے کی آواز ہوتی ہے)(ابوداود:۹۰۴،احمد:۱۶۳۵۵،شرح السنۃ:۲۴۵/۳، نسائی:۱۲۱۴)

حضرت عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی کوئی عجیب بات سنایئے جو آپ نے دیکھی ہو، حضرت عائشہ کچھ دیر خاموش رہیں، پھر کہا کہ ایک بار اللہ کے نبی میرے پاس رات میں لیٹے ہوئے تھے، آپ نے کہا کہ یا عائشہ! چھوڑ کہ میں آج رات اللہ کی عبادت کروں، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں تو آپ کا قرب چاہتی ہوں، اور یہ بھی کہ جو آپ کو پسند ہو۔ پھر آپ اٹھے اور وضو کیا اور نماز پڑھنے لگے اور برابر روتے رہے، یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھی مبارک اور زمین تر ہوگئی۔ پھر حضرت بلال آپ کو نماز فجر کیلئے بلانے آئے اور جب دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں تو عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ کیوں روتے ہیں جبکہ اللہ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کردئے ہیں تو فرمایا کہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔(صحیح ابن حبان:۳۸۶/۲،مشکل الآثار للطحاوی:۲۳۶/۱۰،موارد الظمآن :۱۴۳/۱)

صحابہ کا خوف

اسی طرح حضرات صحابہ بھی عارفین تھے تو ان کو بھی خوف خدا حاصل تھا۔ بخاری وغیرہ میں حضرات صحابہ کے بارے میں آیا ہے کہ ایک بار اللہ کے نبی ﷺ نے خطبہ دیا، حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا خطبہ نہیں سنا، آپ نے اس میں فرمایا کہ :" لو تعلمون ما أعلم لضحكتم قليلا و لبكيتم كثيرا"(اگر تم ان باتوں کو جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم بہت کم ہنستے اور زیادہ روتے) یہ سن کر

حضرات صحابہ سب کے سب رونے لگے۔ ایک روایت میں ہے کہ صحابہ نے اپنے سروں کو ڈھانپ لیا اور رونے لگے۔ (بخاری: ۴۶۲۱)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے سورۂ مطففین نماز میں پڑھی اور آیت: ''يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' (جس دن کہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے) تک پہنچے تو روتے رہے یہاں تک کہ بے ہوش کر گر پڑے۔ (صفۃ الصفوۃ: ۲۰۳/۱)

اولیاء اللہ کا خوف

حضرات اولیاء اللہ کا خوف بھی دیکھیے، ایک بڑے بزرگ حضرت منصور بن عمار گزرے ہیں، امام ابن الجوزی نے ان سے ایک اللہ والے کا قصہ ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات میں باہر نکلا، ابھی رات کا ایک حصہ باقی تھا، میں کسی کے ایک چھوٹے سے دروازے کے پاس بیٹھ گیا تو وہاں ایک نوجوان کی آواز آ رہی تھی جو رو رہا تھا، اور اللہ سے یوں کہتا جا رہا تھا کہ اے اللہ! تیری عزت وجلالت کی قسم، میں گناہ کر کے تیری مخالفت کرنا نہیں چاہا، اور جب میں نے تیری نافرمانی کی ہے، تو میں تیری سزا سے لاعلم نہیں تھا، اور نہ تیری نظر سے غائب تھا، لیکن میرے نفس نے مجھے چکما و دھوکہ دیا اور مجھ پر بدبختی غالب آ گئی، اور میرے گناہوں پر پڑے ہوئے تیرے پردے نے مجھے مغرور کر دیا، اور اب مجھے تیرے عذاب سے کون بچائے گا اور اگر تیری رسی سے میں کٹ جاؤ گا تو کس کی رسی کو تھاموں گا، ہائے میں کتنی دفعہ توبہ کروں اور کتنی دفعہ پھر گناہوں کی طرف جاؤں؟ اب وقت آ گیا کہ میں میرے رب سے شرماؤں۔ حضرت منصور بن عمار کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کر زور سے یہ آیت پڑھ دی:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ الخ﴾[التحریم:٦]

(اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن انسان و پتھر ہیں، جس پر سخت گیر وتندخو فرشتے مقرر ہیں)

کہتے ہیں کہ پھر میں نے ایک اضطراب و پریشانی کی آواز محسوس کی، اور اپنے کام سے چلا گیا، صبح کو جب واپس ہوا تو دیکھا کہ اسی گھر پر ایک جنازہ رکھا ہوا ہے اور ایک بوڑھی عورت وہاں آجا رہی ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے تو کہنے لگی کہ میرے غم کو تازہ مت کرو، میں نے کہا کہ میں مسافر ہوں اس لئے پوچھ رہا ہوں تو کہنے لگی کہ یہ میرا بیٹا ہے، رات کسی نے ایک آیت پڑھ دی تھی جس میں جہنم کا ذکر تھا، اس کو سن کر میرا بیٹا بے قرار ہو گیا اور روتا رہا، یہاں تک کہ مر گیا۔ حضرت منصور کہتے ہیں کہ یہی ان حضرات کی صفت ہوتی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔(التبصرہ: علامہ ابن الجوازی:۱۷)

تو دیکھئے یہ مثالیں میں نے دی کہ معرفت سے محبت بھی پیدا ہوتی ہے اور خوف بھی، دونوں جگہ جو مشترک مضمون ہے، وہ کیا ہے؟ ''پہچان''، پہچان ہوئی تو محبت آئی، پہچان ہوئی تو خوف آیا، پہچان نہیں تو محبت بھی نہیں، خوف بھی نہیں، اسی لیے عام طور پر اللہ کی محبت اور اللہ کا خوف نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اللہ کی پہچان نہیں، صحیح معنوں میں اللہ کی پہچان ہو تو ضرور انشاء اللہ یہ دونوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

معرفت کا ایک اثر عبدیت و بندگی ہے؟

جب اللہ کی معرفت بندے کو نصیب ہوتی ہے تو بندے پر معرفت کا ایک اثر یہ

ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عبدیت و عجز کا حامل ہوجاتا ہے، اور اسی سے پھر اللہ تعالی کی عبادت کثرت سے کرتا ہے، اس عبدیت وعبادت کے اثر سے پہچانا جائے گا کہ معرفت حاصل ہے یا نہیں، اس لئے کہ ہمارے اور آپ کے لئے نمونہ اور اسوہ آپ ﷺ کی ذات اقدس ہے، آپ اللہ تعالی کے سب سے بڑے عارف تھے، اور سب سے زیادہ عبدیت بھی آپ میں تھی اور عبادت بھی آپ سب سے زیادہ کرنے والے تھے۔ اتنی عبادت کرتے تھے کہ پاؤں میں ورم آجاتا تھا، صحابہ کو ترس آجاتا تھا، پوچھتے یا رسول اللہ! آپ تو بخشے بخشائے ہیں، اس قدر عبادت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ فرماتے: ''أفلا اکون عبدا شکورا'' (کیا میں اللہ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں) (بخاری: ۱/۱۵۲، مسلم: ۲/۳۷۷)

اسی طرح تمام صحابہ اور اولیاء اللہ نے بھی اللہ کو پہچانا، جس کا اثر ان پر یہ ہوا کہ وہ کثرت سے عبادت انجام دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ معرفت کا ایک اثر عبادت ہے۔ لہذا جو بغیر عبادت کئے معرفت کا دعوی کرے وہ جھوٹا ہے۔

عبادت کیا ہے؟

عبادت کیا ہے؟ عبادت کسے کہتے ہیں؟ اللہ کا جو بھی حکم بندے کو جہاں بھی آئے، جس وقت بھی آئے اسے انجام دینا عبادت ہے، عبادت دراصل انتہائی خضوع اور انتہائی ذلت کے اختیار کرنے کا نام ہے، اللہ کی بڑائی، اللہ کی جلالت، اللہ کی عظمت کے سامنے بندہ اپنے آپ کو ذلیل کردے تو اس کا نام عبادت ہے، پھر عبادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک قلبی عبادت اور ایک جسمانی عبادت، جسم سے بھی عبادت ہوتی ہے اور قلب سے بھی عبادت ہوتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے، ہم نماز پڑھتے ہیں، جسم حرکت میں آتا ہے کہ آدمی

ہاتھ اٹھاتا ہے، اللہ کے سامنے عاجزانہ باندھ لیتا ہے اور پھر اللہ کی ستائش کرنے لگتا ہے، پھر اس کے سامنے جھک جاتا ہے، جسے رکوع کہتے ہیں، پھر مزید اور جھکتے ہوئے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ یہ جو عبادت ہو رہی ہے جسم کی عبادت ہے اور پھر ایک عبادت اسی عبادت کے اندر ہے، وہ ہے خشوع اور خضوع اور اخلاص، اب یہ جو اندرونی عبادت ہوتی ہے وہ بھی دراصل اسی کا جز ہے، اور وہ قلبی عبادت ہے، اور دونوں ضروری ہیں۔

اگر ایک آدمی صرف اٹھ رہا ہو، رکوع وسجدہ میں جھک رہا ہو، لیکن قلب کے اندر وہ خشوع نہ ہو، خضوع نہ ہو، اللہ سے محبت نہ ہو، تعلق نہ ہو تو وہ عبادت نہیں، بلکہ صرف اٹھنا اور بیٹھنا ہے۔ جیسے بہت سارے لوگ نماز پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے پہلوانی کر رہے ہیں، کسرت کر رہے ہیں، اٹھ رہے ہیں، بیٹھ رہے ہیں، جھپٹ رہے ہیں اور تیز تیز رکوع وسجدہ ہو رہا ہے، اور آزو بازو کے لوگوں کو ذرا اپنی قوت دکھاتے ہوئے مار بھی رہے ہیں۔ یہ کوئی عبادت ہے؟ عبادت تو عاجزی کا نام ہے، عبادت وہ ہے جس کے اندر انتہائی ذلت اور مسکنت بھری ہوئی ہو۔

ڈینگ مارنے والے معرفت سے خالی

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ والے کبھی اپنی بڑائی نہیں کرتے، وہ ڈینگیں نہیں مارتے، بلکہ وہ تو عاجزی وانکساری والے ہوتے ہیں۔ کسی شاعر نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ:

تکمیل بشر نہیں ہے سلطاں ہونا
یا صف میں فرشتوں کے نمایاں ہونا
تکمیل بشر ہے عجز و بندگی کا احساس
انسان کی معراج ہے انساں ہونا

آج ایک طبقہ ولایت کا مدعی ایسا پیدا ہوگیا ہے کہ صرف ڈینگیں مارنا اس کا کام ہے، کبھی ولایت کا دعوی، کبھی کرامت کا دعوی، کبھی بزرگی کا دعوی، یہ سب باتیں اولیاءاللہ کی صفات سے دور ہیں۔ وہ عجز و بندگی کو ہی اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی انکساری کا حال

اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی عاجزی وانکساری کا کیا حال تھا؟ ایک بار آپ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص کو لایا گیا اور اس پر اس وقت آپ کے رعب کی وجہ سے کپکپی طاری ہوگئی، آپ نے اس کو دیکھا تو ایک عجیب انکساری وتواضع کا جملہ فرمایا، وہ یہ کہ: ”أنا ابن امرأة من قريش كانت تأكل القديد في هذه البطحاء“ (میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی) اور ایک روایت میں یوں ہے کہ اپنے اوپر آسانی کر، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، ایک عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔
(مستدرک: ۱۵۸/۴، ابن ماجہ: ۳۳۱۲)

اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے اس عاجزی وانکساری کا! اور یہ درحقیقت اللہ جل شانہ کی عظمت وجلالت کی معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز

اس عاجزی وانکساری پر آپ ﷺ کی ایک دعا کی طرف ذہن منتقل ہوگیا، جس میں آپ نے اللہ تعالی کے سامنے انتہائی وغایت درجہ کی تواضع وانکساری کا مظاہرہ کیا ہے، وہ دعاء یہ ہے:

”اَللّٰهُمَّ إِنَّکَ تَسۡمَعُ كَلاَمِي وَ تَرٰی مَكَانِي وَ تَعۡلَمُ سِرِّي وَ

عَلاَنِيَتِيْ وَلَا يَخْفٰى عَلَيْکَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِيْ وَ أَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ الْمُسْتَغِيْثُ الْمُسْتَجِيْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِيْ، أَسْئَلُکَ مَسْئَلَةَ الْمِسْكِيْنِ وَ أَبْتَهِلُ إِلَيْکَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ وَ أَدْعُوْکَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ مَنْ خَضَعَتْ لَکَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَکَ عَيْنَاهُ وَ ذَلَّ جَسَدُهٗ وَ رَغِمَ أَنْفُهٗ لَکَ، اَللّٰهُمَّ لاَ تَجْعَلْنِيْ بِدُعَائِکَ شَقِيًّا وَّ كُنْ بِيْ رَءُ وْفًا رَّحِيْمًا يَا خَيْرَ الْمَسْئُوْلِيْنَ وَ يَا خَيْرَ الْمُعْطِيْنَ " (اے اللہ! بلا شبہ تو میری بات سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے، اور میری پوشیدہ وظاہر ہر قسم کی بات کو جانتا ہے، اور تجھ پر میری کوئی بات مخفی نہیں، اور میں مصیبت زدہ ہوں، فقیر ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں، ترساں و ہراساں ہوں، اپنے گناہوں کا معترف و اقراری مجرم ہوں، میں تجھ سے مسکین کی طرح سوال کرتا ہوں، اور تیرے سامنے ذلیل گناہ گار کی طرح گڑگڑاتا ہوں، اور تجھ سے خوف زدہ آفت رسیدہ کی طرح مانگتا ہوں، جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو، اور جس کے آنسو بہہ رہے ہوں، اور جس کا جسم تیرے سامنے عاجز ہو، اور جو تیرے سامنے اپنی ناک رگڑتا ہو، اے اللہ! تو مجھے دعا میں ناکام نہ فرما، اور مجھ پر تو رحیم وکریم ہوجا، اے سوال کئے جانے والوں میں سب سے بہتر اور اے عطا کرنے والوں میں سب سے بہتر) (المعجم الکبیر طبرانی: ۱۱/۴ ۱۷، المعجم الصغیر: ۱۵/۲)

اس دعا کا ایک ایک لفظ جس فروتنی وعاجزی ومسکنت وتواضع وانکساری کا حامل ہے وہ بہت ہی واضح وظاہر ہے۔ الغرض یہ عجز وانکساری بھی معرفت خداوندی کا ایک اثر ہے۔

اللہ کی معرفت کا ایک اثر توکل علی اللہ ہے

جب بندے کو اللہ کی پہچان ہوتی ہے تو پہچان کے نتیجہ میں وہ اللہ پر اعتماد ضرور کرے گا ، اللہ پر بھروسہ ضرور کرے گا، جن لوگوں کو اللہ پر بھروسہ نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کو خدا کی پہچان نہیں ہے ۔کیسے؟ اس لیے کہ جب وہ اللہ کو پہچانے گا تو اللہ کی صفات کی حقیقت سامنے آئے گی کہ میرا اللہ وہ اللہ ہے جو میرے لیے ہر چیز میں بھلائی چاہتا ہے، میرے لیے کوئی مصیبت نہیں چاہتا، میرے لیے کوئی پریشانی نہیں چاہتا، میرے لیے اچھائی اور بھلائی ہی چاہتا ہے ، برائی نہیں چاہتا، جو کچھ بھی وہ کرتا ہے ہماری بھلائی کے لئے کرتا ہے۔تو جب وہ کھلے طور پر یہ دیکھتا ہے تو اس کا دل کہتا ہے کہ اس کے اوپر مجھے کلی اعتماد کرنا ہے کہ جو کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔

حضرت علی کا ایمان افروز واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک ایمان افروز ارشاد وواقعہ ملاحظہ کیجئے ، وہ یہ کہ مسافر بن عوف بن الاحمر نے ایک بار جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل نھروان سے جہاد کے لئے نکلنا چاہتے تھے، کہا کہ آپ اس وقت نہ جائیں اور دن کے تین گھنٹے گزرنے کے بعد جائیں ، حضرت علی نے پوچھا کہ کیوں؟ اس نے کہا کہ کیونکہ آپ اس گھڑی میں جائیں گے تو آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بلاء وشدید نقصان پہنچے گا ، اور اگر اس وقت میں جائیں جو میں نے بتایا ہے تو آپ کو کامیابی و غلبہ نصیب ہوگا۔حضرت علی نے فرمایا کہ حضرت محمد ﷺ کا کوئی نجومی نہیں تھا اور نہ اب تک ہمارا کوئی نجومی ہے، کیا تو جانتا ہے کہ اس تیرے گھوڑے کے پیٹ میں کیا

ہے؟اس نے کہا کہ ہاں اگر میں حساب لگاؤں تو جان لوں گا،آپ نے کہا کہ جس نے تیری اس بات کی تصدیق کی اس نے قرآن کی تکذیب کی، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو یہ کہتے ہیں کہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ﴾ (اللہ ہی پاس قیامت کا علم ہے وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ ماں کے رحم میں کیا ہے) حضرت محمد ﷺ نے کبھی اس چیز کے جاننے کا دعوی نہیں کیا جس کا تو نے دعوی کیا ہے، کیا تو گمان کرتا ہے تو اس گھڑی و وقت کو جانتا ہے جس میں سفر کرنے سے کوئی برائی لاحق ہوگی؟ اس نے کہا کہ ہاں! آپ نے فرمایا کہ جس نے تیری اس بات کی تصدیق کی وہ گویا برائی کے پہنچانے کے بارے میں اللہ سے مستغنی ہوگیا اور اس کو مناسب ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر تجھے ہی اپنے معاملہ کا متولی بنا دے، کیونکہ تو گمان کرتا ہے کہ تو اس کو اس گھڑی کی جانب ہدایت کرسکتا ہے جس میں سفر کرنے سے وہ برائی سے نجات پا جائے گا، پس جس نے اس بات کو سچ سمجھا مجھے اس پر اندیشہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے کی طرح ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ اے اللہ! کوئی فال نہیں ہے مگر تیرا فال اور کوئی خیر نہیں ہے مگر تیرا خیر، پھر اس شخص سے فرمایا کہ ہم تیری تکذیب و مخالفت کرتے ہیں اور اسی گھڑی میں سفر کرتے ہیں جس سے تو نے روکا ہے، پھر آپ نے لوگوں کو دیکھ کر فرمایا کہ اے لوگو! تم علم نجوم سے بچو، مگر وہ جس سے خشکی و سمندر کی اندھیریوں میں راستہ پاسکو، نجومی تو کافر ہے اور کافر جہنمی ہے۔ پھر اس شخص سے کہا کہ اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ بات پہنچی کہ تو علم نجوم میں غور وفکر کرتا اور اس پر عمل کرتا ہے تو میں تجھے تیرے یا میرے رہنے تک حبس دوام میں رکھ دوں گا اور جتنا میرے بس میں ہے

اس قدر تجھ کو بخشش سے محروم کردوں گا۔

اس کے بعد آپ اسی وقت میں سفر پر نکلے جس میں نکلنے سے اس نے منع کیا تھا، اوراہل نھر وان کے پاس آئے اوران کو قتل کیا، پھر فرمایا کہ اگر ہم اُس وقت میں چلتے جس میں چلنے کا اس شخص نے حکم دیا تھا اور فتح وغلبہ پاتے تو کوئی کہنے والا یہ کہتا کہ یہ اسی وقت میں چلے تھے جس میں چلنے کا نجومی نے حکم دیا تھا۔ حضرت محمد ﷺ کا کوئی نجومی نہیں تھا اور نہ اب تک ہمارا کوئی نجومی ہے، مگر اللہ نے ہمارے لئے کسریٰ اور قیصر کے شہروں اور دیگر مما لک کو فتح کرادیا، پس تم اللہ پر توکل کرو اوراسی پر اعتماد کرو، کہ وہی اپنے ماسوا سے ہمارے لئے کافی ہے۔ (مسند الحارث: ۲/۶۰۱، کنز العمال: ۵/۲۳۵)

یہ ہے توکل علی اللہ، جو انسان کو معرفت خداوندی کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، جس سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرا پروردگار میرا کارساز حقیقی ہے، مجھے کسی فکر کی ضرورت نہیں۔

ایک شعر اور حضرت تھانوی کی اس میں اصلاح

یہاں مجھے ایک شاعر کا شعر یاد آ گیا، وہ کہتا ہے کہ:

کارساز ما بفکر کار ما　　فکر ما در کار ما آزار ما

(ہمارا کارساز حقیقی ہمارے کاموں کی فکر میں لگا ہوا ہے، لہذا ہمارے کاموں میں ہمارا فکر کرنا خود کو تکلیف پہنچانا ہے)

اس شعر میں شاعر نے اللہ کے لئے فکر کا لفظ استعمال کیا ہے، حالانکہ اللہ کو کسی فکر کی ضرورت نہیں، اس لئے حضرت حکیم الامت تھانوی نے فرمایا کہ یہ شاعر جاہل

ہے عارف نہیں، اس لئے اسے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اللہ کے لئے کیا لفظ استعمال کرنا چاہئے، اور کیا نہ کرنا چاہئے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو کسی کے کام بنانے کے لئے فکر کی ضرورت پڑتی ہے؟ نہیں، لہذا حضرت تھانوی نے فرمایا کہ میں اس شعر میں ذرا ترمیم کرتا ہوں، وہ ترمیم یہ ہے کہ:

کارساز مابساز کار ما فکر ما درکار ما آزار ما

اب کیا مطلب ہوا؟ یہ مطلب ہوا کہ ہمارا کارساز حقیقی ہمارے کاموں کے بنانے میں لگا ہوا ہے، لہذا ہمارا خود کے کاموں کی فکر میں لگنا خود کو تکلیف دینا ہے۔

دیکھئے کہ حضرت تھانوی نے کس طرح ذرا سی تبدیلی سے اس شعر کو صحیح کر دیا اور اس کے مضمون کو اسلامی عقیدے سے ہم آہنگ کر دیا۔ الغرض معرفت کا یہ اثر ہے کہ اللہ پر اعتماد و توکل پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے، جو بھی کام کرے، سب عین حکمت و مصلحت ہے۔

اللہ ہر کام وقت پر کرتا ہے، ایک بزرگ کا واقعہ

ایک قصہ یاد آ گیا کہ ایک بزرگ جا رہے تھے، بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی، یہ بڑی پریشانی کے ساتھ چل رہے تھے، اچانک بارش ہونے لگی، ٹھنڈے ٹھنڈے بارش کے قطرات جب ان کے جسم پر پڑے تو ان کی زبان پر بے ساختہ و بے اختیار ایک جملہ آ گیا، انہوں نے کہا کہ واہ! آج کیا وقت پر بارش ہوئی! اس پر فوراً اللہ کی طرف سے الہام ہوا، اور عتاب نازل ہوا کہ او بے ادب! کیا ہم نے کبھی بے وقت بھی بارش برسائی ہے؟ جو بھی کرتے ہیں وقت پر ہی تو کرتے ہیں، تجھے پیدا کیا تو وقت پر کیا، تجھے ماریں گے تو وقت پر ماریں گے، تجھے بخار دی تو وقت پر دیا، تجھے

صحت دی تو وقت پر دیا۔کیا مطلب ہوا؟ کہ اللہ تعالیٰ پر جب اعتماد ہو کہ وہ سب کام حکمت ومصلحت کے مطابق کرتے ہیں تو اللہ پر توکل واعتماد کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔

معرفت کا ایک اثر رضا بالقضاء

اور اسی توکل واعتماد سے ایک اور اثر معرفت کا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عارف باللہ، اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر راضی رہتا ہے۔اس کو اسلام میں رضا بالقضاء کہتے ہیں۔یہ بھی ایک اہم اثر وعلامت ہے معرفت الہیہ کا، اس کے بغیر تو ایمان بھی مکمل نہیں ہوتا، لہذا ضروری ہے کہ اللہ کے ہر فیصلہ پر مومن راضی رہے اور راضی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ دل اللہ کے ہر فیصلہ پر مطمئن رہے کہ جو بھی اس نے کیا صحیح و درست کیا اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں بھی اللہ سے اس کا سوال کیا ہے۔آپ نے ایک دعا میں فرمایا کہ:" **أللّٰهُم إني أَسئلک الرَّضا بالقضاء** "(اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں رضا بالقضاء)(سنن النسائی: ۱۳۰۶، السنن الکبری نسائی:۳،۴۰۰، کنز العمال:۳۶۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اللہ پر اس کے فیصلوں میں اعتراض کرتے ہیں وہ درحقیقت معرفت الہیہ سے دور ہیں، اگر اللہ کی معرفت ان کو نصیب ہوتی اور وہ اللہ کی اس صفت سے واقف ہوتے کہ وہ حکیم ہے تو اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ بہترین مربی ہیں

جبکہ قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کاملہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔قرآن پاک کے شروع ہی میں ربوبیت کا ذکر ہے:﴿ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ**

رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾ (تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو تمام عالموں کا پروردگار ہے، رب ہے) رب کے کیا معنی آتے ہیں؟ تربیت کرنے والا، ماں تربیت کرتی ہے، باپ تربیت کرتا ہے، استاذ اور پیرو شیخ بھی تربیت کرتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تربیت بھی مجازی ہے اور ان کو مربی کہنا بھی مجازی اعتبار سے ہے ورنہ حقیقی مربی تو اللہ جل جلالہ وعم نوالہ ہیں، جو ساری کائنات کے ذرے ذرے کی تربیت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو کبھی مختلف قسم کی نعمتیں دے کر اور کبھی ان نعمتوں کو چھین کر اور کبھی بیماری دے کر اور کبھی اس کی جگہ شفا دے کر ان کی تربیت کرتا ہے، حوادثات، پریشانیاں، مصائب، اور مختلف قسم کے جھنجھوڑ کر رکھ دینے والے حالات و واقعات، یہ سب کچھ پیش آتے رہتے ہیں، یہ ساری کی ساری چیزیں دراصل اللہ کی ربوبیت وتربیت کے نتیجہ میں پیش آتی رہتی ہیں۔

بعض وقت بعض بیماریاں آجاتی ہیں تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ مریض کو کھانا بالکل نہ دیا جائے، تو کیا آپ یہ حکم لگا دیں گے کہ ڈاکٹر صاحب بڑے ظالم ہیں؟ ڈاکٹر کو ظالم کہتے ہیں یا رحیم کہتے ہیں؟ بلکہ سب رحیم ہی کہتے ہیں۔ بھائیو! کیوں؟ اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بات جو ڈاکٹر صاحب نے کہی یہ ان کے علم طب کا تقاضا ہے، اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کبھی ہمارا کھانا بند کر دیتا ہے، فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیتا ہے، کبھی کسی اور بیماری و پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے تو ہم اللہ کو کیوں رحیم نہ کہیں۔

ہم نہیں جانتے کہ ہمارے لئے کس میں بھلائی ہے، مگر اللہ جانتے ہیں کہ ہمارے لئے کیا مفید ہے، کیا غیر مفید ہے، اللہ ہی مصلحتوں کو جاننے والے ہیں، وہ حکیم ہیں، ان کا ہر کام کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے، کبھی وہ ہمیں دنیوی پریشانی دیکر

ہماری آخرت بنانا چاہتے ہیں۔جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا: ”ما يصيبُ المسلمُ من نصب ولا وصب ولا هم ولا حزن ولا أذى ولا غم حتى الشوكة يشاكها إلا كفر الله بها من خطاياه“(مسلمان کوکوئی کانٹا لگے بیماری ہو جائے، یا کوئی پریشانی پہنچے، یا کوئی غم، یا کوئی تکلیف واذیت حتی کہ کوئی کانٹا چبھےتو اللہ اس سے اس کی خطاؤں کا کفارہ کردیتے ہیں)

(صحیح بخاری:۵۳۱۸،صحیح ابن حبان:۲۹۰۵،الادب المفرد: حدیث:۴۹۲)

اورایک روایت میں یہ ہے کہ اس سے ایک نیکی بھی لکھی جاتی ہے۔(مسلم: ۶۷۳۲،مسند احمد:۱۶۶۰۹)

یعنی تمہیں ایک کانٹا چبھتا ہےتو تمہاراایک گناہ مٹایا جاتا ہےاورایک نیکی لکھی جاتی ہے،ٹھوکرلگتی ہے، ایک گناہ مٹایا جاتا ہے اورایک نیکی لکھی جاتی ہے۔غرض جوبھی تکلیف دہ بات پیش آئے، اس پرایک نیکی لکھی جاتی ہے،اورایک ایک گناہ مٹایا جاتا ہے۔

ایک دوسری حدیث پاک میں آتا ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ایک رات کا بخارایک سال کے گناہوں کودھودیتا ہے۔(مسند قضاعی:۶۱)

غورکریں کہ جسے ہم تکلیف سمجھتے ہیں،اس میں دراصل ہماری آخرت بن رہی ہے،کتنی بڑی نعمت ہے،اس لئے ہمیں چاہئے کہ اللہ کے ہرفیصلہ پرراضی رہیں،اسی کا نام رضا بالقضا ہے جو بہت بڑی دولت ہے،جس پرحدیث میں بڑی فضیلت بھی آئی ہے۔چنانچہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا:

ذَاقَ طعْمَ الايْمان مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِياً وَرَسُوْلاً ”(وہ آدمی ایمان کا مزا چکھ لیا جواللہ سے رب ہونے کی حیثیت سے

راضی ہوگیا، اور اسلام سے دین ہونے کی حیثیت سے راضی ہوگیا اور محمد ﷺ سے نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے راضی ہوگیا) (مسلم: ۱/۴۷)

معلوم ہوا کہ معرفت کا ایک اثر رضا بالقضاء بھی ہے۔ یہ سارے آثار جس بندے پر ظاہر ہوں سمجھا جائے گا کہ اس کو اللہ کی معرفت حاصل ہے۔

اب دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی ہم تمام لوگوں کو اپنی معرفت کا ایک حصہ عطا فرمائیں اور اس کے ذریعہ محبت الٰہی اور خوف الٰہی وغیرہ آثار معرفت کی دولت سے بھی مالا مال فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

شیطانی حرب

باسمہ تعالیٰ

شیطانی حربے

أعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ، ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾(آل عمران:۱۴)

(خوشنما بنادی گئی ہے لوگوں کے لئے خواہشوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے،اور بڑے بھاری مال سونے کے اور چاندی کے،اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتیاں، یہ دنیا والی زندگی کا فائدہ اٹھانا ہے،اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانہ)

حضرات!ایک آیت آپ کے سامنے تلاوت کی گئی ہے،جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حب الشہوات''یعنی دنیا کی جولذتیں اور خواہشیں اور انسان کے دل کو اپیل کرنے والی چیزیں ہیں، یہ انسان کے لیے مزین کردی گئی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے''حب الشہوات'' کی تفسیر بیان کی کہ حب الشہوات سے مراد یہ دنیا کی مختلف چیزیں یعنی بیویاں ہیں، بچے ہیں، مال ہے، دولت ہے،سونا ہے، چاندی ہے، پیسہ ہے، یہ ساری چیزیں دنیا کی چیزیں ہیں۔اللہ نے ان کا لقب رکھا ہے:''الشہوات''،

اور فرمایا کہ ان خواہشات کی محبت انسان کے لیے مزین کردی گئی ہے۔

لفظ ''زُيِّنَ'' استعمال کیوں فرمایا؟

یہاں ''زُيِّنَ'' کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ حقیقت میں دنیا کی یہ چیزیں ایسی نہیں ہے، جیسی نظر آتی ہیں، اگر حقیقت میں بھی ایسی ہوتیں تو پھر لفظ مزین لانے کی کوئی ضرورت ہی نہ ہوتی، کیونکہ جو چیز ہو کالی، اسے آپ کچھ رنگ روغن مسالہ لگا کر بنا دیں گوری، تب کہا جائے گا کہ مزین کردیا گیا ہے، آج کل لوگ ملمع سازی کرتے ہیں، کوٹنگ کرتے ہیں، بہت ساری چیزوں کی کوٹنگ ہوتی ہے، لوہے کی کوٹنگ کی اور سونے کا پانی اس پر چڑھا دیا، دیکھنے میں ایسا لگ رہا ہے، جیسا کہ سونا ہوتا ہے، آج کل عورتوں کے زیورات بھی ایسے آنے لگے ہیں۔ آپ دیکھیں تو ایسے معلوم ہوں جیسے کہ یہ واقعی سونا ہیں، لیکن حقیقت میں یہ سونا نہیں ہے، بلکہ سوجانا ہے، کوئی طاقت نہیں ہے اس کے اندر، لیکن دیکھنے میں بالکل ایسا ہی لگے گا جیسے کہ سونا ہو، اسی طرح مختلف چیزوں پر رنگ و روغن مسالہ لگا کر اس کو مزین کردیا جاتا ہے، ملمع سازی کرنے کے بعد دیکھنے میں چیزیں اچھی لگتی ہیں، حالانکہ حقیقت میں یہ چیزیں کچھ اور ہوتی ہیں۔

اسی طرح دنیا کی جو چیزیں آپ کو نظر آتی ہیں، چاہے وہ عورتیں ہوں، چاہے تمہاری اولاد ہو، چاہے مال ہو، دولت ہو، سونا ہو، چاندی ہو، یہ سب کی سب چیزیں جو تم کو بہت بھلی اور اچھی لگتی ہیں، پیاری لگتی ہیں، یہ دراصل سب کوٹنگ کی ہوئی چیزیں ہیں، مزین کردی گئی ہیں، ان کی اصلیت وہ نہیں ہے جو نظر آرہی ہے۔ اس جانب توجہ دلانے اور اشارہ کرنے کے لئے یہاں لفظ ''مزین'' لایا گیا۔

اگر ان چیزوں کی حقیقت انسان کے سامنے کھل جائے تو خدا کی قسم وہ اِن

چیزوں کو دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے۔ وہ کہے گا کہ یہ چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں؟ دیکھنے کے بھی قابل نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود انسان چوں کہ مزین کردہ چیزوں سے متاثر ہو جاتا ہے، اس لیے ان چیزوں کے اوپر فریفتہ ہوتا رہتا ہے۔ سونا دیکھا منہ میں پانی آ گیا، چاندی دیکھا رال ٹپکنے لگی، روپیہ اور پیسہ سامنے آیا، دل اس کے اوپر ریجھنے لگا، اور مختلف قسم کی چیزیں دیکھیں، دل ان کے اوپر آ گیا۔ لیکن حقیقت میں یہ چیزیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے دل لگایا جائے اور ان پر فریفتہ ہوا جائے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ دنیا کی چیزیں انسان کے لیے مزین کر دی گئی ہیں۔ آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرما دیا ہے: ﴿ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ (یہ تو دنیا کی چیزیں ہیں، دنیا کا ساز و سامان ہے) اور اصل چیز وہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس میں رکھی ہوئی ہے جو حقیقت کے اعتبار سے بھی اچھی ہے اور بھلی ہے یہاں تو جو کچھ بھی نظر آتا ہے، یہ صرف دیکھنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے سامنے بھی دنیا کو مزین کر کے پیش کیا گیا تھا

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب معراج تشریف لے گئے تو اس موقعہ پر ایک واقعہ پیش آیا کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے ایک عورت آئی اور مزین تھی، اپنے آپ کو اس نے آراستہ پیراستہ کیا تھا، زیورات کے ساتھ اور مختلف زیب و زینت کی چیزوں کے ساتھ، نبی اکرم ﷺ کی طرف بڑھتی ہوئی آئی، اللہ کے نبی علیہ السلام نے چہرہ پھیر لیا، پھر دوبارہ بھی آئی، اللہ کے نبی علیہ السلام نے پھر چہرہ پھیر لیا، تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔ جبرئیل امین علیہ السلام نے آگے بڑھنے کے بعد نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا، یا رسول اللہ! آپ نے پہچانا کہ یہ عورت کون تھی؟ آپ

نے فرمایا کہ نہیں میں نے نہیں پہچانا، کون تھی یہ عورت؟ جبرئیل امین علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ عورت نہیں بلکہ دراصل دنیا تھی، اور یہ بوڑھی ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو آراستہ پیراستہ، مزین کر کے آپ کو بہکانے کے لیے آئی تھی۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس کی طرف نظر بھی نہیں فرمائی، اگر آپ خدانخواستہ اس عورت کو دیکھ لیتے تو آپ کی پوری امت ہلاک ہو جاتی۔ (تفسیر ابن کثیر: ۵/۳)

اس ناپاک دنیا کو اللہ کے نبی علیہ السلام نے دیکھا نہیں اور امت کا یہ حال ہے کہ وہ اس میں ملوث ہے۔ اور اگر اللہ کے نبی دیکھ لیتے تو پھر کیا ہوتا؟ اس سے اندازہ کیجئے کہ آج ہم لوگوں کے اندر کتنا قصور اور فتور پیدا ہو گیا ہے اور ایمانی اعتبار سے کس قدر کمزوری آ گئی ہے کہ ہمارے نبی علیہ السلام نے جس کو دیکھا تک نہیں، آج ہم اسی کے اندر پوری طرح ملوث ہو گئے ہیں، اسی مال کے لیے، پیسے کے لیے، اسی دنیا کے لیے، زیب و زینت کی چیزوں کے لیے، انسان اپنا سب کچھ خرچ کر دیتا ہے، اپنی جوانی لگا دیتا ہے، اپنی ساری طاقت گنوا دیتا ہے، اپنی آنکھوں کی طاقت، کانوں کی طاقت، دل کی طاقت، دماغ کی طاقت، سب اسی کے پیچھے لگایا ہوا ہے، بس ہر وقت اسی فکر میں ہے کہ کس طرح کماؤں، کس طرح جمع کروں، کس طرح کھاؤں، کس طرح گنواؤں؟ پھر اسی اُدھیڑ بن میں پوری زندگی گزر جاتی ہے، جب کہ یہ دنیا اس قابل تھی کہ اللہ کے نبی علیہ السلام نے جس طرح اس کے ساتھ برتاؤ کیا ہمیں بھی اسی طرح برتاؤ کرنا چاہئے تھا کہ ہم اس کی طرف نہ دیکھتے، منہ پھیر لیتے، لیکن اس کے تزین و ملمع کاری نے ہم لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے، اس لیے انسان دنیا کی چیزوں کی طرف لپکتا چلا جاتا ہے۔

''زُيِّنَ'' صیغۂ مجہول لانے کی عجیب حکمت

یہاں ایک اور بات سنتے چلئے، وہ یہ کہ اس آیت کریمہ میں ''زُيِّنَ'' کا جو لفظ آیا ہے، عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ مجہول کا صیغہ ہے، مجہول میں اصل فعل مجہول نہیں ہوتا، بلکہ فاعل مجہول یعنی نا معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر تو کہتے ہیں فعل مجہول، حقیقت میں وہ فاعل مجہول ہے۔ فعل تو نظر آرہا ہے، معلوم ہو رہا ہے، وہ مجہول کہاں ہے؟ وہ فعل تو یہاں بھی معلوم ہو گیا کہ وہ ''تزین وملمع کاری'' ہے، تزئین ہے، زیب وزینت ہے۔ یہ تو خود ہی پتہ چل رہا ہے، جس چیز کا پتہ ہو وہ مجہول کہاں ہے وہ تو معروف ہے، ہاں یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ مزین کرنے والا کون ہے، اس کو مجہول رکھا گیا ہے۔ کیوں؟

اس کو سمجھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لیں کہ قرآن کریم میں ''تزئین کاری'' کا ذکر اور جگہ بھی آیا ہے، اور بعض جگہ اس کا فاعل بھی بتایا گیا ہے، نیکی کے سلسلہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کو فاعل بتایا ہے، جیسے فرمایا کہ: ﴿ **وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ** ﴾ (اور لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک محبوب بنایا اور اس کو تمہارے قلوب میں مزین کردیا) اور برائی کے موقعہ پر شیطان کو اس کا فاعل کہا ہے، جیسے فرمایا کہ: ''**وإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ** ''(اور یاد کرو جبکہ شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کے لئے مزین کیا)

مگر یہاں اس آیت میں اللہ تعالیٰ تزئین کاری کے فاعل کو مجہول کے صیغہ میں چھپا دیا، کیوں؟ اس کی وجہ بندے کے نزدیک یہ معلوم ہوتی ہے کہ دنیا اور دنیا کی چیزیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، یہ مطلقاً نہ بری ہیں نہ مطلقاً اچھی، بلکہ اگر ان کو خدا کے حکم ورسول کی تعلیم کے مطابق استعمال کیا جائے تو اچھی ہیں اور یہی چیزیں

آخرت کا وسیلہ بن جاتی ہیں، اور اگر ان چیزوں کا خدا کے حکم اور رسول کی تعلیم کے مطابق استعمال کیا جائے تو یہ بری اور وبال جان بن جاتی ہیں۔ لہذا ان چیزوں میں ایک پہلو بھلائی کا ہے، لہذا اس پہلو سے ان چیزوں کا مزین ہونا اللہ کی جانب منسوب ہوگا اور ایک پہلو ان میں برائی کا ہے، اور اس لحاظ سے ان کا مزین ہونا شیطان کی جانب منسوب ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالی نے اس کام کے فاعل کو مجہول کر دیا، تاکہ دونوں پہلو کی جانب اشارہ ہو سکے۔

اس تقریر سے ایک بہت بڑی حقیقت سامنے آ گئی، وہ یہ کہ دنیا فی نفسہ نہ اچھی ہے نہ بری، بلکہ اگر اللہ کے حکم کے مطابق استعمال ہو تو اچھی ہے ورنہ بری ہے۔ ہاں عام طور پر چونکہ اس کا استعمال لوگ غلط طور پر کرتے ہیں، اور اس کے ذریعہ شیطان بہکاتا ہے اس لئے اس کو برا کہا جاتا ہے۔

عورت شیطان کا ایک حربہ

بہر حال اب اس پر غور کیجئے کہ اللہ تعالی نے یہاں آیت کریمہ میں ''شہوات'' کی تفسیر میں جو چیزیں بیان کی ہیں ان میں سے ایک ''عورتیں'' ہیں، جن کو شیطان ملمع کاری کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ شیطان گمراہ کرنے کے لیے عورت کو اپنا ایجنٹ بناتا ہے۔ ایک بزرگ حسن بن صالح فرماتے ہیں کہ میں نے شیطان کو سنا کہ وہ عورت سے کہہ رہا تھا کہ:

'' أنتِ نصف جندي، أنتِ سهمي الذي أرمي به فلا أخطأ و أنتِ موضع سري ، و أنتِ رسولي في حاجتي'' (تو میری آدھی فوج ہے، اور تو میرا وہ تیر ہے جس سے میں شکار کرتا ہوں ، میں خطا نہیں کرتا اور تو میری راز دار اور حاجت کے وقت میری قاصد ہے) (مکائد الشیطان، ابن ابی الدنیا: ۵۹)

اورحدیث میں بھی یہ مضمون موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: النساء حبائل الشیطان"(عورتیں شیطان کا شکار کا آلہ ہیں)(جامع الاصول: حدیث:۸۴۸۰)

عورت کے ذریعہ شیطان انسان کو پھانسنے کی، گمراہی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہےاور بہت حدتک کامیاب ہوجاتا ہے، بڑے بڑےلوگ پھنس جاتے ہیں، کبھی ایمان کھودیتے ہیں، صرف لذت کی وجہ سے، خواہش کی وجہ سے، اور یہ چیز انسان کوکبھی اندھابنادیتی ہے، کبھی بہرہ بنادیتی ہے، کبھی گونگا بنادیتی ہے۔ جیسے حدیث میں ہے کہ: "حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ "(کسی چیز کی محبت انسان کو اندھاوبہرابنادیتی ہے)(شعب الایمان:۳٦۸/۱)

اس لئے انسان بےسوچے سمجھے، اندھا بہرا ہوکرعورت پرفریفتہ ہوجاتا ہے، اس کوخودبھی اس کاعیب نظرنہیں آتااوردوسرےاس کوسمجھائیں بتائیں تووہ بہرا بن جاتاہے۔

دنیا کی عورتوں اور جنت کی حوروں کا فرق

دنیا کی عورتوں کوشیطان ملمع کاری کے ذریعہ حسین دکھاتا ہے، جبکہ انسان کوغور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ دنیا کی عورت میں کس قدرکھوٹ وعیب ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے دنیا کی عورتوں کے مقابلہ میں جنت کی حوروں کا تذکرہ کرکےان کےفرق کو بتایا ہے۔تاکہ شیطان کی ملمع سازی اورتزیین کاری کو پہچانا جائے۔

اس سلسلہ میں غوروفکر کے لئے قرآن کریم میں بعض جگہ اشارات دیئے گئے ہیں۔چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے بعض جگہ جنت کے ذکر میں فرمایا:

﴿لَهُمۡ فِيۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ﴾[البقرۃ:۲۵،النساء:۵۷]

یعنی جنت میں جنتیوں کو جو بیویاں حوریں ملیں گی وہ مطہر یعنی پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ پاکیزہ بیویاں، جن کے اندر نجاست نہیں، گندگی کا نام ونشان نہیں، بالکل پاک وصاف۔

یہ طہارت دو قسم کی ہے۔ایک ظاہری طہارت اور ایک باطنی طہارت۔ظاہری طہارت کیا؟ پاخانہ نہیں ہوگا، پیشاب ان سے نہیں نکلے گا، پسینہ نہیں نکلے گا، اسی طرح اور جو مختلف قسم کے فضلات انسان کے جسم سے نکلتے ہیں جو کبھی نفرت کا باعث بنتے ہیں، ان ساری چیزوں سے جنت کی حوریں پاک ہوں گی اور باطنی اعتبار سے مطہرہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دل کے اعتبار سے بھی بہت پاکیزہ ہوں گی، اخلاق کے اعتبار سے بھی بہت پاکیزہ ہوں گی، ان کے اندر کوئی عیب نہ ہوگا۔ یہ اس کا مطلب ہے۔

سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اتنا بھی فرما دیے ہوتے: ﴿فِيۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ ﴾(جنت میں بیویاں ملیں گی) تو بات کافی ہوجاتی لیکن ''مطہرۃ'' کہہ کر بتانا یہ چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے غور کرو کہ دنیا کی عورتوں کا کیا حال ہے؟ آدمی عورت کو بہت پسند کرتا ہے، حالانکہ اسے پاخانہ بھی لگتا ہے؟ اس سے پیشاب بھی نکلتا ہے، ماہواری خون بھی جاری ہوتا ہے، اور گندگیاں بھی ہوتی ہیں، اور غسل نہ کرے تو بدن کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے، منھ اگر نہ دھوئے تو منھ کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے، گویا ساری گندگیوں کا مرکز اور معدن بن جاتی ہے۔ یہ ہے دنیا کی عورت کا حال جس پر تم فریفتہ ہوتے ہو۔

اور رہی اخلاق اور کردار کے اعتبار سے تو وہ معلوم ہی ہے، اسے تو کہنے کی

ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہاں کی عورتوں کا کیا حال ہوتا ہے، بد اخلاقی ، بد زبانی ، ناشکری، ان کے اندر عیوب ہی عیوب ہوتے ہیں۔

تو دیکھئے بظاہر عورت دیکھنے میں اچھی لگتی ہے، انسان اس کی طرف مائل ہو جاتا ہے ،لیکن یہ ملمع سازی ہے ،تزئین کاری ہے ،لیکن حقیقت کے اعتبار سے عورت ساری گندگیوں کا مرکز اور معدن ہے۔

شیطان کا دوسرا حربہ اولاد

اس آیت میں دوسری چیز جو'' شہوات'' کی تفسیر میں آئی ہے وہ ہے: ''البنین'' یعنی اولاد، جس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اولاد کو مزین کر کے ماں باپ کو دکھاتا ہے اور وہ ان کی محبت میں اس طرح گرفتار ہو جاتے ہیں کہ اندے بہرے بن جاتے ہیں۔اور کبھی حلال وحرام کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں اور کبھی احکام شریعت سے لاپرواہی برتتے ہیں ۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد کی وجہ سے آدمی جہنم میں جا گرتا ہے۔اسی لئے قرآن نے اولاد کو بھی مال کی طرح ایک فتنہ قرار دیا ہے ۔فرمایا کہ: " **وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ** "[الانفال: ۲۸](جان لو کہ تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں)اور علامہ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ فتنہ کے اصل معنی تو امتحان وآزمائش کے ہیں ،لیکن عرف میں امتحان کے برے نتیجہ کو فتنہ کہتے ہیں۔(الاکمال المعلم :۲۹۸/۱)

لہذا اولاد کے سلسلہ میں انسان اللہ کی آزمائش میں عموما برا نتیجہ لاتا ہے یعنی ناکام ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:" **اَلْوَلَدُ مَجْبَنَةٌ مَبْخَلَةٌ مَجْهَلَةٌ**''(اولاد انسان کو بزدل، بخیل اور جاہل بناتی ہے)(اتحاف الخیرۃ:۶۷۶۳، مصنف عبد الرزاق:۲۰۱۴۳)

اور ایک روایت میں ” مَحْزَنَةٌ “(غم میں ڈالنے والی) کا اضافہ ہے۔اس حدیث کی شرح میں علامہ مناوی نے لکھا ہے کہ :بخیل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی وجہ سے ماں باپ نیکی وقرب کے کاموں میں خرچ کرنے سے سے کنجوسی کرتے ہیں اور بزدل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی محبت میں باپ جہاد میں جانے اور اللہ کے لئے ہجرت کرنے سے باز رہتا ہے ،اور جاہل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی محبت اور اس کے لئے نان نفقہ کی فکر اس کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے سفر سے روکتی ہے،اور وہ جاہل ہی رہ جاتا ہے ،اور غم میں ڈالنے والی ہے کیونکہ اولاد کبھی بیمار ہو یا کوئی اور چیز کا مطالبہ کرے جس کو والدین پورا نہ کرسکیں تو وہ اس کی وجہ سے غمگین ہوتے ہیں۔(التیسیر : ۶۱۵/۱،فیض القدیر:۲۶۲/۶)

بہ ہر حال یہ اولاد کا فتنہ بھی بڑا سخت و شدید فتنہ ہوتا ہے،مگر کب؟ اس وقت جب انسان اولاد کی محبت میں اندھا بہرا ہو جاتا ہے ۔ اس صورت میں یہ اولاد شیطان کا ایک حربہ ہے،جس سے وہ لوگوں کو مات دیتا ہے۔

دنیا کا ساز و سامان تیسرا شیطانی حربہ

اس آیت کریمہ میں تیسری چیز ” شہوات “ کی تفسیر میں دنیا کے مال و متاع اور مختلف قسم کے ساز و سامان کو بیان کیا گیا ہے۔فرمایا کہ:

” وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ “ (آل عمران)

یہ ساز و سامان ،سونا چاندی ،گھوڑے ، چوپائے اور کھیتیاں بھی انسان کو مزین کر کے دکھایے جاتے ہیں ،جس سے وہ دھوکہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ یہ چیزیں بڑی لائق و فائق ہیں ، بڑی بہترین وعمدہ ہیں حالانکہ ان کی برائی وقباحت اس

قدر ہے کہ وہ اپنانے کے قابل نہیں۔ مگر شیطان ان کو اس طرح مزین کر دیتا ہے کہ انسان خوامخواہ ہی ان کی جانب میلان کرتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ مال ومتاع در حقیقت ایسا ہے جیسے پیشاب کے ڈھیلے، کہ ضرورت پر ان کا استعمال لازم ہے مگر ان سے محبت کرنا، ان کو گلے سے لگانا، اور ہر وقت ان ہی کی فکر میں لگا رہنا بڑی کم عقلی و بے وقوفی کی بات ہے۔

متاع کی تفسیر اور صاحب بن عباد کا واقعہ

اسی لئے یہاں قرآن نے دنیا کے ساز وسامان کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ: ''**ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا**'' (یہ سب دینوی زندگی کا سامان ہے) یہاں سامان کے لئے ''متاع'' کا لفظ آیا ہے، اور متاع حقیر قسم کی چیز وسامان کو کہتے ہیں۔ صاحب بن عباد ایک بہت بڑے عالم وادیب گزرے ہیں اپنے وقت میں مؤید الدولہ بن رکن الدولہ کے وزیر بھی تھے، بڑے لغوی اور عربی زبان کے ادیب تھے، ان کا واقعہ ہے کہ ایک بار ان کو اس لفظ کی تحقیق کی ضرورت پڑ گئی۔ انھوں نے سوچا کہ عربی زبان کی اصل کو معلوم کرنے دیہاتوں میں جانا چاہئے، کیونکہ وہاں زبان اپنی اصلیت پر باقی رہتی ہے، برخلاف شہروں کے کہ وہاں مختلف علاقوں کے لوگوں سے میل جول کی وجہ سے عربی زبان اپنی اصلیت پر باقی نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں مختلف گاؤں دیہاتوں میں اس لفظ کے معنے جاننے کے لئے گھومتا رہا، ایک جگہ دیکھا کہ ایک دیہاتی عربی لڑکا بیٹھا ہے، میں اس کے پاس چلا گیا، اور اس کے بازو بیٹھ گیا، اور اس کے قریب ایک کپڑا پڑا ہوا تھا جو زمین وغیرہ پوچھنے اور صاف کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اتنے میں ایک کتا آیا اور وہ پوچھنے کا کپڑا

اٹھا کر لے گیا۔ کچھ دیر بعد اس لڑکے کی ماں آئی تو اس لڑکے نے ماں سے کہا کہ:
"جاء الرقيم و أخذ المتاع و تبارك الجبل" (کہ کتا آیا اور متاع اٹھایا اور پہاڑ پر چڑھ گیا) علامہ صاحب بن عباد کہتے ہیں کہ اس سے مجھے سمجھ میں آیا کہ متاع کی کیا حقیقت ہے؟ اس لڑکے نے پوچھنے کے کپڑے کے لئے جو ایک معمولی وحقیر چیز ہوتی ہے اور سجانے کے نہیں بلکہ چھپانے کے قابل ہوتی ہے اس کو متاع کہا۔ لہذا متاع کے معنے یہ ہوئے کہ جو چیز ضرورت کی ہو، مگر حقیر ہو، معمولی درجہ کی ہو، جیسے پوچھنے کا کپڑا، اس کو عربی میں متاع کہتے ہیں۔

اللہ اکبر! قرآن کریم میں دنیا کے ساز وسامان کے لئے یہ لفظ لا کر یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کا یہ مال و دولت اگر چہ کہ ایک ضرورت کے لئے ہے مگر وہ دل لگانے اور شوکیس میں سجانے اور لوگوں کو دکھانے کے قابل نہیں ہے۔ کیا کوئی پوچھنے کے کپڑے کو شوکیس میں سجاتا ہے؟ کیا کوئی اس کو دل سے لگاتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے؟ نہیں، اسی طرح دنیا کو بھی سمجھنا چاہئے۔

الغرض یہ دنیا بھی مزین کر کے شیطان لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے اور اس کو اپنے ایک حربے کی طرح استعمال کرتا ہے۔

دنیا کے ذریعہ شیطان کس طرح بہکاتا ہے؟

اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک دفعہ ایک آدمی نے دیکھا کہ ایک جگہ درخت ہے اور لوگ اس درخت کی پوجا کر رہے ہیں، تو اس آدمی کے دل کے اندر ایک عزم ایک حوصلہ پیدا ہوا کہ اس درخت کو اکھاڑ دینا چاہئے، اس لیے کہ یہ درخت لوگوں کو، اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف آنے سے مانع بن رہا ہے اور اس کے بجائے شرک و گمراہی اور کفر میں پھنسنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔

چنانچہ وہ شخص کچھ ہتھیار لے کر گیا اور درخت کو اکھاڑنا شروع کیا، شیطان آیا اور کہنے لگا کہ کیا کر رہے ہو؟ تو اس نے کہا کہ میں اس درخت کو اکھاڑنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ اس درخت کی وجہ سے بہت سے اللہ کے بندے کفر میں پھنس رہے ہیں، اور شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ شیطان نے کہا کہ نہیں نہیں، تم ایسا مت کرو، اس کو یہاں کے لوگوں نے اب تک پالا اور بڑھایا ہے، اور اس کے پیچھے ہم نے محنت کی ہے۔ مگر اس شخص نے کہا کہ نہیں نہیں، میں تو اللہ کے لیے آیا ہوں اور یہ کام میں کر کے رہوں گا۔ اس نے اپنا پورا عزم بتایا، پورا حوصلہ بتایا،۔ جب شیطان نے اس کا یہ عزم دیکھا تو اس کی ہمت اور طاقت کے مقابلہ میں شیطان مجبور ہو گیا، اس لیے کہ اخلاص کے ساتھ جب عمل ہوتا ہے تو اس کے اندر بڑی قوت ہوتی ہے اور شیطان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو شیطان عاجز آ گیا۔ پھر سوچنے لگا کہ کس طرح اس کو اس نیکی سے روکوں؟ اس کی سمجھ میں ایک بات آ گئی، شیطان نے اس سے عاجزی سے کہا کہ میری ایک درخواست ہے اس کو سن لیں۔

اس نے کہا کیا درخواست ہے؟ شیطان نے کہا کہ درخواست یہ ہے کہ تم اس کام کو چھوڑ دو تو میں روزانہ تمہیں دو درہم دے دیا کروں گا، دو درہم روزانہ بغیر کسی محنت مزدوری گھر بیٹھے مل جائیں گے۔

یہ سنا تو دل میں دنیا کی لالچ آ گئی، اس نے کہا کہ اچھا دو درہم مجھے روزانہ ملیں گے، کون اسکا ذمہ دار ہوگا؟ شیطان نے کہا میں ذمہ دار ہوں، میں تجھے پیش کروں گا اور پیش بھی اس طرح کروں گا کہ روزانہ فجر کی نماز پڑھ کر مصلے سے اٹھیں گے تو تمہارے مصلے کے نیچے مل جائیں گے۔

اس نے کہا ٹھیک ہے دیکھتے ہیں، اب جو عزم لے کر آیا تھا، مال پیسے کی وجہ

سے وہ ختم ہوگیا، اور واپس اپنے گھر چلا گیا، رات سو کر صبح اٹھا، فجر کی نماز پڑھی اور اس کے دل و دماغ میں وہی دو درہم تھے، مصلے کے پاس گیا اور دیکھا تو واقعی مصلے کے پاس دو درہم اس کو مل گئے، اٹھایا اور جیب میں ڈال لیا، اور اس کے بعد دن بھر اپنے کام میں مصروف رہا، پھر دوسرا دن ہوا، اسی طرح فجر کے بعد مصلے کے پاس دو درہم مل گئے۔

اب روزانہ یہی تماشا ہوتا ہے کہ فجر پڑھ کے وہاں جاتا ہے دو درہم مل جاتے ہیں، مہینہ دو مہینہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اس کے بعد شیطان نے درہم دینا بند کر دیا۔ اب جب دو درہم نہیں ملے تو یہ شخص پھر اپنے ہتھیار وغیرہ لے کر وہاں پہنچا کہ درخت کو اکھاڑ دوں گا، شیطان بھی وہاں موجود تھا، جب اس نے وہ درخت اکھاڑنا چاہا تو شیطان نے کہا: کیا کر رہے ہو؟ کہا: درخت اکھاڑوں گا، اس لئے کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ دو دو درہم دیا کروں گا، کئی دنوں سے تم نے دیا نہیں، اب میں پھر وہی کام کروں گا جو پہلے کرنے آیا تھا۔ شیطان نے کہا کہ کر لے جو کرنا ہے، لیکن تجھے اس پر کوئی قدرت نہ ہوگی۔ اس نے کہا کہ کیوں؟ کہا کہ تو پہلے آیا تھا اللہ کے لیے، اب آیا ہے پیسے کے لیے، وہاں اخلاص موجود تھا اور یہاں اخلاص موجود نہیں ہے، اب تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد وہ آدمی اپنا منہ لیکر رہ گیا۔

بھائیو! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کس طرح اپنے پھندے میں پھانسنے کے لیے لوگوں کو مال سے، پیسے سے، اپنی طرف مائل کرتا ہے۔

ایک بڑا شیطانی حربہ جہالت ہے

شیطان کا ایک مکر اور سب سے بڑا حربہ جہالت کی راہ سے ہوتا ہے۔ جب شیطان آدمی کو دیکھتا ہے کہ جاہل ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے پاس صحیح علم نہیں، اور

اسے معلوم نہیں کہ حقیقت کیا ہے؟ اللہ کے بارے میں صحیح نہیں جانتا، رسول کے بارے میں صحیح نہیں جانتا، آخرت کے بارے میں نہیں جانتا، فرشتوں کا علم نہیں ہے، اسی طرح دینی معلومات کے اندر اس کے پاس کمی موجود ہے تو شیطان اس جہالت سے بہت فائدہ اٹھاتا ہے، اور عام طور پر جاہلوں کو ان کی جہالت کی وجہ سے بڑی بڑی قبیح ترین اور انتہائی ناروا باتوں کے اندر پھانس دیتا ہے۔

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ مکر کے لیے اور فریب کے لیے سب سے بڑا راستہ جہالت ہوتا ہے، اور اگر آدمی کے اندر جہالت کے بجائے علم ہو تو علم کے ذریعے سے وہ شیطان کے مکر کو، کید کو سمجھنے لگتا ہے، اور شیطانی حربہ سے بچ جاتا ہے، اور کامیاب ہو جاتا ہے۔

اسی مضمون کی طرف ایک حدیث کے اندر اشارہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**فقيه واحد أشدعلى الشيطان من ألف عابد**'' (ایک فقیہ و عالم شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے بھاری ہے) (ابن ماجہ: ۲۰، ترمذی: ۲/۹۷)

ایک طرف ایک ہزار عابد ہوں، شیطان کہتا ہے کہ ان سب کو میں ایک داؤ میں نیچا دھکا دوں گا، اس لیے کہ یہ لوگ عبادت تو کر رہے ہیں، لیکن ان کے پاس علم نہیں ہے، ہاں عبادت ہے، ریاضت ہے، مجاہدہ ہے، سب کچھ ہے لیکن علم شریعت نہ ہونے کی وجہ سے ایک داؤ میں ان کو گرا دوں گا۔

لیکن اگر کوئی عالم ہوتا ہے تو وہ عالم سے ڈرتا ہے، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ڈر کر وہ پیچھے رہ جاتا ہے، جی ڈرتا تو ہے لیکن ڈرنے کے ساتھ کوشش یہ کرتا ہے کہ کوئی بڑا مکر ان کے لیے لاؤں۔ دوسروں کو تو چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہلاک کرتا رہتا ہے، لیکن علماء کو بڑے بڑے مکر سے ہلاک کرتا ہے۔ تو اس لیے علماء بھی بے خبر نہیں رہ سکتے۔

جاہل پر شیطان کا داؤ۔ایک قصہ

ایک بہت بڑے عالم گزرے ہیں،امام ابن عبد البر مالکی ، انہوں نے اپنی کتاب ''جامع بیان العلم'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ شیطان کے چیلوں نے شیطان سے کہا کہ جب کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے تو آپ بہت خوش ہوتے ہیں، کسی عابد و زاہد کی موت پر اتنا خوش نہیں ہوتے۔کیا بات ہے؟

شیطان نے کہا کہ آؤ میں تم کو اس کی وجہ بتاتا ہوں۔اس کے بعد شیطان اپنے چیلوں کو لیکر ایک عابد کے پاس گیا جو جاہل تھا ،اور سلام کیا ، خیر خیریت پوچھی ، شیطان نے اس سے کہا کہ آپ بڑے اچھے آدمی لگتے ہیں ،میرے دل میں ایک وسوسہ ہے، خیال ہے،سوال ہے، میں اس کے بارے میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں ۔ عابد نے کہا کہ پوچھئے ، اگر مجھے معلوم ہوگا تو جواب دے دوں گا ،اگر معلوم نہیں تو آپ کسی اور سے پوچھ لیجئے۔

شیطان نے کہا کہ میرے دل میں ایک سوال پیدا ہورہا ہے ،وہ یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک انڈے میں زمین کو،آسمان کو، چاندکو، سورج کو، پوری کائنات کو داخل کردے؟اس حالت میں کہ انڈا جتنا ہے اتنا ہی رہے،اس میں اضافہ نہ ہو اور یہ زمین وآسمان جتنی بڑی ہیں،اس میں کوئی کمی نہ ہو۔ یہ ذہن میں ایک سوال آرہا ہے،اس کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

بھائیو! ذرا اندازہ کیجئے سوال کا،وسوسے کا کہ کس قدر خطرناک ہے ۔اب وہ عابد تو جاہل و بے وقوف تھا ہی ،صرف نماز روزے کی باتیں تو جانتا تھا، باقی اتنا بڑا علم تو تھا نہیں،تو اس نے کچھ دیر سوچا ،اس کے بعد کہنے لگا کہ انڈا اتنا ہی رہے اور زمین بھی اتنی ہی رہے اور آسمان بھی اتنا رہے پھر انڈے میں یہ سب داخل ہوجائیں؟

کیسے ہوسکتا ہے؟ یعنی شک کے لہجے میں، تعجب کے انداز میں اس نے یہ سوال دہرایا، پھر کہنے لگا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔

شیطان کے چیلے وہیں موجود تھے، شیطان نے ان سے کہا کہ میں نے اس کے دل میں شک کا بیج داخل کردیا ہے جو اسے کفر تک پہنچادیگا۔ دیکھا کہ میں نے ایک منٹ میں اس عابد وزاہد کو کافر بنادیا، یا کفر کی دہلیز پر بٹھادیا۔ اس طرح کے لوگ زندہ رہیں یا مرجائیں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کے بعد شیطان ایک عالم سے ملا، اس سے بھی یہی سوال کیا، اور کہا کہ جناب آپ عالم ہیں، فاضل ہیں، میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوگیا ہے، اس کا جواب دریافت کرنے آیا ہوں؟ انھوں نے کہا کہ کیا سوال؟ کہا کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک انڈے میں زمین وآسمان کو ڈالدیں؟ تو ان عالم نے کہا کہ اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ انڈا اپنی حالت پر اسی طرح ہو، زمین اور آسمان بھی اسی طرح ہوں، پھر اللہ تعالیٰ انڈے میں ان کو داخل کردیں؟ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اللہ کی ذات تو وہ ہے کہ جب ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو ''کُنْ'' فرماتا ہے اور وہ چیز ہوجاتی ہے۔ ﴿وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (اور جب وہ (اللہ) کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے ''کن'' (ہوجا) کہتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے) اس لئے مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے، اس میں کوئی بات شک وشبہ کی نہیں۔

شیطان نے اپنے چیلوں کو دیکھ کر کہا کہ دیکھو اس کا علم ایسا ہے کہ یہ ہمارے داؤ میں نہیں پھنس سکتا، اور اس کو بہکانا ہمارے لئے آسان نہیں، اس لئے ان لوگوں کے زندہ رہنے سے مجھے پریشانی ہوتی ہے اور یہ لوگ مرتے ہیں تو میں جشن مناتا ہوں، اور عابد کا حال ایسا کہ اسے جب چاہیں ہم ادھر سے ادھر کرسکتے ہیں، اور اس

کی جہالت کی وجہ سے جب چاہے اس کو صرف معصیت میں نہیں، کفر میں بھی مبتلا کر سکتے ہیں۔(جامع بیان العلم)

اس واقعہ سے اندازہ کیجئے کہ جب آدمی کے اندر جہالت ہوتی ہے، علمِ شرع سے ناواقف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے جاہ وجلال سے ناواقف ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں انسان کس طرح کفر کے دلدل میں پھنس جاتا ہے؟ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ جہالت سب سے بڑی بیماری ہے۔

سالک کا سب سے پہلا کام تحصیل علم ہے

یہیں سے میں سالکین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ علم دین سے کبھی غافل نہ ہوں، کیونکہ سالکین طریقت کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ علم دین حاصل کریں۔ اسی لئے امام مالک نے فرمایا کہ:

”من تصوف و لم يتفقه فقد تزندق ومن تفقه ولم يتصوف فقد تفسق ومن جمع بينهما فقد تحقق “ (جس نے تصوف اختیار کیا اور علم نہیں حاصل کیا وہ زندیق ہوگیا اور جس نے علم سیکھا مگر تصوف اختیار نہیں کیا وہ فاسق ہوگیا اور جس نے دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہوگیا)(ایقاظ الهمم:۲)

حضرت سیدنا امام جنید بغدادیؒ جو ایک طرف حدیث کے امام بھی تھے تو ایک طرف تصوف کے بھی امام تھے، وہ فرماتے ہیں کہ تصوف کی راہ قرآن اور حدیث پر قائم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس راہِ تصوف وسلوک کے اندر سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ علم شرع سے واقفیت ہو، لیکن علم شرع کا مطلب یہ نہیں کہ آپ پورے عالم و فاضل ہو جائیں، یہ کوئی ضروری نہیں، لیکن اتنا علم آدمی کے پاس ہونا چاہئے جس

سے کہ وہ حق و باطل میں تمیز کر سکے، اچھے اور برے کی پہچان اس کے اندر آ جائے، کھوٹ کیا ہے اور اصل کیا ہے اسکو سمجھ میں آ جائے، اتنا علم اگر اس کے پاس موجود ہے تو اس علم کے ذریعے وہ راہ کو طے کر سکتا ہے۔

لہٰذا علماء کی خدمت میں جانا، شریعت سے واقف ہونا، ضروری امور سے واقف ہونا، عقائد سے واقف ہونا، انتہائی ضروری ہے، ان کے بغیر آدمی کا اس راہ میں چلنا دشوار ہے، ورنہ کہیں نہ کہیں آدمی کو شیطان دھوکہ دے دیتا ہے۔

ایک جاہل کی گمراہی کا قصہ

حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ ان کے گاؤں میں ایک آدمی تھا، بڑا عابد تھا، لیکن علمِ دین سے واقف نہیں تھا۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہاں کے کچھ لڑکوں نے اس کا مذاق بنانا چاہا اور سوچا کہ اس آدمی کی بے وقوفی ظاہر کی جائے، ایک دن وہ اپنے گھر میں سو رہا تھا، رات کا وقت تھا تو محلے کے دو چار لڑکے اس کی چھت پر چڑھ گئے اور بناوٹی آواز میں اس کا نام لے کر ایک خاص لب و لہجہ میں اس کو پکارا۔ وہ چونکا، اور پوچھنے لگا کہ کون ہے؟ ایک لڑکے نے آواز بنائی اور کہا کہ میں تمہارا خدا بول رہا ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ جاہل اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے بعد کہنے لگا کہ اے باری تعالیٰ! کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ تو اس نے کہا کہ تیری عبادت مجھے بہت پسند آ گئی، اس لیے آج سے ہم نے تیرے سے نماز معاف کر دی ہے۔ یہ کہہ کر وہ لڑکے تو غائب ہو گئے۔

اب یہ جاہل عابد سمجھا کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ ہی کی آواز ہے، اس لئے اس کو یقین آ گیا کہ نماز معاف ہو گئی۔ اب اس کے بعد جو تہجد تھی وہ بھی ختم، فرائض تھے وہ بھی ختم، نماز کے لئے مسجد کو آنا بند کر دیا۔ اس طرح دو چار دن ہو گئے اور وہ نماز کو نہیں

آیا تو محلے کے لوگوں نے سوچا کہ بیمار تو نہیں ہوگیا؟ چلو جا کر دریافت کریں، کچھ لوگ وفد کی شکل میں اس کے گھر پہنچے، خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھا کہ طبیعت تو اچھی ہے؟ کہا کہ ہاں الحمدللہ! بہت اچھا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کہ پھر نماز کو کیوں نہیں آرہے ہو؟ بہت دن ہوگئے آپ نماز کو نہیں آئے، کیا بات ہے؟ تو کہنے لگا کہ آپ کو خبر ہوئی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سے خوش ہوکر میرے سے نماز معاف کردی۔ لاحول ولاقوۃ اِلا باللہ!

دیکھئے شیطان جاہل لوگوں کو کس طرح بہکانے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان جہالت سے لوگوں کے اوپر تسلط قائم کر لیتا ہے۔

اللہ نے مجھے بچایا ہے، شیخ عبدالقادر جیلانی کا قصہ

یہ تو جاہلانہ طبیعت کا اثر ونتیجہ ہے، اس کے برخلاف جب علم ہوتا ہے تو کیا حال ہوتا ہے انسان کا؟ اس کو ایک واقعہ سے سمجھئے، کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسا کہ ہم جانتے ہیں بہت بڑے عالم تھے، محدث بھی تھے، بہت بڑے صوفی اور بزرگ بھی تھے، ان کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے سامنے ایک ابر چھا گیا اوراس میں سے چمک ظاہر ہوئی، انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے اندر سے ایک آواز آنے لگی، آواز کی طرف متوجہ ہوئے تو اس آواز میں ان سے کہا گیا کہ آپ کی عبادت آپ کا زہد، ریاضت، آپ کے مجاہدات سے ہم بہت خوش ہوگئے، اس لیے آپ سے نماز معاف کردی جاتی ہے۔

انہوں نے یہ سنتے ہی سوچا کہ نماز اللہ کے نبی ﷺ سے معاف نہیں ہوئی جبکہ آپ ﷺ کی عبادت وریاضت کا جو حال تھا وہ سب کو معلوم ہے تو میرے سے کیسے معاف ہوسکتی ہے؟ لہذا یہ دراصل شیطان کی آواز ہے، پھر " **لاحول ولا قوہ إلا**

باللّٰہ ''پڑھا۔ یہ پڑھنا تھا کہ وہ ابر جونظر آرہا تھا اوراس کے اندر سے چمک ظاہر ہورہی تھی وہ دُھویں کی شکل میں تبدیل ہوکر غائب ہوگئے، حضرت سمجھ گئے کہ دراصل شیطان کی آواز تھی، پھر کچھ دیر بعد اسی طرح ہوا اوراس کے اندر کہا گیا کہ آپ کو آپ کے علم نے بچالیا۔حضرت نے فوراً اس کے جواب میں فرمایا کہ میرے علم نے نہیں، میرے خدا نے مجھے بچالیا۔

دیکھا آپ نے کہ علم انسان کی رہنمائی کرتا ہے، لیکن بچانے والی ذات تو اللہ ہی کی ہوتی ہے، اگر خدا بچانا نہ چاہے تو وہ عالموں کو بھی گمراہ کردے، جیسے بہت سے ہوجاتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ساتھ ایک اور واقعہ بھی پیش آیا، کہ آپ ایک مرتبہ بڑی شدت سے پیاس محسوس کررہے تھے، حضرتؒ نے جنگلات میں کئی سالوں تک زندگی گزاری ہے، ریاضت کے لیے، مجاہدات کے لیے، تو اس زمانہ میں پانی ایک دفعہ نہیں ملا، بڑی شدت کی پیاس لگ رہی تھی، دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔اسی وقت ایک ہاتھ ظاہر ہوا اوراس ہاتھ میں ایک گلاس تھا جو سونے یا چاندی کا تھا اوراس کے اندر پانی بھی تھا اور آواز آرہی تھی کہ آپ کے لیے یہ جنت سے بھیجا جارہا ہے، آپ اس کو لیجئے استعمال کیجئے۔حضرت نے سمجھ لیا کہ یہ شیطان کی مکاری ہے، لہذا'' **لاحول و لا قوّۃ الا باللّٰہ** ''پڑھا، حضرت کو یہ بات کیسے سمجھ میں آئی کہ یہ شیطان کی مکاری وعیاری ہے؟ یہ بات سمجھ میں آئی شریعت کے علم سے ، کیونکہ یہ سونے اور چاندی کا گلاس تھا اور سونے اور چاندی کا استعمال اللہ کے نبی علیہ السلام کی شریعت میں ممنوع ہے، حرام ہے، ناجائز ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے جنت سے وہ چیز دی جائے جو خود شریعت کے اندر حرام ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

شیطان نے بہکانے کی کوشش کی ،لیکن حضرت سمجھ گئے ،لاحول ولاقوۃ پڑھا تو شیطان کہنے لگا آپ کے علم نے آپ کو بچا لیا۔حضرت نے فرمایا کہ علم نے نہیں بلکہ میرے خدا نے مجھ کو بچالیا۔تو اس طرح علم رہنمائی کرتا ہے جس کی وجہ سے شیطان کے مکر کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

شیطان کی حضرت عیسی علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش

یادرکھو کہ شیطان کی عیاری ومکاری بڑی خطرناک ہوتی ہے،وہ کسی کو بھی نہیں چھوڑتا،حتی کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی نہیں چھوڑتا۔

ایک دفعہ شیطان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیااورآ کر کہنے لگا: آپ تو وہ ہیں کہ اپنی ربوبیت سے شیرخوارگی میں آپ نے کلام کیا ، جبکہ کوئی اور ایسا نہیں کرسکتا۔حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا کہ ربوبیت والوہیت تو اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے قوت گویائی دی۔

پھر وہ کہنے لگا کہ اے وہ ذات کہ جس نے اپنی الوہیت سے مردوں کو زندہ کیا ہے،اے وہ ذات جس نے اپنی الوہیت سے مختلف پرندوں کو بنا کر زندہ چھوڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہنے لگے "لاحول ولاقوۃالاباللّٰہ"،میں کہاں کا خدا، میرے اندر کہاں الوہیت؟الوہیت تو اس اللہ کے اندر ہے جو مجھے بھی زندگی اورموت دیتا ہے۔(مکائدالشیطان ابن ابی الدنیا:۶۷)

دراصل شیطان ان باتوں سے ان کو بہکانے کے لیے آیا تھا تاکہ ان کے ذہن میں یہ ڈال دے کہ جیسے لوگ سمجھتے ہیں،اسی طرح یہ الوہیت کے حامل ہیں۔یعنی خدائی صفات ان کے اندر ہیں،تو خدائی صفات کا حامل بتایااوران کے ذہن میں یہ بات ڈالنی چاہی تاکہ نعوذ باللہ حضرت عیسی گمراہ ہوجائیں،لیکن اللہ تو انبیاء کرام علیہم

الصلوۃ والسلام کی حفاظت کرتا ہے، اور اپنی عصمت سے ان کو نوازتا ہے، اس لیے حضرت عیسی علیہ السلام نے فوراً یہ جواب دیا۔

معلوم ہوا کہ شیطان بڑا مکار ہے، عیار ہے، اور اسی لیے وہ چیزوں کو مزین کرتا ہے اور باتوں کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ انسان بہک جاتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی سے شیطان کا عجیب سوال

حضرت جنید بغدادیؒ کا نام کون نہیں جانتا! آپ کا واقعہ ہے کہ حضرت جنیدؒ بغدادیؒ نے ایک مرتبہ دل میں خیال کیا کہ اگر شیطان سے ملاقات ہو جائے تو ایک سوال کروں گا، اور انہوں نے ایک دن اللہ سے دعاء بھی کر دی کہ اے اللہ! کبھی شیطان سے ملاقات کرا دے تاکہ اس سے سوال کرلوں۔ ایک دن نماز پڑھ کر مسجد کے باہر نکلے تو ایک بوڑھا آدمی جھک کر سلام کرنے لگا۔ حضرت جنیدؒ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ کون ہو تم؟ کہنے لگا کہ میں وہی ہوں جس سے ملنے کی آپ کو آرزو اور تمنا تھی۔

حضرت سمجھ گئے کہ یہ اصل میں شیطان ہے۔ شیطان نے کہا کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟ حضرت جنیدؒ نے کہا کہ میرے ذہن میں تیرے متعلق ایک سوال ہے، سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالی نے تجھے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تجھے کس چیز نے اللہ کے حکم کی تعمیل سے منع کیا؟ کیوں تو نے سجدہ نہیں کیا، کیا اللہ کی عظمت کو نہیں جانتا تھا؟ ارے تجھے اللہ کی معرفت حاصل تھی، اللہ تعالٰی کی عظمتوں اور جلالتوں سے تو واقف تھا، اس قدر اللہ کی قربت رکھنے کے باوجود جب اللہ نے تجھے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کر۔ تو تو نے آخر کیوں سجدہ نہیں کیا؟

اس پر شیطان کا جواب کیا تھا، وہ سننے کے قابل ہے، اس کے جواب نے کچھ دیر کے لئے حضرت جنید کے ہوش اُڑا دیے۔ اس نے کہا کہ جنید! آپ جیسا توحید پرست آدمی اور یہ مشرکانہ سوال؟ آپ جیسا توحید پرست ایک اللہ کو ماننے والا، ایک اللہ کی پوجا کرنے والا اور آپ کے ذہن میں سوال آ رہا ہے مشرکانہ سوال کہ میں نے غیر اللہ کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ کہنے لگا کہ آدم تو غیر خدا تھے، خدا تو نہیں تھے، میں غیر اللہ کو کیوں سجدہ کر لیتا۔ آپ جیسا توحید پرست آدمی ایسا مشرکانہ سوال میرے سے کر رہا ہے، بڑے افسوس کی بات ہے۔

حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ جب اس نے یہ بات میرے سے کہی تو مجھے لگا کہ ہاں! یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے، اور پھر تھوڑی دیر کے لیے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا ایمان سلب ہو رہا ہے، اس لیے میں سناٹے میں پڑ گیا، ہوش وحواس باقی نہ رہے، میں سوچنے لگا کہ اس کو کیا جواب دے سکتا ہوں۔ اس لیے کہ جب وہ کہہ رہا ہے کہ تم ایک اللہ کو ماننے والے ہو اور مجھے پوچھتے ہو کہ آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ حضرت جنید کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں جواب نہیں آیا۔ فوراً اللہ کی طرف سے الہام ہوا اور مجھ سے کہا گیا کہ اس سے یہ پوچھو کہ حکم دینے والا کون تھا؟ حکم دینے والا جب خود کہہ رہا ہے کہ فلاں چیز کو سجدہ کرو تو توحید اسی کا نام ہے کہ اس کی بات کو مان لیا جائے۔ حضرت جنید کہتے ہیں کہ اس الہام کے بعد میرا ایمان برقرار ہوا اور نہ تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے ایمان میں تزلزل پیدا ہو گیا ہے۔

بھائیو! یہ ہے شیطان کی مکاری اور عیاری، نہ ولیوں کو چھوڑا، نہ غوث وقطب وابدال کو چھوڑا، نہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو چھوڑا۔ غور کرو کہ شیطان باتوں کو اور چیزوں کو کس طرح مزین کرتا ہے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کا ذرا اندازہ اس واقعہ سے آپ کر لیجئے، اس لیے کبھی بھی شیطان سے بے فکر نہیں ہونا چاہئے، شیطان کی عیاری اور مکاری سے بسا اوقات انسان بے ایمان بھی ہو جاتا ہے، لیکن اسے خبر نہیں رہتی کہ میں بے ایمان ہو گیا ہوں۔ شیطان کفر کو مزین کر دیتا ہے۔

مجھ سے کونسا گناہ ہو گیا؟

بعض لوگوں کی زبان پر کبھی کبھی ایسے الفاظ سنے جاتے ہیں جیسے مثلاً کبھی کوئی مصیبت آگئی، پریشانی آگئی، اللہ کی طرف سے بیماری میں مبتلا کر دیا گیا یا کھانے کی پینے کی اور کسی قسم کی پریشانی پیش آگئی تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے سے کیا گناہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ مصیبت دے رہا ہے۔ اس جملہ پر غور کیجئے! نفسانی کید اور شیطانی مکر پر غور کیجئے کہ اس جملے کے اندر کس قدر نفسانی کید اور شیطانی مکر پوشیدہ ہے، گویا کہ اس جملے میں وہ دعوی کر رہا ہے کہ میں گناہ نہیں کرتا، میں گناہوں سے بالکل معصوم اور پاک ہوں، اس لئے کہتا ہے کہ مجھ سے کون سا گناہ ہو گیا؟ یعنی بالکل نہیں ہوا، قطعاً نہیں ہوا، پھر اللہ تعالیٰ مصیبت میں مجھے کیوں ڈال رہا ہے؟ اس میں دعویٰ ہو گیا اپنے آپ کے پاکباز ہونے کا، جس کا دعویٰ انبیاء کرام علیہ الصلوۃ والسلام نے بھی کبھی نہیں کیا تھا، لیکن یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میرے سے کوئی گناہ نہیں ہوا، اور جب گناہ ہی نہ ہونے کا یہ دعویدار ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ نعوذ باللہ یہ انبیاء جیسا معصوم ہو گیا۔

اب بتاؤ کہ اس جملے میں شیطانی مکر پوشیدہ ہے کہ نہیں ہے؟ نفسانی کید پوشیدہ ہے کہ نہیں ہے؟ لیکن یہ جملہ کتنی آسانی وسادگی کے ساتھ زبان سے نکل جاتا ہے، اور کس قدر لوگ اس کے اندر ملوث ہیں، لیکن کبھی ان کو دھیان تک نہیں جاتا کہ ہم

نے اس جملہ کے اندر کتنا بڑا دعوی کیا ہے، اس دعویٰ کی وجہ سے ان کی ساری عبادت بھی رائیگاں چلی جاتی ہے۔

حضرت آدم اور شیطان کی خطاؤں میں فرق

یہاں ایک نکتہ عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی خطا ہوئی اور شیطان نے بھی خدا کی نافرمانی کی، مگران دونوں کی نافرمانیوں میں ایک زبردست اور بڑا عظیم فرق ہے، وہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جب ایک خطا کا صدور ہوا تو فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے انہوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا، اور شیطان سے جب گناہ ہوا تو وہ اڑ گیا کہ مجھ سے گناہ نہیں ہوا ہے، بلکہ میں نے تو آدم کو سجدہ نہ کر کے توحید کا مظاہرہ کیا ہے۔معلوم ہوا کہ بندہ کا اللہ کی جناب میں عجز و نیاز اور اپنی خطاؤں و گناہوں کا اعتراف ہی اس کو اللہ کے یہاں مقام دلاتا ہے۔

اس لئے یوں کہنا کہ میں نے کونسا گناہ کیا یہ بہت نازیبا بات ہے اور اس میں دعوی ہے۔لہذا ایسے قبیح جملوں کے استعمال کرنے سے بچنا چاہئے، شیطان ایسے جملے ہماری زبانوں سے نکلوا کر ہمارا ایمان برباد کرنا چاہتا ہے۔

عبادات پر ناز-ایک عظیم شیطانی حربہ

شیطانی حربوں کا ذکر چل رہا ہے تو ایک اور اہم بات کی طرف توجہ کیجئے، خاص طور پر میں سالکین کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔وہ یہ ہے کہ شیطان انسانوں کو گمراہ کرنے ایک حربہ یہ بھی استعمال کرتا ہے جو زیادہ خطرناک اور قابل توجہ ہے، وہ کیا؟ وہ یہ کہ بسا اوقات شیطان عبادات وریاضات کے ذریعہ، نماز روزہ کے ذریعہ، وظائف کے ذریعہ انسان کو بہکاتا ہے، اور دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ تو

بڑا عابد و بزرگ ہو گیا ہے، تیرا بہت اونچا مقام ہے، اس طرح عبادات پر ناز وفخر میں مبتلا کر کے انسان کو خدا کی نظروں سے گرا دیتا ہے۔

بعض لوگ ہوتے ہیں کہ دو چار رکعات پڑھ کر ڈینگیں مارنے لگتے ہیں، اور خود کو سب سے افضل اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ عبادات و ریاضات پر ناز وفخر دل کی نجاستوں و گندگیوں میں سے ایک ہے۔ معلوم نہیں کتنی گندگیاں ایسی ہمارے اندر ہیں، کتنی خباثتیں اور رذائل ہمارے اندر جمی ہوئی ہیں اور ہم اس کے باوجود بڑے مطمئن ہیں کہ ہم تو ماشاء اللہ ذاکر ہیں، شاکر ہیں، سالک ہیں اور فلاں اور فلاں قسم کی عبادتوں میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ یہ عبادت نہیں، بلکہ عبادت کے لباس میں گناہ ہیں جن کو شیطان نے اس طرح مزین کر دیا ہے اور نیکی کا پردہ ڈال دیا ہے کہ اس کے اصلی چہرہ کو دیکھنے اور اس کی اصلیت کو پہچاننے سے ہماری آنکھیں قاصر ہیں۔

اسی لئے شیخ کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ شیطان کے مکر وفریب سے واقف ہوتا ہے، نیکی اور بدی کی پہچان رکھتا ہے، وہ شیطان کی چالوں کو سمجھتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ شیطان کہاں چکما دے رہا ہے، کس طرح گمراہ کر رہا ہے، اسی لئے ہمارے بزرگان دین فرماتے ہیں کہ کسی اللہ والے سے تعلق رکھنا اور اس کی رہبری میں دین پر چلنا ضروری ہے ورنہ شیطان ایسا مکار اور چالباز ہے کہ اس نے نہ ولیوں کا چھوڑا، نہ غوث وقطب کو چھوڑا، نہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو چھوڑا، نہ کسی اور کو چھوڑا تو ہمارے اور آپ کے ساتھ اس کا کیا معاملہ ہوتا ہوگا؟

شیطان کا اللہ کے سامنے دعوی

بھائیو! ہم سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے،

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيۡنٌ﴾ (بے شک شیطان کھلا دشمن ہے) (القصص:۱۵)

اور ایک جگہ قرآنِ کریم کے اندر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان نے اللہ کے سامنے اس بات کا دعوی کیا کہ وہ انسانوں کو ہر طریقہ سے اور ہر طرف سے گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ تعالی شیطان کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ:

﴿قَالَ فَبِمَاۤ اَغۡوَيۡتَنِىۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَهُمۡ صِرَاطَكَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ اَيۡمَانِهِمۡ وَعَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ وَلَا تَجِدُ اَكۡثَرَهُمۡ شٰكِرِيۡنَ﴾ (الأعراف:۱۶)

(اے اللہ! آپ نے چونکہ مجھے گمراہ کیا؛ اس لئے میں لوگوں کو بہکانے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا پھر میں ان کے سامنے سے، پیچھے سے، ان کے داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے بہکانے آؤں گا، پھر آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے)

ان آیتوں میں شیطان کے اسی دعوی کا ذکر کیا گیا ہے، شیطان کے یہ الفاظ قابل غور ہیں، اور یہ بات بھی کہ اس نے اتنا بڑا یہ دعوی خود اللہ تعالی کے سامنے کھڑے ہو کر کیا تھا۔ شیطان کہتا ہے کہ اے اللہ! چوں کہ آپ نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے، اس لیے میں صراط مستقیم پر آکر میں بیٹھوں گا تاکہ میں ان کو گمراہ کرتا رہوں، دائیں سے بائیں سے، آگے سے پیچھے سے چہار طرف سے آکر ان کو بہکانے کی کوشش کروں گا۔ تو وہ اپنے اس دعوی کو حقیقت بنانے کیا کچھ نہ کرتا ہوگا اور اس کے لئے کس قدر قوت وطاقت سے، اور اپنی عقل و تجربے سے کام لیتا ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔

شیطان صرف چار طرفوں سے بہکاتا ہے، کیوں؟

یہاں اس آیت میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ شیطان نے بہکانے کے لئے صرف چار طرفوں کا ذکر کیا ہے: آگے، پیچھے، داہنے اور بائیں کا، جبکہ جہات چھ ہیں، ان میں اوپر اور نیچے کا ذکر شیطان نے نہیں کیا، کیوں؟

اس کی وجہ علماء لکھتے ہیں کہ شیطان نے نیچے کی جہت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ نیچے سے آنا نہیں چاہتا، کیونکہ اس کے اندر کا تکبر اسے نیچے سے آنے میں مانع بنتا ہے، اس لیے کہ نیچے سے آنے میں جھکنا پڑتا ہے، اور جس میں تکبر ہوتا ہے وہ کبھی جھکنے کو گوارہ نہیں کرتا، اور اس نے اوپر کی جہت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ شیطان کو اوپر سے آنے کی اللہ نے قدرت نہیں دی ہے، اس لیے کہ اوپر سے فرشتوں کے آنے کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس راہ کو شیطان کے لیے مسدود کر دیا ہے۔

شیطان صراطِ مستقیم پر؟ ایک عجیب نکتہ

اب اس آیت کے مضمون پر غور کرو کہ شیطان نے یہ کہا کہ میں صراطِ مستقیم پر بیٹھوں گا، ''لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ''

سوال یہ ہے کہ کیا شیطان بھی صراطِ مستقیم پر بیٹھتا ہے؟ جی ہاں! بیٹھتا ہے، مگر ایک ہے صراطِ مستقیم پر قائم ہونا کھڑا ہونا اور ایک ہے صراطِ مستقیم پر بیٹھنا، دونوں میں بڑا فرق ہے، ہر مسلمان، نیک آدمی، اللہ والا صراطِ مستقیم پر کھڑا ہوتا ہے، اور محاورے میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی غرض سے وہ اس پر کھڑا ہے اور چل رہا ہے، لیکن صراطِ مستقیم پر بیٹھنا الگ چیز ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چلنے کے لئے نہیں، اس کو پار کرنے کے لئے نہیں، بلکہ کسی بری غرض و نیت سے اس پر ہی

بیٹھ گیا ہے۔جیسے ڈاکو لوگ شاہ راہوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور گزرنے والے قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں بالکل شیطان کا صراط مستقیم پر بیٹھنا بھی اسی طرح کا بیٹھنا ہے کہ وہ اس پر بیٹھ کر لوگوں کے ایمانوں اور نیکیوں کو لوٹ لینا چاہتا ہے۔

یہیں سے ایک نکتہ کی بات بھی سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ شیطان لوگوں کو بہکانے کے لئے صراط مستقیم پر آتا ہے، یعنی ان لوگوں کے پاس آتا ہے جو صراط مستقیم پر چل رہے ہیں، اسے تو انہی کو بہکانا ہے اور وہ لوگ جو پہلے ہی سے بہکے ہوئے اور گمراہ ہیں ان کو بہکانے کی اسے ضرورت کیا ہے؟ وہ تو بہکے ہوئے ہیں، لہذا صراط مستقیم پر آکر بہکانے کا حاصل یہ ہوا کہ وہ صراط مستقیم پر چلنے والوں کی تلاش وجستجو میں وہاں آتا اور وہاں بیٹھ کر ان کو بہکاتا ہے۔اور یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ کفر ومعصیت اور جہالت وبغاوت کے راستے پر جا کر بیٹھے گا تو اس کو بہکانے کے لئے کون ملے گا؟ وہاں تو کافر ہوں گے، شرابی ہوں گے، زانی ہوں گے، لٹیرے ہوں گے، یہ سب لوگ پہلے سے بھٹکے و بہکے ہوئے ہیں، شیطان اتنا بے وقوف نہیں کہ وہ اپنی محنت ان کے پیچھے ضائع کردے، لہذا وہ صراط مستقیم پر آتا ہے کہ یہیں اس کو مومنین ملتے ہیں، مسلمین ملتے ہیں، ذاکرین ملتے ہیں، نمازی ملتے ہیں، حاجی ملتے ہیں، اللہ والے ملتے ہیں۔

ایک عالم کا قصہ

مجھے ایک عالم کا قصہ یاد آیا کہ ان سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت! ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ اہل سنت میں سے ہوتے ہیں، اور وہ بہک جاتے اور شیعہ فرقے میں داخل ہوجاتے ہیں، کوئی قادیانی بن جاتا ہے، کوئی اور کسی گمراہ فرقوں ولوگوں میں داخل وشامل جاتا ہے، مگر ہم نے کبھی نہیں سنا کہ ان گمراہ فرقوں کے لوگ مسلمان

ہو گئے اور اہل سنت میں داخل ہو گئے ،اس کی کیا وجہ ہے؟ تو ان عالم نے بڑا عمدہ جواب دیا ،انھوں نے کہا کہ دیکھو! شیطان انہی لوگوں کو بہکا تا ہے اور ان ہی کے دلوں میں وسوسہ وشبہات ڈالتا ہے جو حق پر ہوتے ہیں ،اور جو پہلے ہی سے بہکے ہوئے ہوں ان کو شیطان ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے ۔لہذا بہکاوا اگر ہوگا تو اہل سنت ہی کو ہوگا ، نہ کہ اہل باطل کو۔اس لئے شیطان اہل حق کو بہکا تا ہے اور انہی میں سے کچھ لوگ بہک جاتے ہیں۔

سالکین کو شیطان کس طرح بہکا تا ہے؟

اب آیئے اصل بات کی طرف ،علماء نے بیان کیا ہے کہ صراط مستقیم پر بیٹھنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ شیطان نیکیوں کے ذریعہ بھی انسانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس طرح پر کہ جب نیک لوگ نیکی کرتے ہیں تو ان کے دل ودماغ کے اندر ان کی بڑائی کا تصور ڈالدیتا ہے، اور وہ نیکی کے کام کر کے اپنے کو بڑا سمجھتے اور ناز وفخر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت سیدنا موسی علیہ السلام کے پاس شیطان پہنچا،حضرت موسی علیہ السلام نے اسے دیکھا تو فرمایا کیا تو شیطان نہیں ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں میں شیطان ہوں۔حضرت موسی علیہ السلام نے کہا کہ مجھے یہ بتا کہ تو اب تک لوگوں کو گمراہ کرتا آیا ہے، گمراہ کرنے کے لیے سب سے بڑا کونسا حربہ اختیار کرتا ہے؟

اس نے کہا کہ میں اس طرح گمراہ کرتا ہوں کہ انسان کو اس کی نیکیوں پر تفاخر میں مبتلا کر دیتا ہوں۔نیکی کرتا ہے تو سمجھتا ہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہو گیا ہوں، میں نے تو بہت کچھ کر دیا ہے، اپنی نیکیوں کو اچھا سمجھنا، اپنے آپ کو اچھا سمجھنا، اپنی عبادت ریاضت ومجاہدہ کو قابل فخر چیز سمجھنا، اپنے آپ کو اونچا اور سب سے اعلی سمجھنا، یہ عجب

وتکبر ہے۔اس عجب وتکبر کے راستے سے میں ان کو بہکایا کرتا ہوں۔(تنبیہ الغافلین)

معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک حربہ ہے شیطان کا،اور بہت بڑا حربہ ہے۔ چنانچہ بہت سارے لوگ عبادت کرتے ہیں، ریاضت کرتے ہیں، مجاہدات کرتے ہیں، علم کے میدان میں آگے بڑھتے ہیں اور مختلف قسم کی خدمات کرتے رہتے ہیں، اللہ کے دین کی اشاعت میں، اللہ کے دین کی دعوت میں، اللہ کے دین کو پھیلانے میں لگتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس تکبر غرور اور فخر میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ ''ہم چوں ماڈنگرے نیست''، ہم تو بہت آگے بڑھ گئے ہیں، اب ہمارا کوئی مقابل نہیں، اور اسی کے ساتھ ساتھ پھر دوسروں کی توہین اور تضلیل اور دوسروں کے بارے میں بدگمانی، دوسروں کے بارے میں ایک قسم کے برے خیالات بھی دل میں جمالیتے ہیں، جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا عبادت کرتا ہے اتنا نیچے آجاتا ہے، اس سے اللہ کی نظر میں وہ انتہائی ناقص ہوجاتا ہے اور آخری منزل میں اس کو گرا کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ایک بزرگ کی قیمتی نصیحت

اس لئے سالک کو ہمیشہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنا چاہئے، اسی عاجزی وانکساری سے ترقی ہوتی ہے۔ایک بزرگ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمایئے! انہوں نے ایک دومنٹ سوچنے کے بعد کہا کہ بھائی! کبھی پہاڑ پر چڑھے ہو، اس نے سوچا، اس کے بعد کہا کہ ہاں چڑھا ہوں، فرمایا کہ جب پہاڑ پر چڑھے تھے تو کس طرح چڑھے تھے؟ جھک کر چڑھے تھے یا اکڑ کے، اس نے کہا کہ جب چڑھنے کا موقع آیا تو جھک کے چڑھا تھا۔

آپ بھی سوچ کر دیکھ لیجئے کہ جب پہاڑ یا کسی بھی بلندی پر چڑھنے کا موقع آتا ہے تو انسان کیسا چڑھتا ہے؟ جھک جاتا ہے، جھک کر اوپر چڑھتا ہے۔اس نے

کہا کہ حضرت چڑھنے کے لیے جھک کر چڑھتا رہا،فرمایا کہ اچھا، جب چڑھے تھے تو اترے بھی ہوں گے، اترے تو کس طرح اُترے تھے؟ جھک کر یا اکڑ کر؟ اس نے کہا کہ اکڑ کے اترا تھا۔

اس لیے کہ اگر جھک کے اتریں گے تو لڑھک کر نیچے آ جائیں گے، اوپر سے نیچے کی طرف آتے وقت جھکنا نہیں چاہئے، بلکہ اکڑ کے آنا چاہئے، اس نے کہا کہ حضرت اکڑ کے آیا تھا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اس کے اندر بڑی عبرت ہے، وہ یہ کہ جو جھکتا ہے، اللہ اسے بلندی پر لے جاتا ہے، جو اکڑتا ہے، اسے اوپر سے نیچے لاتا ہے۔

کیسی اچھی مثال دی ہے، کیا بہترین نصیحت فرمائی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جھکنا اللہ کو پسند ہے، اگر ظاہری طور پر بھی آپ کسی بلندی پر پہنچنا چاہتے ہیں، حسی طور پر بھی کسی بلندی پر پہنچنا چاہتے ہیں تو وہاں بھی جھکنا ضروری ہو جاتا ہے اور جب آدمی اکڑتا ہے تو اوپر سے نیچے کی طرف آ جاتا ہے۔

اسی طریقے پر روحانی و باطنی طور پر جو بلندیوں پر پہنچنا چاہتا ہے تو اسے بھی جھکنا پڑتا ہے، جھکے گا، چڑھے گا، اکڑے گا تو نیچے آ کر مرے گا، یا نہیں تو کم از کم گرے گا؛ اس لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ شیطان کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ عبادت، ریاضت، مجاہدہ، نیکی، دینی خدمات یہ سب کچھ کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو اس طرح کے خیالات میں مبتلا کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اللہ کی نگاہ میں گر جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا شیطان سے ایک سوال

بہ ہر حال شیطان کے مختلف حربے ہیں جن سے وہ بہکاتا ہے، یہاں یاد آیا کہ

حضرت سیدنا نوح علیہ السلام طوفان کے موقعہ پر جب سفینہ میں سوار تھے تو وہاں پر اچانک ان کو شیطان نظر آیا، انہوں نے کہا کہ تو یہاں بھی پہنچ گیا؟ اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا، جب تک کہ تیرا راز نہ معلوم کرلوں۔ اس کو حضرت نوح علیہ السلام نے پکڑ لیا اور فرمایا کہ تیرا راز مجھ کو بتا کہ تو گمراہ جو کرتا ہے وہ کس راستے سے کرتا ہے؟

تو اس نے کہا کہ پانچ باتیں ہیں، لیکن پانچ میں سے میں آپ کو تین بتا تا ہوں، دو نہیں بتا تا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ اس مردود سے کہو کہ ہمیں ان تین کی ضرورت نہیں ہے، وہ دو ہی ہم کو بتا دے؛ اس لیے کہ اصل تو وہی ہے راز۔ تو حضرت سیدنا نوح علیہ السلام نے کہا کہ مجھے ان تین حربوں کی ضرورت نہیں ہے، وہ دو بتا جو تو نہیں بتانا چاہتا۔ تو اب مجبور ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ دو باتیں جس سے میں لوگوں کو گمراہ کرتا ہوں، اور آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا وہ آپ سن لیجئے! ایک حسد اور ایک حرص۔ پھر شیطان کہنے لگا کہ حسد سے میں گرا اور حرص سے حضرت آدم گر گئے۔

اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا اور ان کو علم عطا فرمایا اور ان کی شان و شوکت کو فرشتوں کے سامنے ظاہر فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ تو فرشتے تو سجدے میں گر گئے، ابلیس کو تکبر نے روکا، تکبر کے بعد حسد پیدا ہوا، حسد اس لیے پیدا ہوا کہ ان کی وجہ سے میں اللہ کی نگاہ میں گر گیا ہوں، اب کسی نہ کسی طرح ان کو بھی گرانا ہے، یہ ہے حسد۔ جب کسی کے پاس کوئی کمال دیکھے، جب کسی کے پاس حسن و جمال دیکھے، جب کسی کا عطا و نوال دیکھے، جب کسی کے اندر بڑائی دیکھے، جب کسی کے اندر علم دیکھے، جب کسی کے اندر مال و دولت کی فراوانی دیکھے، اس وقت دل کے اندر یہ خواہش کا ہونا کہ اس سے ساری

چیزیں چھن جائیں، چاہے مجھے ملیں کہ نہ ملیں، اس کے پاس بھی نہ رہیں، یہ ہے حسد کی بیماری، یہ حسد اللہ کی نگاہ میں بہت بری چیز ہے۔

شیطان نے سوچا کہ اللہ نے اُن کو اتنا اونچا بنایا ہے، ان کو بھی گراؤں گا، میں جیسے گر گیا ان کو بھی گراؤں گا، اس کے بعد اس حسد میں مبتلا ہو کر وہ فکر میں رہا کہ کس طرح ان کو میں ذلیل وخوار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں؟ یہ ہے حسد جس کی وجہ سے شیطان گمراہ ہوا۔

اور حضرت آدم کو جس درخت سے منع کیا گیا تھا، جا کر اس کو کھالیا تھا، اس لئے کہ شیطان نے قسم کھا کھا کر ان سے کہا تھا کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ اس درخت کو کھانے کا اتنا بڑا فائدہ ہے، اور فائدہ یہ ہے کہ آپ اس کو کھالیں گے تو کبھی نہیں مریں گے، ہمیشہ زندہ رہیں گے، انہوں نے کہا کہ بہت اچھا، کھالیں گے تو حرص میں آکر کھا گئے، اس کو شیطان نے کہا کہ حسد نے مجھے تباہ کیا اور حرص کی بیماری نے حضرت آدم علیہ السلام کو گرا کر رکھ دیا۔

عبرت وموعظت

میرے بھائیو اور دوستو! شیطان کے یہ سارے راز ہم کو اللہ کے کلام کے ذریعے ملے، انبیاء کرام سے ملے، بزرگوں کے کلام کے ذریعے ہم کو ملے، ان ساری چیزوں سے ہم کو معلوم ہوا کہ شیطان کس کس طریقے پر انسان کو بہکاتا ہے، اور ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور پھر اللہ سے دوری میں مبتلا کرتا ہے، جب ہمیں یہ سب چیزیں معلوم ہو گئیں تو اب ہم ان ساری چیزوں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو چوکنا رکھیں۔

قرآن کریم نے ہم کو بتادیا ہے ﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ﴾ (شیطان

کھلا ہوا دشمن ہے)(القصص:۱۵)

اگر کوئی آپ کا باپ یا استاذ، یا آپ کا دوست، آپ کو بتا دے کہ فلاں آدمی سے چوکنا رہو، اس لیے کہ وہ تمہارا دشمن ہے، تو آپ کو یقین آتا ہے اور آپ بچتے ہیں کہ نہیں بچتے؟ باپ کی بات پر یقین، استاذ کی بات پر یقین، شیخ کی بات پر یقین، دوست کی بات پر یقین، لیکن اللہ کہہ رہا ہے کہ شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے، مگر افسوس کہ اس پر یقین نہیں۔ اور وہ چیزیں جو شیطان ہم کو گمراہی میں پھنسانے کے لیے اختیار کرتا ہے، ان چیزوں کو بڑی آسانی سے ہم اختیار کرتے چلے جاتے ہیں، بہت بڑی ہمارے لیے عبرت کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مکائدِ شیطان کو سمجھنے کی ہمیں توفیق دے، اور اس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہمیں بھرپور توفیق و ہمت عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنایئے

باسمہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنائیے

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم
بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾ (الانشراح:۷-۸)

حضرات!

آپ کے سامنے قرآن کریم کی ایک مشہور سورت کی آخری آیتیں تلاوت کی گئی ہیں، جس کو ''سورۂ الم نشرح'' یا ''سورۂ انشراح'' کہا جاتا ہے، اوران آیات میں ایک نہایت اہم مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾

(اے ہمارے نبی! جب آپ فارغ ہوجائیں تو محنت کیجئے اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کیجئے)

اس میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کرکے فرمایا گیا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ فارغ ہوجائیں، کس کام سے؟ اپنے دعوتی اور تبلیغی اور علمی و اصلاحی، جہادی اور مختلف قسم کے جو کام آپ کے سپرد ہیں، ان سے فارغ ہوجائیں تو پھر عبادت کے لیے تیار ہوجائیے اور اس میں خوب محنت کیجئے اور پھر اپنے ہی رب کی طرف پورے پورے طور پر متوجہ ہوجائیے۔

یہ آیتیں بڑی قابل غور آیتیں ہیں، اگرچہ خطاب ہے نبی اکرم ﷺ کو، لیکن

آپ کے واسطے سے تمام لوگوں کو ہے اور بالخصوص امتیوں کو، اور پھر بالاخص سالکین کو جو اللہ کے راستے میں چلنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

آیت زیر بحث کی تفسیر

اب آیئے ان آیات کے معنی پر غور کریں۔ اس میں اللہ تعالی فرماتے ہیں: ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾ (اے ہمارے نبی! جب آپ فارغ ہو جائیں تو محنت کیجئے اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کیجئے)

اس میں جو یہ فرمایا کہ ''جب آپ فارغ ہو جائیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ اپنے دنیوی امور سے اور اپنی دینی و نبوی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جائیں، ''فَانْصَبْ'' تو آپ عبادت میں اپنے کو لگا دیجئے۔ چنانچہ مفسرین کرام نے فارغ ہونے کے معنی میں دنیوی امور و دینی امور دونوں کو مراد لیا ہے۔ اسی لئے بعض نے فرمایا کہ ''جب آپ دنیوی کاموں سے فارغ ہو جائیں''، بعض نے کہا کہ ''جب آپ جہاد سے فارغ ہو جائیں'' اور بعض نے کہا کہ ''جب آپ تبلیغ وحی سے فارغ ہو جائیں''۔ (دیکھو تفسیر ابن کثیر و روح المعانی)

لہذا مطلب یہ ہوا کہ آپ جب اپنے دنیوی و دینی کاموں و ذمہ داریوں سے فارغ ہو جائیں تو اب آپ خالص اللہ کی عبادت میں اپنے کو لگا دیجئے، اب کوئی اور مشغولیت نہ ہو، کسی کی جانب دھیان نہ ہو، بلکہ صرف اور صرف عبادت الٰہی میں مصروف ہو جائیں۔ اور ''وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَب'' (اپنے رب ہی کی جانب رغبت کیجئے) کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ اب آپ کو کسی اور کام سے کوئی مطلب نہ ہو، حتی کہ دعوت و تبلیغ، تعلیم و تفہیم وغیرہ سے بھی کوئی مطلب نہ ہو، بلکہ صرف اپنے رب کی جانب توجہ و رغبت کیجئے۔

بلاغت کا ایک قاعدہ

اس آیت میں ایک بات طالب علموں کو سمجھنے کی ہے، یہاں طلبہ بھی موجود ہیں وہ غور کریں، وہ یہ کہ عربی میں اصل یہ ہے کہ پہلے فعل آتا ہے پھر فاعل ومفعول آتے ہیں، پھر اس فعل کے متعلقات آتے ہیں، جیسے ہم کہتے ہیں: " **تَكَلَّمَ زَيْدٌ خَالِداً فِيْ التَّارِيْخِ** "(زید نے خالد سے تاریخ کے بارے میں گفتگو کی) اس میں دیکھو پہلے" **تكلم** "ہے جو کہ فعل ہے، پھر "زید" جو کہ فاعل ہے، اس کے بعد "خالد" آیا ہے، وہ مفعول ہے، اس کے بعد" **في التاريخ** "ہے جو اس فعل کا متعلق ہے۔ لیکن کبھی کسی مصلحت سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ متعلقات فعل کو پہلے اور فعل کو بعد میں لاتے ہیں، جیسا کہ اس آیت میں ہے: "**وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ**" اس میں "فارغب" فعل ہے اور "اِلی ربک" اس فعل کا متعلق ہے، اس لئے اصل تو یوں کہا جاتا کہ: "فارغب اِلی ربک" لیکن اس میں فعل کو بعد میں اور اس کے متعلق کو پہلے لائے، اس میں ایک مصلحت ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے کلام میں حصر پیدا کرنا مقصود ہے۔ لہذا اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ": آپ اپنے رب ہی کی جانب رغبت کیجئے، اور کسی دوسری طرف رغبت نہ کیجئے"۔ اس بات کے پیدا کرنے کے لئے یہ تقدیم و تاخیر کی گئی۔ یہ بھی ایک قاعدہ ہے عربی زبان کا، بلاغت کا، جس کو علماء عربیت و بلاغت یوں تعبیر کرتے ہیں: " تقديم ما حقه التأخير يفيد الحصر" (اس چیز کو مقدم کرنا جس کا حق مؤخر ہونے کا ہے یہ حصر کا فائدہ دیتا ہے) لہذا اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام دنیوی و دینی کاموں سے جلد سے جلد فارغ ہو اور صرف وصرف اللہ کی جانب متوجہ ہو، اسی کی عبادت میں لگ جائے، اور اس وقت کسی اور چیز کی جانب اس کی توجہ و رغبت نہ ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کو واضح فرما دیا ہے کہ مسلمان کی شان کیا ہونی چاہئے، دعوت وتبلیغ والوں کی شان کیا ہونی چاہئے، درس وتدریس والوں کی شان کیا ہونی چاہئے، محققین اور فقہاء کی شان کیا ہونی چاہئے اور مجتہدین کی شان کیا ہونی چاہئے۔

ایک علمی نکتہ

اس آیت میں غور کرنے سے ایک نکتہ یہ بھی سمجھ میں آئے گا کہ آپ ﷺ کا کوئی کام دنیوی نہیں ہوتا تھا، آپ کی ساری مصروفیات دینی ہوتی تھیں، آپ کی صبح بھی دینی، شام بھی دینی، چلنا پھرنا، کہیں آنا جانا، سفر کرنا سب دینی کاموں کے لئے ہوتا تھا، پھر بھی اللہ تعالی نے محمد الرسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا کہ آپ اپنے ان دینی کاموں سے جو کہ عبادت غیر مقصودہ کی قبیل سے ہیں، جلدی فارغ ہو کر اللہ ہی کی طرف رغبت کیجئے اور عبادت مقصودہ یعنی نماز، ذکر وغیرہ میں لگ جایئے۔

جب دینی کاموں ہی سے جلدی فارغ ہو کر عبادت مقصودہ میں لگنے کا حکم ہے تو آپ اندازہ کر لیجئے کہ جو لوگ دنیوی کاموں میں لگے ہوئے ہیں تو ان کے بارے میں کیا حکم ہوگا۔ ارے بھائی! جو دینی چیزیں ہیں انہی میں نہیں، جیسے تدریس ہے، تالیف ہے، تصنیف ہے، تحقیق ہے، مطالعہ ہے،، دعوت ہے، تبلیغ ہے، جب انہیں چیزوں میں مگن نہیں رہنا ہے تو اب سوچ لیجئے جو دین سے تعلق رکھنے والی ہی نہیں ہیں، وہ محض دنیا ہے، ان کے اندر کیسے دماغ لگایا جا سکتا ہے۔

دنیوی چیزیں تین قسم کی ہیں

اب یہ سمجھئے کہ اس کے اندر جو مضمون آیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کو مقصود بنا کر زندگی

گزاری جائے ، دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں، بہت سے حالات ہیں، بہت سے مسائل ہیں، بہت سی ضرورتیں ہیں، بہت سی حاجتیں ہیں،لیکن ان سب میں مقصودِاعظم انسان کے لیے اللہ کی ذات ہے، باقی سب چیزیں ضمنی ہیں۔یاد رکھئے کہ دنیا میں چیزیں تین قسم کی ہوتی ہیں: ایک وہ چیزیں جو اللہ کو پانے کے راستے میں کام آنے والی اور مفید و معین ہیں، جیسے تعلیم ہے ، تعلم ہے، پھر اس سے آگے بڑھیں تو تدریس اور وعظ ہے ، نصیحت ہے، دعوت و تبلیغ ہے ۔ دوسرے وہ چیزیں جو اللہ کے راستے میں حارج اور مانع بننے والی اور اس کے لے مضر و نقصان دہ ہیں، جیسے گناہ کے کام ، اور تیسری وہ چیز ہیں جو اس میں نہ مفید و معین ہیں اور نہ مانع و حارج ، جیسے انسان بہت سارے کام کرتا ہے اور اسے کرنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے، کھانے کی ضرورت ہے، پینے کی ضرورت ہے، کمانے کی ضرورت ہے اور بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کی ضرورت ہے اور مختلف لوگوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے ، تعلقات وابستہ کرنا پڑتا ہے، اور رشتہ داریوں کو نباہنا پڑتا ہے، دوستوں کے ساتھ بھی اٹھنا اور بیٹھنا پڑتا ہے۔

تو ان میں سے جو چیزیں کہ اس راستے میں مانع بننے والی ہیں، حارج بننے والی ہیں، ان سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ ان کاموں سے اللہ نہیں ملے گا اور جو چیزیں ایسی ہیں کہ مانع بھی نہیں اور حارج بھی نہیں وہ فضول اور بیکار ہیں، ان کو اپنی دنیوی ضرورت کے لئے اختیار کرے تو ٹھیک ہے، اور جو چیزیں اللہ کے راستے میں مفید ہیں، معین ہیں، مددگار ہیں، ان کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔

لیکن ان میں بھی اس بات کا خیال و دھیان چاہئے کہ اصل مقصود اللہ کی ذات ہے ، اور یہ دیگر چیزیں اگر چہ کہ اللہ کے راستے میں مفید و معین ہیں مگر ان کا درجہ ثانوی درجہ ہے، ان کو اولین درجہ دینا صحیح نہیں ہے۔

حضرت نبی ﷺ کی ذمہ داریاں

دیکھئے ،حضرت نبی اکرم ﷺ پر بہت ساری دینی و نبوی ذمہ داریاں تھیں: دعوت الی اللہ کی ذمہ داری، تبلیغ احکام کی ذمہ داری، لوگوں کو سمجھانے و افہام و تفہیم کی ذمہ داری، قرآن پڑھانے کی ذمہ داری، جہاد کی ذمہ داری، تعلیم کی ذمہ داری، اصلاح احوال کی ذمہ داری، وغیرہ۔ ان میں بھی سب سے اہم ذمہ داری جس کے لیے نبوت دے کر نبی کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے، وہ ہے دعوت الی اللہ ،لوگوں کو اللہ کا پیغام کو پہنچانا۔ یہ سب سے اہم ذمہ داری ہوتی ہے نبی کی اور یہ بالکل واضح وظاہر ہے کہ یہ سب اعمال دراصل اللہ کی جانب سے آپ پر عائد تھیں اوران کوادا کرنے پر ضرور بالضرور قرب خداوندی بھی نصیب ہوتا ہے ،مگر ان تمام ذمہ داریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ سے کہا ہے کہ اے نبی! جب آپ ان کاموں سے، ان ذمہ داریوں سے فارغ ہوجائیں تو پھر عبادت کے لیے تیار ہوجایئے اور پھر اپنے ہی رب کو دیکھئے، کسی اور کو نہ دیکھئے ، اپنے رب ہی کی طرف توجہ کیجئے، کسی اور کو دھیان میں نہ لایئے، اپنے پروردگار ہی کی جانب رغبت کیجئے، کسی اور طرف رغبت والتفات ہی نہ کیجئے۔ تو اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سبجیکٹ {Subject} کیا ہے؟ اس آیت کا، اس آیت کی تھیم {Theme} کیا ہے؟ اس آیت کا مقصود اعظم کیا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود اس کا یہی ہے کہ اللہ کی ذات کو مقصود بنایا جائے اور دیگر چیزوں کو ثانوی درجہ دیا جائے۔

دینی اعمال کی دو قسمیں

دنیا کے کام تو بہ ہر حال دنیا کے کام ہیں، ان کا تو کیا ذکر! میں کہتا ہوں کہ جو دینی کام و اعمال ہیں، ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک دینی عمل وہ ہے جو مقصود

بالذات ہوتا ہے، دوسرا وہ دینی عمل ہے جو مقصود بالعرض ہوتا ہے، یعنی خود مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ جیسے علماء نے عبادت کی دو قسمیں بتائی ہیں: ایک عبادت مقصودہ، جیسے نماز، روزہ، حج وزکاۃ، اور دوسری عبادت غیر مقصودہ، جیسے وضو، غسل، مسجد میں داخل ہونا، قرآن پاک کو چھونا، وغیرہ، یہ دونوں قسم کے اعمال عبادتیں تو ہیں، لیکن ان کے اندر ایک بڑا فرق ہے کہ ان میں سے ایک عبادتِ مقصودہ ہے، اور دوسری عبادتِ غیر مقصودہ ہے۔

مقصودہ عبادات کی مثال جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ، قربانی، تلاوت، ذکر، یہ سب عبادتیں وہ ہیں جو شریعت میں مقصود بالذات ہیں یعنی بذات خود وہی مقصود ہیں اور کچھ عبادتیں ایسی ہوتی ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہوتیں، بلکہ وہ کسی عبادت مقصودہ کا ذریعہ یا وسیلہ ہونے کی وجہ سے مقصود ہوتی ہیں۔

جیسے مثال کے طور پر وضو عبادت ہے، بہت بڑی عبادت ہے، بہت بڑا ثواب ہے اس کا، لیکن اس کے باوجود علماء نے لکھا ہے کہ یہ عبادت غیر مقصود عبادت ہے، یعنی خود وضو کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ وضو کا مقصود یہ ہے کہ وضو کرنے کے بعد نماز پڑھ لیں، وضو کرنے کے بعد ذکر کر لیں، وضو کرنے کے بعد تلاوت کر لیں، وضو کرنے کے بعد کوئی اور عبادت کر لیں۔ دیگر عبادات مقصودہ کے لیے اس کو وسیلہ اور ذریعہ قرار دیا گیا ہے، وضو بالذات کوئی عبادت نہیں ہے، بلکہ بالتبع و بالعرض عبادت ہے۔

اسی طریقے سے ہمارے اعمال کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک اعمال مقصودہ، ایک اعمال غیر مقصودہ۔ اعمال مقصودہ میں عبادات نماز روزہ، زکاۃ وحج، اوراذکار وغیرہ ہیں، یہ سب اعمال اسلام میں بذات خود مقصود ہیں۔

اور کچھ اعمال ایسے ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہیں، جیسے درس وتدریس خود مقصود نہیں ہے، تصنیف وتالیف خود مقصود نہیں ہے، دعوت وتبلیغ خود مقصود نہیں ہے،

بلکہ یہ سب ایک مقصود کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، مقصود کیا ہے؟ دین وعلم دین کی حفاظت اور دوسرے لوگوں کو دین پر جما دینا وغیرہ ہے، اس کے لیے یہ درس وتدریس ووعظ و نصیحت، تقریر وتحریر، تصنیف وتالیف وغیرہ واسطہ ہیں، ذریعہ ہیں، وسیلہ ہیں۔

غیر مقصود کو مقصود کا درجہ دینا بدعت ہے

بھائیو! جب آپ نے اعمال مقصودہ اور غیر مقصودہ کو سمجھ لیا تو اب ان کے بارے میں ایک اصول سمجھ لیجئے۔ وہ یہ کہ غیر مقصود عبادت کو مقصود عبادت کا درجہ دے دینا بدعت اور مکروہ ہے۔ آپ کہیں گے دلیل کیا ہے؟ ہمارے لیے بہت بڑی دلیل حضرات فقہاء کا کلام ہے، اس لیے کہ حضرات فقہاء دین کو زیادہ سمجھتے ہیں، حضرات فقہاء کو اللہ تعالیٰ تفقہ فی الدین سے نوازتا ہے، اس وجہ سے ان کی بات ہمارے لیے کافی ہے۔

چنانچہ فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ وضو کرنے کے بعد کسی عبادت مقصودہ کے انجام دیئے بغیر دوبارہ وضو کرنا بدعت اور مکروہ ہے۔ آپ وضو کر کے آئے، نماز نہیں پڑھی، ذکر بھی نہیں کیا، تلاوت بھی نہیں کیا، کوئی عبادت نہیں کی، پھر چلے گئے وضو کرنے کے لیے، پھر جی چاہا کہ چلو ایک دفعہ اور وضو کریں، بہت بڑا ثواب ہے، اس سے گناہ بھی جھڑ جاتے ہیں، اس لیے ایک دفعہ اور کرلو تو فقہاء لکھتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے، بدعت ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ وضو مقصودہ عبادت نہیں ہے، اور غیر مقصود عبادت کو مقصود عبادت کا درجہ دے دینا بدعت ہے۔

حاشیہ: (قال الإمام البغوی ناقلا عن الإمام أحمد في شرح السنة : " و تجدید الوضو مستحب إذا کان قد صلی بالوضوء الأول صلاة و کرهه قوم إذا لم یکن قد صلی بالوضوء الأول صلاة فرضا أو نفلا " (شرح السنة: ٤٤٩/١، مرقاة المفاتیح: ٢٢٥/٢، رد المحتار شامی: ١٢٩/١)

اب یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس طرح عبادت غیر مقصودہ کو عبادت مقصودہ کا درجہ دینا بدعت ومکروہ ہے، اسی طرح اعمال غیر مقصودہ کو اعمال مقصودہ کا درجہ دے دینا بھی بدعت ہے، اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اعمال غیر مقصودہ ہی کے پیچھے پڑ جائے کہ اسی کو بار بار کرنے لگے اور اعمال غیر مقصودہ میں اس قدر مصروف ہو جائے کہ اسے اعمال مقصودہ کو انجام دینے کا موقعہ ہی نہ ملتا ہو یا وہ خود ان کو اس اہتمام سے نہ ادا کرتا ہو، اور غیر مقصود اعمال کو ہی سب کچھ سمجھتا ہو تو یہ بھی ایک بدعت ہے، بلکہ شیطان کا بہت بڑا دھوکہ ہے کیونکہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ آدمی اگر گناہ میں نہیں تو کم از کم اعمال غیر مقصودہ ہی میں لگا رہے، اور اعمال مقصودہ کو ادا نہ کر سکے۔

اس آدمی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی صرف وضو ہی کرتا رہے، اور نماز نہ پڑھتا ہو، ذکر نہ کرتا ہو، تلاوت نہ کرتا ہو۔ اسی طرح جو لوگ اعمال غیر مقصودہ جیسے درس وتدریس، وعظ و بیان، تصنیف وتالیف اور دعوت وتبلیغ میں لگے رہتے ہیں اور نماز وذکر وغیرہ کی طرف دھیان نہیں دیتے یا ان کو اچھی طرح ادا نہیں کرتے وہ بھی یوں سمجھیں کہ صرف وضو پر وضو کر رہے ہیں، اور نماز ہی نہیں پڑھتے۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ اسی فرق کو اور اسی نکتہ کو بتانا چاہتے ہیں کہ اعمال غیر مقصودہ کو ان کے درجہ پر رکھا جائے اور اعمال مقصودہ کو ان کا درجہ دیا جائے۔

اعمال مقصودہ کا درجہ بدلنے کا انجام

آج افسوس ہے کہ امت کا ایک طبقہ جہالت کی وجہ سے اعمال مقصودہ اور غیر مقصودہ میں فرق نہیں کر پاتا، اور ایک دوسرا طبقہ ہے جو اس کو جاننے کے باوجود اس کی طرف توجہ نہیں کرتا اور شیطانی دھوکہ میں پھنس جاتا ہے۔

اس صورت حال کا انجام ونتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال مقصودہ کو نہ صحیح طریقے پر ادا

کرتا ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے؛ کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو مقصود بناتا و سمجھتا ہے تو اس کا ایک اثر ہوتا ہے دماغ پر، دل پر اور اسی کے ساتھ جذبات اور خیالات پر کہ آدمی اس کام کو عمدہ طریقہ پر، پوری دلجمعی کے ساتھ ادا کرتا ہے، اور اس کام کو ادا کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ دوسرے تمام کاموں سے جلدی جلدی فارغ ہو جائے اور پھر اس اصل و مقصود کام میں لگ جائے۔

اور اگر خدانخواستہ معاملہ الٹا ہو کہ مقصود کام کو غیر مقصود سمجھ لیا مثلاً مقصود ہے اللہ کو پانا، ایک آدمی نے اس کے خلاف درس و تدریس کو اپنی زندگی کا مقصود بنالیا، تو اب وہ کیا کرے گا؟ نماز جلدی جلدی سے پڑھے گا، اور درس و تدریس کے لیے تیاری کرے گا، ایک آدمی تصنیف و تالیف کو مقصود بنالیا کہ میری زندگی کا مقصود ہے تصنیف و تالیف، تو اب اسے نماز میں مزہ نہیں آئے گا، توجہ نہیں رہے گی، دل اس میں نہیں لگے گا، دل کہے گا جلدی جلدی نماز پڑھو، یہ کہاں کی مصیبت ہے، جلدی یہاں سے نمٹو اور جاکر اپنا وہ کام کرو، اور پھر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جائے گا، کیوں؟ یہ سب دراصل اسی خیال کا اثر ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل کو اصل اور غیر اصل کو غیر اصل سمجھنا چاہئے، اگر اس کا الٹا ہوا تو نتائج غلط سامنے آئیں گے۔

خواص بھی غلطی میں مبتلا

مگر افسوس کہ اس مسئلہ میں عوام تو عوام خواص بھی غلطی میں مبتلا ہیں، اور عام طور پر اس میں غلطی ہو رہی ہے اور مقصود کو غیر مقصود، غیر مقصود کو مقصود بنا لینے کی وجہ سے جو مقصود چیز ہے، اس کو تو جلدی جلدی نمٹاتے ہیں اور اپنے دوسرے کاموں کے اندر مشغول ہو جاتے ہیں۔ جو عوام ہیں وہ تو مقصود حیات نماز وغیرہ کو ٹال کر دنیا کے کاموں میں لگ جاتے ہیں، تجارت میں، بیوی بچوں میں وغیرہ، اور جو حضرات

خواص علماء وطلبہ ہیں وہ بھی مقصود عبادات کو جلدی جلدی ادا کر کے درس وتدریس و تقریر وتحریر، دعوت وتبلیغ وغیرہ میں لگ جاتے ہیں۔

چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

مثلاً ایک صاحب کسی جامعہ ومدرسہ میں استاذ ومدرس ہیں، وہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے درس بڑا شاندار دینا ہے، اس کے لیے بہت مطالعہ کرنا ہے اور اس میں یہ رموز اور اسرار منکشف کرنا ہے، یا عجیب وغریب تحقیقات سامنے لانا ہے، محیر العقول باتیں پیش کرنا ہے اور یہی میری زندگی کا اصل کام ہے، مقصود حیات ہے۔ جب ان کے دماغ میں یہ سما گیا تو اب ان کو کہاں مزہ آئے گا نماز پڑھنے میں، ان کا دل کہے گا نماز جلدی سے پڑھو، الٹی سیدھی نمٹاؤ، سجدہ کرو جلدی سے، رکوع کرو جلدی سے، تلاوت کرو جلدی سے، تمام ارکان کو جلدی سے ادا کرو، اور پھر اپنے اصل کام ومقصود کام کے اندر لگ جاؤ۔ کیوں ایسا ہوا؟ اس لیے ہوا کہ انھوں نے اسکو مقصود سمجھا جس کو غیر مقصود سمجھنا چاہئے۔

دوسری مثال لیجئے کہ ایک طالب علم نماز کو جلدی جلدی نمٹا تا ہے، رکوع اور سجدے تو بس مرغی کی ٹھونگ کی طرح ادا ہو رہے ہیں؛ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دماغ میں سمایا ہے کہ اصل کام اس کا یہ ہے کہ اسے تکرار کرنا ہے، سبق یاد کرنا ہے، بڑا عالم بننا ہے، اور عربی ادب میں مہارت پیدا کرنا ہے، فقہ وحدیث کا ماہر بننا ہے، اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ اس خیال کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اس کو نماز میں ذکر میں، تلاوت میں، کوئی لطف نہیں آتا، بلکہ وہ نماز کو بھی بس سر سے ٹلانے پڑھتا ہے، دل سے نہیں پڑھتا۔

حالانکہ غور کیجئے کہ مدرسہ اس لئے کھولا گیا تھا تاکہ طلبہ خشوع خضوع والی نماز سیکھیں، عالم اس لئے بنایا جا رہا تھا کہ وہ ذاکر بنے، ورنہ تو لغت کا عالم بنانا مقصود

نہیں تھا، بالفاظ دیگر اسے عارف بنانا مقصود تھا، اس لئے عالم بنایا جارہا تھا، اور یہ طالب علم ہے کہ اسی علم میں اٹک کر رہ گیا، آگے جو مقصود تھا وہاں تک پہونچا ہی نہیں اس کی وجہ بھی وہی ہے کہ مقصود اور غیر مقصود کی تمیز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور مثال عوام کے اعتبار سے سن لیجئے کہ آج کل عموماً اور اہل بنگلور میں خصوصاً ایک بہت بڑی بیماری یہ چل رہی ہے کہ لوگ صرف بیانات سننے لگے ہیں، آج کسی کا بیان ہے تو کل کسی کا بیان ہے، صبح کسی کا بیان ہے تو شام میں کسی کا بیان ہے اور لوگوں کو بیان سننے کے علاوہ آگے کچھ عملی اقدام کرنا ہی نہیں ہے۔

اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ بیان جو کہ غیر مقصود عبادت ہے، اسے مقصودہ کا درجہ دے دیا گیا اور اس میں ایسا لگ گئے کہ مقصودہ اعمال فوت ہورہے ہیں، رات دیر تک جلسوں میں مشغول ہوکر فجر کی نماز ترک ہورہی ہے، مگر اس کا کوئی احساس بھی نہیں، بتاؤ کہ یہ شیطانی دھوکہ نہیں تو اور کیا ہے؟

الغرض اس طرح آپ غور کرتے چلے جائیں تو آپ کو ایسے بہت سے دیندار ملیں گے جو دین کے ان کاموں کو جن کا درجہ اعمال مقصودہ کا نہیں تھا ان میں ایسے منہمک ہوگئے ہیں کہ اعمال مقصودہ کو بھول گئے ہیں۔

یہ ایک عظیم غلطی ہے جو آج کے ماحول میں ہورہی ہے۔ بڑوں سے، چھوٹوں سے اور علماء سے، مفتیوں سے، حدیث پڑھانے والوں سے۔ اللہ حفاظت فرمائے۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے اللہ کو مقصود بنایا

ہمارے اکابرین ایسے تھے درس بھی، تدریس بھی، تبلیغ بھی، دعوت بھی، اور تصنیف بھی، تالیف بھی، تحقیق بھی، مطالعہ بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ اللہ کے لیے اتنا بڑا حصہ کہ ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔

امام اعظم ابوحنیفہ دن بھر درس و تدریس، مسائل کا استنباط اور استخراج، قرآن میں حدیث میں غور و فکر، تدبر و تفکر، فقہ کی ترتیب وغیرہ میں مصروف رہتے اور جب شام ہوتی، عشاء کا وقت ہوتا، لوگ عشاء پڑھ کر چلے جاتے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نماز کے لئے رکعت باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور یہ رکعتوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، یہاں تک کہ فجر کا وقت ہو جاتا تھا۔

شروع شروع میں سو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن کہیں جا رہے تھے، راستہ میں ایک شخص نے ایک اپنے ساتھی سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کو دکھا کر آہستہ سے کہا کہ یہ جو بزرگ جا رہے ہیں، یہ روزانہ پانچ سو رکعت پڑھا کرتے ہیں۔ وہ تو آہستہ سے کہہ رہا تھا لیکن امام صاحب کے کانوں میں اس کی آواز پہنچ گئی۔ امام صاحب نے کہا کہ اللہ اکبر! یہ میرے بارے میں یہ خیال رکھتا ہے کہ میں پانچ سو رکعت روزانہ پڑھتا ہوں جب کہ میں صرف سو ہی رکعت پڑھتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں قرآن کی اس آیت کا مصداق بن جاؤں: ﴿وَيُحِبُّوْنَ أَنْ يُحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا﴾ (اور وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسی بات پر جو انھوں نے نہیں کی)

اگر میں اس کا مصداق بن جاؤں تو کیا ہوگا؟ جہنم کی سزا ہوگی۔ امام صاحب نے کہا کہ لوگ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں پانچ سو رکعت پڑھا کرتا ہوں تو میں آج سے پانچ سو رکعت پڑھا کروں گا۔ اور اس کے بعد سے آپ کا یہی معمول ہو گیا۔

پھر اس کے بعد ایسا ہی واقعہ ہوا کہ ایک دفعہ جا رہے تھے تو کسی آدمی نے امام ابوحنیفہ کو دکھا کر کہا کہ یہ بزرگ روزانہ ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے ہیں، حالانکہ اس وقت پانچ سو رکعت پڑھتے تھے۔ امام صاحب نے اس کی یہ بات سن لی، اور کہا کہ

اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ہزار رکعات پڑھتا ہوں حالانکہ میں صرف پانچ سو پڑھتا ہوں تو مجھے اللہ کے سامنے جواب دینا ہوگا، اس لیے میں آج سے ہزار رکعت نماز پڑھوں گا۔ اور زندگی بھر یہی معمول رہا، کتابوں کے اندر لکھا ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی ،آپ کی پوری پوری رات عبادت کے اندر گزر جاتی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کا عجیب حال تھا۔ دیکھئے کس طرح اللہ کو مقصود بنا کر زندگی گذاری جاتی ہے۔ لہذا پڑھو، لکھو، تحقیق کرو، مطالعہ کرو، اور لوگوں کے لیے نیک کام کرو، ہمدردی اور غمخواری کے کام بھی کرو، دعوت وتبلیغ کے کام بھی کرو، لوگوں کو نصیحت کرو، عبرت کی باتیں بتاؤ، اللہ کی طرف ان کو متوجہ کرو، لیکن ان ساری چیزوں کے ساتھ کبھی اس کو نہ بھولو کہ میں پیدا ہی ہوا ہوں اپنے رب کے لیے۔ وہی مقصود ہے، وہی مطلوب۔

امام اوزاعی کی عبادت کا تذکرہ

حضرت امام اوزاعی بہت بڑے عالم تھے، مجتہد تھے اور ان کا بھی مسلک بہت زمانے تک دنیا میں چلتا رہا تھا، جیسے امام ابوحنیفہ کا، امام شافعی کا، امام مالک کا، امام احمد بن حنبل کا مسلک آج چل رہا ہے۔ اسی طرح امام اوزاعی رحمۃ اللہ کا بھی مسلک چلتا تھا، لیکن جب ائمہ اربعہ کا مسلک بہت آگے بڑھ گیا، لوگوں کے اندر اس کو مقبولیت ہوگئی تو پھر دوسرے ائمہ کے ماننے والے ختم ہوگئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی بہت بڑے مجتہد وامام تھے۔

ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ فجر کے بعد ان کے گھر پر پڑوس کی ایک

عورت آئی، امام اوزاعی گھر میں موجود نہیں تھے، چھوٹا سا گھر تھا، ایک طرف مصلی بچھا ہوا تھا، ایک طرف حضرت کی اہلیہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ عورت آکران کے بازو بیٹھ گئی اور کچھ باتیں کرنے لگی، اتنے میں اس کی نظر مصلی پر پڑی تو وہ عورت حضرت کی اہلیہ سے کہنے لگی: اماں جان! یہ دیکھئے، مصلی بھیگا ہوا ہے، اس پر کسی بچے نے پیشاب کر دیا ہوگا۔

حضرت کی اہلیہ نے کہا کہ ہمارے یہاں تو کوئی بچہ ہے نہیں، ہم بوڑھا بوڑھی دو ہی آدمی یہاں رہتے ہیں، ہمارے یہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔ اس عورت نے کہا کہ: اگر بچہ نہیں ہے تو پھر پانی پڑ گیا ہوگا، یہ دیکھئے مصلی بھیگا ہوا ہے، تو حضرت کی اہلیہ نے مصلی پر اپنا ہاتھ پھیرا تو اس کے اوپر نمی تھی، یہ دیکھ کر کہا کہ یہ نہ پیشاب کی نمی ہے نہ ہی پانی کی نمی ہے، بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے حضرت پوری رات اس مصلی پر روتے رہتے ہیں، وہ تری ان کے آنسوؤں کی وجہ سے ہے جو تم کو نظر آ رہی ہے۔

حضرت مرۃ ہمدانی کی عبادت

اسی طرح حضرت مرہ بن شرحبیل ہمدانی بہت بڑے عالم گزرے ہیں، تابعی ہیں، قرآن کی تفسیر میں ان کا ذکر کثرت کے ساتھ آتا ہے، ان کی عبادت وریاضت کے بارے میں بہت سے عجیب باتیں منقول ہیں، حضرت حارث الغنوی کہتے ہیں کہ انھوں نے ایسا سجدہ کیا کہ زمین کی مٹی ان کی پیشانی کو کھا گئی۔ روزانہ چھ سو یا ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے، حضرت علاء بن عبدالکریم کہتے ہیں کہ ہم ان کی خدمت میں آتے تو ان کے چہرے اور ہاتھ پیر پر سجدے کا اثر نظر آتا، وہ کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھتے پھر کھڑے ہو جاتے اور بس نماز پڑھتے رہتے۔ (سیر اعلام النبلاء:۴/۷۵، حلیۃ الاولیاء:۴/۱۶۵)

محمد بن کعب قرظی کا ذکرِ خیر

ایک بزرگ محمد بن کعب القرظی کا ذکر بھی سنتے چلئے ، وہ بھی بہت بڑے عالم تھے، تابعی تھے، بہت سے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا، بہت متقی واللہ والے تھے، انکی عبادت وآہ وبکا کا حال یہ تھا کہ رات بھر عبادت وریاضت کے ساتھ روتے رہتے تھے، بڑے بے چین ومضطرب نظر آتے تھے، ان کی والدہ نے ایک باران سے کہا کہ بیٹا! اگر میں نے بچپن سے اب تک تجھے نیک و پرہیز گار نہ دیکھتی تو تیرا یہ رونا دھونا دیکھ کر کہتی کہ کوئی بڑا گناہ تجھ سے ہوگیا ہے، اس لئے تو ایسا روتا ہے۔ اس پر حضرت محمد بن کعب نے کہا کہ اے اماں! ہوسکتا ہے کہ اللہ نے مجھے اس وقت دیکھ لیا ہو جبکہ میں کسی گناہ میں مبتلا تھا اور وہ مجھ سے یوں کہہ سکتا ہے کہ جا میں تیری مغفرت نہیں کروں گا۔ (صفۃ الصفوۃ:۱۳۲/۲، سیر اعلام النبلاء:۶۵/۵)

بھائیو! یہ تھے ہمارے اسلاف، جو ایک طرف علم کا پہاڑ وسمندر تھے اور علم کی نشر واشاعت ودعوت وتبلیغ، درس وتدریس میں لگے ہوئے تھے تو دوسری جانب ان کی راتیں ایسی ہوتی تھیں، عبادت وریاضت کا یہ حال تھا۔ اسی لئے امام شافعی کا قول کئی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ میں علماء کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ایک وقت اپنا محض اللہ کے لیے خاص کر کے رکھیں: "والی ربك فارغب" والا معاملہ ہے۔

عالم کا کردار حضرت ابن مسعودؓ کی نظر میں

اسی لیے حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ نے عالم کا کردار کیا ہونا چاہئے اس کے بارے میں فرمایا تھا:

" ینبغي لقارئ القرآن أن یعرف بلیله إذا الناس نائمون ، وبنهاره إذاالناس مستیقظون ، وببکائه إذا الناس یضحکون ، وبصمته إذا الناس

یخوضون ، وبخضوعه إذا الناس یختالون ، وبحزنه إذا الناس یفرحون"
(قاری یعنی عالم قرآن کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنی رات سے پہچانا جائے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں، اور اپنے دن سے پہچانا جائے جب کہ لوگ بیدار ہوں، اور اپنے رونے سے پہچانا جائے جب کہ لوگ ہنس رہے ہوں اور اپنی خاموشی سے پہچانا جائے جب کہ لوگ بحثا بحثی کر رہے ہوں اور اپنی تواضع سے پہچانا جائے جب کہ لوگ ڈینگیں مار رہے ہوں اور اپنے غم سے پہچانا جائے جب کہ لوگ خوشیاں منا رہے ہوں)(مقدمہ تفسیر قرطبی)

اس میں حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ قارئ قرآن کے لیے، عالم دین کے لیے، دین کو سمجھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ رات اس طرح گزارے کہ رات سے اس کی پہچان ہو، جب ساری دنیا سو رہی ہو تو یہ اٹھ کر پڑھ رہا ہو، بیدار رہ کر اللہ کو پکار رہا ہو، نماز پڑھ رہا ہو، دعا مانگ رہا ہو، اللہ کے سامنے گڑگڑا رہا ہو۔

یہ اس کی ادا ہونی چاہئے۔ آج لوگ اسکو بھول گئے، اس سے بالکل غافل ہو گئے، عوام بھی بھول گئے، علماء بھی بھول گئے، طلبہ بھی بھول گئے، مدرسین بھی بھول گئے، ان کو یاد ہی نہیں رہا کہ یہ بھی کوئی سبجکٹ Subject ہے ہماری زندگی کا، جو ہمارے لیے انتہائی ضروری ہے، بلکہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔

کوشش کر کے تو دیکھو

آج لوگ کہتے ہیں کہ بڑوں کی اتباع کرنا اور ان کے نقش قدم پر چلنا، اللہ کو مقصود بنا کر زندگی گذارنا مشکل ہے، نماز کو پوری توجہ سے پڑھنا مشکل ہے۔

ہم صرف کہتے ہیں، کوشش نہیں کرتے، کوشش کریں تو ضرور ہو سکتا ہے۔
دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ جو حضرت تھانویؒ کے

استاذ ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے ناظم تعلیمات تھے، صدر المدرس بھی تھے۔ وہ درس دے رہے تھے، دوران درس جب یہ حدیث آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "**من توضأ وضوئي هذا ثم يصلي ركعتين لا يحدث فيهما بشيء إلا غفر له ما تقدم من ذنبه**" (جو آدمی میرے وضو کی طرح وضو کرے پھر ایسی دو رکعتیں پڑھے جس کے اندر کوئی وسوسہ، کوئی خیال نہ آئے تو اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں) (بخاری:۱۹۳۴، مسلم: مشکاۃ:۲۸۷)

حضرت مولانا یعقوب صاحب نے اس کی تشریح فرماتے ہوئے کہا کہ ایسی نماز پڑھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ تو ایک طالب علم نے اٹھ کر پوچھا کہ حضرت! ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ ہم بغیر وسوسے کے نماز پڑھیں؟ تو اس پر حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ پوچھتے ہی رہو گے یا کبھی کرو گے بھی۔

اس کے بعد کہا کہ کر کے دیکھو کیوں نہیں ہوتا، اگر نہ ہونے والی بات ہوتی تو اللہ کے نبی ﷺ کیوں کہتے، کیا اللہ کے نبی ﷺ نہ کی جانے والی بات بتانے کے لیے آئے تھے؟ معلوم ہوا کہ انسان میں اسکی طاقت ہے، اسی لیے اللہ کے نبی نے فرمایا۔

لہذا کوشش کرنا ہمارے ذمہ ہے، محنت کرنا ہمارے ذمہ ہے، جب مجاہدہ کریں گے تو اللہ تعالی راہیں کھولیں گے۔ آج ہمارا حال یہ ہو گیا کہ ہم دنیا کے لئے تو بہت مجاہدہ کرتے ہیں، لیکن اللہ کو مقصود زندگی بنانے کے لئے مجاہدہ نہیں کرتے۔

کیا دنیا مقصود زندگی ہے کہ جس کے لئے ہم مجاہدہ کریں، کیا اللہ کی ذات غیر مقصود ہے؟ کیا بیوی بچے مقصودِ زندگی ہیں؟ کیا کھانا پینا مقصودِ زندگی ہے؟ کیا تجارت اور منڈیاں مقصودِ زندگی ہیں؟ کیا درس وتدریس مقصودِ زندگی ہے؟ تصنیف وتالیف مقصود زندگی ہے؟ نہیں ہر گز نہیں، مومن کا مقصود زندگی اللہ کی ذات ہے۔

یہی ہے آیت کا مقصود اور مطلوب جس کو میں سمجھانا چاہتا ہوں کہ اپنے تمام کاموں میں تفریق کریں، تقسیم کریں کہ کون سا کام محض دنیا کا ہے اور کون سا کام مقصود بالغیر ہے اور کونسا کام مقصود بالذات ہے، ان کے بارے میں اسی کے جیسا معاملہ کریں جیسے کہ ان کے ساتھ معاملہ ہونا چاہئے۔ اگر معاملہ ایسا نہیں ہو رہا ہے تو بھائی! ہم غلطی میں ہیں، اللہ کی اس آیت کی خلاف ورزی میں مبتلا ہیں۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالی ہم سب کو اللہ ہی کو مقصود زندگی بنا کر زندگی گذارنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

نماز کو نماز کیسے بنائیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز کو نماز کیسے بنائیں

نشانِ سجود تیری جبیں پر ہوا تو کیا
کوئی ایسا سجدہ کر کہ زمیں پر نشاں رہے

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . أما بعد

فقد قال اللّٰہ تعالی فی القرآن الکریم

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَاءِ وَالۡمُنۡکَرِ وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ أَکۡبَرُ﴾

(العنکبوت:۴۵)

محترم دینی بھائیو!

عبادتوں میں سب سے اہم ترین عبادت نماز ہے، مگر آج اس کے اندر بڑی کمی وکوتاہی آ گئی ہے، حالانکہ نماز ہی کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں، اور ہم نماز کے علاوہ سارے کام کر رہے ہیں، تو اس کی مثال ایسی ہوئی کہ کسی آدمی کو ایک اسکول میں ٹیچر واستاذ کے عہدے پر مقرر کیا گیا لیکن وہ سارے اپنے دھندے کرتا ہے، سوائے ٹیچری کے۔ آپ بتائیے کہ اسے تنخواہ ملے گی؟ اور اسکو برداشت کیا جائے گا؟ اسی طرح ایک آدمی کو ایک فیکٹری میں اس لئے لیا گیا کہ فیکٹری میں کچھ چیزیں بنانے کی

ہوتی ہیں تو اس سلسلے میں کام کرے اور وہ آدمی ہے کہ سب کچھ کرتا ہے لیکن وہ کام نہیں کرتا جس کے لئے اسے مقرر کیا گیا ہے۔

آج ہم لوگوں کا ایسا ہی حال ہو گیا ہے کہ ہم پیدا ہی کئے گئے اس لئے کہ ہم اللہ کی عبادت کریں اور عبادت میں سب سے اہم ترین عبادت نماز ہے، لیکن ہم وہی عمل کرنا نہیں چاہتے۔ہم کھانا چاہتے ہیں، پینا چاہتے ہیں، رہنا چاہتے ہیں، آرام و آسائش چاہتے ہیں، دنیا کی سب چیزیں کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن جس کے لئے پیدا کئے گئے اسی کے لئے تیار نہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہم سب بڑی غفلت میں مبتلا ہیں۔

بدترین چور

نماز کے بارے میں ایک تو وہ لوگ ہیں جو نماز ہی نہیں پڑھتے۔دوسرے وہ جو نماز تو پڑھتے ہیں لیکن نماز کو نماز کے جیسا نہیں پڑھتے، حالانکہ نماز کو نماز کے جیسا پڑھنا چاہئے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’ أسرق الناس سرقاً الذی یسرق من صلاته ‘‘ (لوگوں میں بدترین قسم کا چور وہ ہے جو نماز میں چوری کرتا ہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ نماز میں چوری کیسے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں چوری یہ ہے کہ اس کا رکوع وسجدہ ٹھیک نہ ہو۔(المعجم الکبیر للطبرانی :۳۵۲۳، مجمع الزوائد :۲۷۲۲)

ایک حدیث میں فرمایا مرغی جیسا ٹھونگ مارتی ہے ایسا سجدہ نہ کرو یہ اللہ کو اور اللہ کے نبی ﷺ کو سخت ناپسند ہے۔(معجم الأوسط للطبرانی:٦١٦٠)

ایک آدمی ایک کام کرے لیکن اس طرح نہ کرے جیسے کہ کرنا چاہئے تو اس کام کا

کوئی اعتبار نہیں ہوا کرتا، دنیا کا کوئی بھی کام ہو جب اس کے اصول وقوانین، اس کے قواعد وضوابط اور اس کے لوازمات اور اسکے طور وطریقے اور مالہ وماعلیہ کے ساتھ اس کام کو کیا جاتا ہے تو تب سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام ادا ہو گیا اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام نہیں ہوا۔

اسی سے آپ سمجھ لیجئے کہ نماز کو نماز کے اصول وقوانین کے مطابق نہ پڑھے تو وہ نماز نماز نہیں ہے۔قرآن کریم کے اندر اللہ تعالی نے نماز کے کچھ آثار اور نماز پر مرتب ہونے والے ثمرات کو بیان کیا ہے، اسی طرح قرآن وحدیث میں غور کرنے سے ہمیں نماز کو نماز بنانے اور نماز میں خشوع خضوع پیدا کرنے کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔اس لئے میں نے ارداہ کیا کہ آپ کے سامنے نماز کے بارے میں کچھ اہم اہم چیزیں بیان کی جائیں جس سے کہ ہم اپنی نماز کو نماز بنانے میں کامیاب ہو سکیں اور اگر کامیاب نہ بھی ہوئے تو کوشش ضرور کریں اور کوشش کرنا ہی دراصل کامیابی ہے۔

لیکن اس وقت میرا مقصود نماز کے فقہی مسائل اور نماز کے سنن ومستحبات اور فرائض وواجبات کو ذکر کرنا نہیں ہے، بلکہ نماز کی کیفیات اور احوال کو بیان کرنا ہے۔

معروف اور منکر کے معنی

میں نے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَر﴾ (بلاشبہ نماز روکتی ہے، فحش وبے حیائی کے کاموں سے اور منکر یعنی غلط چیز سے)

شریعت میں منکر ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو غلط ہو اور شریعت کے اندر اس کا کوئی جواز نہ ہو، ایسی چیز کا نام شریعت میں منکر ہے اور جو چیز شریعت میں جائز ہے اور

شریعت نے اس کو مشروع کیا ہے، اس کا نام شریعت میں معروف ہے۔

منکر اور معروف کے لغوی معنی دیکھنے کے بعد پھر قرآن میں اسے جس معنی کے لئے استعمال کیا ہے، اس پر غور کرینگے تو واقعی قرآن کریم کی بلاغت کا اندازہ ہوگا۔

عربی زبان میں معروف کے معنی آتے ہیں مشہور کے، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں صاحب بڑے معروف ہیں، تو جو جانا جائے، پہچانا جائے، سب لوگ جانتے ہوں، اس کو کہتے ہیں معروف۔ تو شریعت نے نیکی کا نام معروف رکھ کر یہ بتایا ہے کہ اسلامی معاشرے کے اندر نیکی جانی و پہچانی چیز ہوا کرتی ہے، انجانی کوئی چیز نہیں ہوا کرتی۔ اسی لئے اسلامی معاشرے میں نیکی معروف ہوتی ہے، مشہور ہوتی ہے۔

لیکن آج ہمارے معاشرے میں نیکی، معروف اور جانی پہچانی چیز ہونے کے بجائے انجانی چیز ہوگئی ہے، کہیں کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے تو لوگ اس کو عجیب نظر سے دیکھیں گے، گویا کہ نہ کرنے کی کوئی چیز کر رہا ہو، اور اگر سگریٹ پھونک رہا ہے تو کوئی نہیں دیکھے گا، ننگا پھر رہا ہے، اسے کوئی نہیں دیکھے گا، اس لئے کہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کوئی اسے معیوب نہیں سمجھے گا۔

لیکن اگر آپ اسٹیشن میں نماز پڑھنے لگیں تو غیر تو غیر اپنے بھی کچھ انجانی نگاہوں سے دیکھیں گے، کیا مطلب ہوا؟ آج ہمارے معاشرے کے اندر معروف چیز معروف نہ رہی حالانکہ وہ تو جانی و پہچانی چیز ہے۔

اور منکر کے معنی آتے ہیں انجانی، جس کو پہچانا نہ جاتا ہو، پتہ نہ ہو کہ کیا چیز ہے؟ اسکا نام ہے اصطلاح شریعت میں منکر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برائی مسلمان معاشرے میں ایک انجانی چیز ہوتی ہے، اس کو کوئی پہچانتا نہیں کہ کیا ہے؟ شراب کو مسلمان نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے؟ جھوٹ وغیبت کو مسلمان سمجھتا ہی نہیں کہ یہ کیا ہے؟

اس لئے کہ اسلامی معاشرے میں اس کا رواج نہیں ہوتا۔

اس میں اللہ نے بتا دیا ہے کہ اسلامی معاشرے میں نیکی تو معروف ہوتی ہے اس لئے اس کا چلن اسلامی معاشرے میں ضرور ہونا چاہئے اور جو چیز غلط و حرام و ناجائز ہے وہ منکر ہے اس لئے اسلامی معاشرے میں یہ انجانی ہونی چاہئے اور لازمی طور پر اس کا چلن بھی معاشرے میں نہ ہونا چاہئے۔

نماز ہمیں برائیوں سے کیوں نہیں روکتی؟

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ﴾ (بلاشبہ نماز روکتی ہے، فحش و بے حیائی کے کاموں سے اور منکر یعنی غلط چیز سے) اس سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے کے بعد نماز کا یہ اثر مرتب ہونا چاہئے کہ نماز نمازی کو برائیوں سے روکے، ورنہ وہ نماز جب بے حیائی و منکر سے نہیں روکتی تو اللہ تعالیٰ نے یہ کیسے فرما دیا کہ نماز ان سے روکتی ہے؟

یہاں پر ایک سوال علماء نے کھڑا کیا ہے کہ جب نماز ہر فحش و برائی سے روکتی ہے، زنا سے، چوری سے، ڈکیتی سے، جھوٹ سے، دھوکہ بازی سے، غیبت سے، چغلی سے، ظلم زبردستی سے، تو اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ نماز پڑھ رہے ہیں، لیکن جھوٹ بھی بول رہے ہیں، غیبت بھی ان سے جاری ہے، دوسروں کا مال بھی لوٹ رہے ہیں، غصب بھی کر رہے ہیں، حرام کاموں میں بھی مبتلا ہیں، یہ سب ناجائز کام کر رہے ہیں، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ نماز روکتی تو ہے، لیکن لوگ رکتے نہیں، تو اس سے آیت پر کیا اشکال؟ اللہ نے یہ تو نہیں کہا کہ تم رک بھی جاؤ گے۔ نماز ایسی چیز ہے جو روکتی ہے، جیسے مولانا حضرات بہت سے برے کاموں سے روکتے

ہیں، کہ برائی نہ کرو، حرام نہ کرو، لیکن لوگ سن کر نہ مانیں اور الٹا سیدھا کرتے رہیں تو مولانا پر کیا اشکال واعتراض؟

دوسرا جواب جو بہت عمدہ وحقیقت کشا ہے، یہ ہے کہ آیت کا منشأ یہ بتانا ہے کہ نماز اگر واقعی نماز ہو تو بیشک اس کا اثر یہ مرتب ہوگا کہ آدمی واقعی گناہ سے بچنا شروع کردے گا، لیکن نماز کو پہلے نماز تو بنانا چاہئے، نماز حقیقت میں نماز ہو، اس کے اندر وہ کمال، وہ خشوع، وہ خضوع ہو، اور اخلاص ہو، جب اس طرح نماز پڑھی جائے گی تو اس کا اثر یہی ہوگا کہ جب آدمی برائی کی طرف جانا چاہے گا تو اس کے سامنے نماز آئے گی کہ ابھی تو نماز پڑھ کے آیا ہے، کیا حرکت کرنے جارہا ہے؟ تو یہ آدمی فوراً برائی سے رک جائے گا۔ اس تقریر سے اس سوال کا جواب سامنے آگیا کہ ہماری نماز ہمیں کیوں برائی سے باز نہیں رکھتی؟ معلوم ہوا کہ دراصل ہماری نماز نماز ہی نہیں ہوئی ہے، اگر نماز نماز ہوجائے تو اس کا یہ اثر ضرور مرتب وظاہر ہوگا۔

ایک عبرت ناک حدیث

اور نماز کا یہ اثر مرتب ہونا نماز کے نماز ہونے کی علامت ہے، اور اگر یہ اثر اس کا نہ مرتب ہو تو اس پر حدیث میں وعید آئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت بنی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

”مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْفَحْشَاءِ لَمْ يَزْدَدْ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا بُعْداً“

(جس آدمی کی نماز اسے برائی وبے حیائی سے نہ روکے تو اس کی یہ نماز اللہ سے دوری میں اضافہ کا ذریعہ ہوگی) (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۸۶۲)

معلوم ہوا کہ نماز کے نماز ہونے کی پہچان اور علامت یہی ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے، اگر نماز برائیوں سے نہ روکے تو وہ نماز نہیں بلکہ اللہ سے بعد ودوری کا

ذریعہ ہے، جب آدمی واقعی نیکیوں پر چلنے لگتا ہے اور نماز کو واقعی طور پر پڑھتا ہے، اس میں اخلاص وللّٰہیت کا، خشوع وخضوع کا اور دلجمعی کا لحاظ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کی حالت پلٹ دیتے ہیں، برا انسان بھی اچھا ہو جاتا ہے، اس کی برائیاں چھوٹنے لگتی ہیں، اس میں روز بروز سدھار و نکھار آتا جاتا ہے۔

نماز برائیوں سے کیسے روکتی ہے، ایک چور کا واقعہ

میرے شیخ ومرشد حضرت مسیح الامتؒ نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ کسی زمانے میں ایک چور تھا، وہ ایک بادشاہ کے محل میں چوری کرنے کے ارادے سے گیا، رات کا وقت تھا اور محل کے ایک کمرے سے بادشاہ اور اس کی بیوی کی گفتگو کی آواز آرہی تھی، وہ کھڑے ہو کر سننے لگا، اگرچہ ایسا سننا ناجائز ہے، حرام ہے، چوری ہے، لیکن چور چوری ہی کرنے آیا تھا تو اسے سننے میں کیا چیز مانع ہوتی؟ آخر کو وہ چور ہی تو تھا۔ تو اس نے سنا کہ بادشاہ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے اور اس کی بیوی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی ایسے آدمی سے کرونگا جو نہایت متقی و پرہیزگار ہو، جو بہت بڑا اللہ والا ہو، میں میری بچی کی کسی اور سے شادی نہیں کرونگا۔

جب چور یہ بات سن رہا تھا کہ تو اس کے دل میں آیا کہ کیوں نہ میں ہی کچھ ایسا بن کر دکھاؤں کہ میرے ہی ساتھ شاہزادی کی شادی بادشاہ کردے۔ دل میں ایک حرص پیدا ہوگئی، اب وہ چوری کو تو بھول گیا، لیکن دھوکہ پر اتر آیا اور گھر میں جا کر بہت دیر تک سوچنے لگا کہ کس طرح میں اس بات میں کامیاب ہو سکتا ہوں؟ تو ایک تدبیر اس کی سمجھ میں آئی کہ بادشاہ کے محل کے قریب ایک مسجد ہے، اس مسجد میں جا کر بزرگانہ لباس پہن کر اور ان کی وضع قطع اختیار کر کے وہاں دن رات عبادت میں مشغول ہو کر بیٹھ جاؤں، تو شدہ شدہ بادشاہ تک بات پہونچے گی کہ کوئی آدمی

یہاں ایسا متقی پرہیز گار ہے جو دن رات اللہ کی عبادت میں مصروف ہے، تو ہوسکتا ہے کہ بادشاہ کی نگاہِ انتخاب میرے اوپر پڑ جائے اور میں چن لیا جاؤں اور شاہزادی سے میری شادی ہو جائے۔

بھائیو! یہ اس کا ایک نہایت حقیر اور ذلیل دنیوی مقصد تھا، جس کے لئے اس نے یہ ارادہ کیا، اور اس نے اپنے پروگرام کے مطابق بزرگانہ لباس و پوشاک، وضع قطع اختیار کر کے اس مسجد میں جا کر نمازوں پر نمازیں، ذکر وتلاوت، مراقبہ سب شروع کرلیا۔ اب زمانہ چلتا رہا، لوگوں میں شہرت ہوتی گئی کہ کوئی اللہ کے بہت بڑے ولی یہاں آگئے ہیں، جو دن رات عبادت کرتے ہیں۔ اب اس کی وجہ سے لوگوں کی آمد و رفت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ تک خبر پہونچ گئی کہ یہاں کوئی اللہ والے آکر بیٹھے ہیں، ہیں تو جوان لیکن زہد و عبادت میں لاجواب وتقوی وطہارت میں بے نظیر، جب بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اپنے ارادے کے مطابق غور وفکر شروع کر دیا کہ شاہزادی کے متعلق جو سوچا تھا، اس کے لئے اسی کا انتخاب کرلیا جائے۔

بادشاہ نے اس سلسلہ میں گفتگو کے لئے اپنے وزیر کو بھیجا، وزیر اس شخص کے پاس مسجد میں پہنچا اور اس نے باادب اس سے کہا کہ میں آپ کی خدمت عالیہ میں بادشاہ جہاں پناہ کی طرف سے آیا ہوں ایک پیغام لیکر۔ اس نے کہا کہ کیا پیغام ہے؟ وزیر نے بتایا کہ بادشاہ نے کئی سال پہلے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی لڑکی کا نکاح ایک ایسے شخص سے کریں گے جو بڑا ہی متقی و پرہیز گار ہو، اللہ والا ہو، اور وہ اس کی تلاش میں تھے، اب جو نظر گئی تو نظر انتخاب آپ پر آکر رک گئی ہے، لہذا بادشاہ نے مجھے بھیجا ہے کہ اس سلسلے میں آپ سے گفتگو کروں، اگر آپ اس کے لئے تیار ہوں تو فرمایئے، اگلی نشست کے اندر اس سلسلے کی کوئی کاروائی آگے بڑھائی جائے گی۔

یہ شخص جو دراصل اسی تمنا و آرزو میں یہاں آکر بیٹھا تھا، وہ بہت دیر تک یہ وزیر کی گفتگو سنتا رہا، اس کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، وزیر نے پوچھا کہ کیا بات ہوگئی؟ تو کہنے لگا کہ آج جو پیغام لیکر آپ آئے ہیں، یہ پیغام مجھے منظور نہیں ہے۔ وزیر نے کہا کہ کیوں منظور نہیں؟ اس نے کہا کہ دیکھئے میں صاف صاف بات آپ کو بتاتا ہوں کہ میں اصل میں ایک چور تھا اور میں بادشاہ کے محل میں چوری کے ارادے سے ایک مرتبہ گیا تھا، پھر جو کچھ بھی ہوا اس کو سنایا اور اس کے بعد اس چور نے کہا کہ میں نے تو یہ وضع قطع اسی حرص کی وجہ سے اختیار کی تھی، لیکن جب میں یہاں آکر بیٹھا تو خدا نے مجھے اپنا بنالیا، اب بس اس کے بعد مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ اکبر! جب عبادت عبادت ہوجائے، نماز نماز ہوجائے اور ذکر ذکر ہوجائے اور ہماری دیگر عبادتیں واقعی عبادتیں ہوجائیں تو بے شک یہ نمازیں اور عبادتیں انسان کو برائیوں سے روکتی ہیں۔

اللہ کے عظیم دربار کا تصور کریں

بہ ہر حال مجھے یہ کہنا ہے کہ آج ہمیں ہماری نمازوں کو نماز بنانے کی ضرورت ہے، لہذا میں اس سلسلہ میں چند اہم امور کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس سے ان شاء اللہ نماز کو نماز بنانا آسان ہوجائے گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم نماز کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہم وضو کرتے ہیں، تو وضو کے وقت ہی اس کا تصور جمانا شروع کردیں کہ میں وضو کرنے کے بعد اللہ کے عظیم شاہی دربار میں جانے والا ہوں، عظیم خالق کے دربار، احکم الحاکمین کے دربار کے اندر حاضری کے لئے مجھے جانا ہے۔

حضرت زین العابدین علی ابن الحسنؓ کے واقعات میں ہے کہ آپ جب وضو کرنے بیٹھتے تھے تو آپ کے چہرے پر تغیر آجاتا تھا، ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا، چہرے کے تغیر کو دیکھ کر لوگ پوچھا کرتے تھے کہ حضرت! آپ وضو کرتے ہیں تو آپ کی حالت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے، چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ وضو کرنے کے بعد کس کے دربار میں جانا ہے؟ یعنی جب اللہ کے دربار عالی میں جانا ہے تو اس کی ہیبت کی وجہ سے یہ اثرات ہوتے ہیں۔

اس طرح جب اللہ کے دربار میں جانے کا تصور قائم ہوجائیگا اور پھر اللہ کی عظمت و بڑائی اور اس کی جلالت و کبریائی کا تصور بھی کیا جائیگا اور سوچا جائیگا کہ اگر ہم دنیا کے کسی بادشاہ کے دربار میں جائینگے تو ہماری کیا حالت ہوتی ہے؟ کیا کسی شاہی دربار میں آدمی ایسے ہی چلا جاتا ہے؟ بے خبری اور غفلت کے ساتھ اندر چلا جاتا ہے؟ نہیں، بلکہ جب وہاں جاتا ہے تو اسے پورا احساس ہوتا ہے کہ میں ایک بڑے آدمی کے دربار میں جارہا ہوں، بادشاہ کے عظیم دربار میں جارہا ہوں۔ لہذا جب یہ سوچتا ہوا جاتا ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس پر رعب وجلال کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔

لیکن ہم خدا کے دربار میں جاتے ہیں تو سوچے سمجھے بغیر چلے جاتے ہیں، اس لئے مسجد کو جاتے ہوئے اللہ کے رعب وجلال کا کوئی اثر ہم پر نمایاں نہیں ہوتا۔ اس لئے جب نماز کیلئے جائیں تو سوچ کر سمجھ کر اللہ کے دربار کی عظمت کا تصور کرتے ہوئے جائیں، اور پورے وقار کے ساتھ جائیں، ایسے طریقے سے نہ جائیں جو وقار کے خلاف ہو۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے مسجد میں دوڑ کر جانے سے منع فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ اطمینان کے ساتھ جاؤ، وقار کے ساتھ اللہ کے دربار میں جاؤ، اگر تم کو پوری نماز مل گئی تو الحمد للہ، نہ ملی تو بقیہ نماز اپنے طور پر مکمل کرو، نماز کو پانے کے لئے مسجد میں دوڑتے ہوئے جانا، یہ اللہ کے دربار کے آداب کے خلاف ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "إذا أقيمت الصلاة فلا تأتوها تسعون ائتوها تمشون ، عليكم السكينة ، فما أدركتم فصلوا وما فاتكم فاقضوا" (جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم دوڑ کر نماز کو نہ آؤ، بلکہ چل کر آؤ، اس طرح کہ تم پر وقار ہو، پس جو نماز مل جائے اس کو پڑھ لو اور جو نہ ملے تو قضا کر لو)

(بخاری: ۱/۱۲۴، مسلم: ۱/۲۲۰، صحیح ابن خزیمہ: ۲/۱۷۷)

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جب نماز کے لئے جاتے تھے تو اس قدر آہستہ آہستہ چلتے تھے جیسے چیونٹی چلتی ہے، حتی کہ ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ چیونٹی بھی چلتی تو وہ اس سے بھی آگے نہ ہوتے۔ (حیاۃ الصحابہ: ۱۲/۷)

الغرض اسی تصور کے ساتھ اگر مسجد میں جائینگے تو نماز کے اندر بھی وہی تصور رہیگا اور اس تصور کو باقی رکھنا آسان ہو جائیگا اور جو آدمی کہ باہر کے خیالات کے ساتھ اور ادھر ادھر کے تصورات کے ساتھ اللہ کے دربار میں کھڑا ہوگا تو اسے کوئی احساس نہیں ہوگا کہ میں اللہ کے دربار میں کھڑا ہوا ہوں، بلکہ دنیا ہی اس کے ذہن میں آتی رہے گی۔ اس لئے یہ سب سے پہلا اصول وادب اور طریقہ ہے کہ نماز کو جانے سے پہلے ہی اللہ کے دربار کا جلال اور اس کی عظمت و بڑائی کا تصور قائم کر لیا جائے۔

مسجد میں داخل ہونے کی نیت ودعا

دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم مسجد جائیں تو مسجد میں داخل ہونے کی نیت بھی کریں اور دعاء بھی پڑھیں ،سب گھروں میں آپ بغیر نیت کے جائیں،کوئی مضائقہ نہیں،لیکن اللہ کے گھر میں جاؤ تو نیت کرکے جاؤ کہ میں اعتکاف کی نیت کرتا ہوں۔

اس لئے کہ جب نیت اعتکاف کے ساتھ مسجد میں جائینگے تو جب تک مسجد میں رہیں گے اور وہاں نماز پڑھیں گے،ذکر کریں گے،تلاوت کریں گے اور کوئی نیک کام کریں گے تو ہر ایک کے ثواب کے ساتھ آپ کو اعتکاف کا بھی ثواب مل جائیگا،اور اگر کسی وقت کوئی اور عبادت نہ کرسکیں تب بھی اعتکاف کا ثواب جاری رہے گا،اس لئے اعتکاف کی نیت کرکے جاؤ،نیت کے ساتھ دعاء پڑھو،دعاء کیا ہے؟

" بِسْمِ اللّٰهِ ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ ، اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِیْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ "(عمل الیوم واللیلۃ: ۱۶۷،الاذکار للنووی:۴۴)

ایک بات یاد رکھیں کہ دعاء کی جاتی ہے، پڑھی نہیں جاتی ،آج ہمارا حال یہ ہے کہ دعاء کرتے نہیں ہیں،دعاء پڑھ لیتے ہیں،یہ بات صحیح نہیں۔دعاء پر غور کرو کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں؟ اس دعاء کا مطلب یہ ہے کہ ''اے اللہ! اپنی رحمت کے دروازے میرے لئے کھولدے''۔معلوم ہوا کہ مسجد میں آنے پر اللہ کی طرف سے رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں،ورنہ اس موقعہ پر یہ دعاء کیوں تجویز کی جاتی، یہ مسجد میں داخلے کا وقت رحمت کے دروازے کھلنے وقت ہے،اس لئے اس موقعہ پر یہ دعاء تلقین کی گئی ہے۔اگر اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہوئے یہ دعاء دل کی گہرائیوں سے کرینگے اور دعاء کو دعاء بنا کر کریں گے اور اللہ سے التجاء کی جائے گی تو

رحمت کے دروازے کھل جائیں گے، پھر بتاؤ کہ ہمارا کونسا مسئلہ اٹکا ہوا ہوگا؟ صحت کا، یا کھانے پینے کا یا تجارت کا، ملازمت کا، یا شادی کا، یا کوئی اور مسئلہ؟ اسی طرح دین وآخرت کا کوئی مسئلہ ہو، نجات کا، فلاح کا، کامیابی کا، حساب وکتاب کا، الغرض دین و دنیاکے جوبھی مسئلے حل ہوتے ہیں وہ اللہ کی رحمت سے حل ہوتے ہیں، اگر خدا کی رحمت رک جائے تو پھر انسان زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اس وقت خوب توجہ سے دعاء کرتے ہوئے مسجد میں داخل ہونا چاہئے۔

مسجد میں داخلے کا ادب اور حضرت گنگوہیؒ

جب ہم مسجد جائیں تو سب سے پہلے ہم اپنے جوتے سے بایاں پیر نکالیں اور داہنے پیر سے مسجد میں داخل ہوں، اس لئے کہ یہاں ایک تو جوتے نکالنے کا ادب بھی ہے اور ایک مسجد میں داخل ہونے کا ادب بھی، جوتے نکالنے کا ادب یہ ہے کہ پہلے بایاں پیر نکالو اور مسجد میں داخل ہونے کا ادب یہ ہے کہ پہلے سیدھا پیر داخل کرو۔

ایک عالم صاحب حضرت گنگوہیؒ کے مرید تھے، وہ کہتے ہیں کہ جب میں کتابوں میں یہ پڑھتا تھا کہ مسجد میں جاتے ہوئے پہلے بائیں پیر سے جوتا نکالو اور مسجد میں داہنا پیر داخل کرو تو مجھے اشکال ہوتا تھا کہ یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوسکتی ہیں؟ نکالنا ہے بایاں پیر سے جوتا، داخل کرنا ہے سیدھا پیر، تو وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت گنگوہیؒ کے پاس گیا، اور جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں یہ دیکھوں کہ حضرتؒ اس سنت پر کیسے عمل کرتے ہیں؟ جب نماز کا وقت آیا تو حضرت کے ساتھ ساتھ نماز کو گیا اور جب مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں دیکھتا رہا کہ حضرت مسجد میں کیسے داخل ہوتے ہیں؟

وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت گنگوہیؒ کو دیکھ رہا تھا کہ حضرتؒ نے پہلے اپنا بایاں

پیر جوتے سے نکال کر جوتے ہی پر رکھ لیا، پھر اپنا داہنا پیر جوتے سے نکال کر سیدھے مسجد کے اندر رکھا۔ اب مجھے سمجھ میں آ گیا کہ اس طریقہ پر دونوں باتوں دونوں سنتوں پر عمل ہوسکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت پر عمل سیکھنے سے آتا ہے اور وہ سیکھنا اللہ والوں کی صحبت سے میسر ہوتا ہے۔

ادب مسجد اور سفیان ثوری کا واقعہ

بہ ہر حال مسجد میں بھی اسی تصور کے ساتھ ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے جانا چاہئے کہ میں اللہ کے دربار میں داخل ہو رہا ہوں۔ واقعہ سنا ہوگا حضرت سفیان ثوریؒ کا کہ ایک مرتبہ مسجد میں بے خیالی کے ساتھ چلے گئے، اور مسجد میں اپنا داہنا پیر پہلے داخل کرنے کے بجائے بائیں پیر سے داخل ہو گئے تو فوراً الہام ہوا اور اس الہام میں ان سے کہا گیا کہ اے ثور! یعنی (اے بیل) کیا ہمارے دربار میں آنے کا یہی ادب و طریقہ ہے؟ اللہ نے ان کو بیل کہا، اس لئے کہ یہ جو بیل و گدھے ہوتے ہیں، ان کے لئے کوئی اصول نہیں ہوتا، جو چاہے پہلے رکھو اور جو چاہے بعد میں رکھو۔ لیکن انسان ہو کر بھی یہی بے اصولی کرے تو یہ بات قابل گرفت ہوتی ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری کو ثوری اسی واقعہ کی وجہ سے کہتے ہیں، مگر اس میں اشکال ہے؛ کیونکہ ثوری میں یائے نسبت لگی ہوئی ہے، اس لئے اس کا معنی تو یہ ہوگا کہ "بیل والا" حالانکہ اللہ نے ان کو خود بیل کہا ہے نہ کہ بیل والا، اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ ثوری ان کو ایک قبیلہ کی طرف نسبت کی وجہ سے کہتے ہیں، الغرض جب یہ الہام ہوا تو فوراً اللہ کے سامنے سجدے میں پڑ گئے، رونے اور گڑگڑانے لگے اور معافی مانگنے لگے۔ لہذا مسجد میں داخل ہوتے ہوئے اس ادب کا لحاظ و دھیان ہونا چاہئے۔

فیضان معرفت

جلد سوم

افادات

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم
بانی ومہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ
ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب
محمد زبیر
(استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

ناشر:

فیصل پبلیکیشنز دیوبند

اجمالی فہرست

فہرست مضامین

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

ایک حدیث کی جدید اور انوکھی تشریح

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

معرفت الٰہی اور اس کے آثار

شیطانی حربے

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنایئے

نماز کو نماز کیسے بنائیں

بیعت کیا اور کیوں؟

اطاعت مومن کی حیات ہے

ملنے کاپتہ

مکتبہ مسیح الامت

۸۴ر آرمسٹرانگ روڈ، بیدواڑی، بنگلور

فون:9036701512

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد لأ هله و الصلوة لأهلها:

اللہ تعالی نے انسان کوصرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے ،اسی مقصد خداوندی کی تبلیغ کے لئے انبیاءکرام کا مبارک سلسلہ جاری ہوا، جوامام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پرختم ہوا،آپ کے بعداس عظیم کام کوحضرات اہل علم اور بالخصوص اولیاءعظام نے سنبھالا ،اورانہوں نے تصنیف وتالیف ،درس وتدریس ، وعظ ونصیحت کے ذریعہ امت تک اس امانت کوامانت داری کے ساتھ بحسن وخوبی پہنچایا۔ان صلحاءواولیاء کی صحبتیں اورمجلسیں انسانوں کے دلوں کومعرفت الٰہی ومحبت الٰہی کے نور سے منورکرنے میں ہرزمانہ میں مؤثررہی ہیں۔

اسی سلسلۂ عالیہ کی کیمیااثری کانمونہ مربی ومرشدی فداہ ابی وامی حضرت اقدس دامت برکاتہم ہیں اور ویران دل کے تاروں کوچھونے والی آپ کی نورانی مجالس وملفوظات ہیں،جس کے مجموعہ ''فیضان معرفت'' کی جلداول ودوم کواللہ تعالی نے بے پناہ مقبولیت عطاءفرمائی، اور الحمدللہ سالکین طریقت کواس سے بہت فائدہ پہنچا،جس کی وجہ سے بہت سارے احباب تیسری جلد کے منتظر تھے۔

اب اللہ تعالی کی توفیق اوراساتذۂ کرام کی محنتوں اوردعاوں کے نتیجہ میں بندہ کوجلدسوم کی ترتیب کی سعادت ملی۔ان مجالس کے مجموعہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ

حضرت والا اس پر از اول تا آخر نظر فرماتے ہیں، اور نہایت مفید اضافے فرما کر ترتیب کی خامی کی وجہ سے پیدا شدہ مضامین کی تشنگی کو دور فرماتے ہیں۔

نیز اپنے قیمتی مشوروں سے نواز کر احقر کی ہمت افزائی فرماتے ہیں، اسی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ مجالس کی ترتیب کا سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے۔

اخیر میں میں حافظ سید محمد صہیب متعلم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم اور حافظ ومولوی حبیب الرحمٰن صاحب نائب امام مسجد بید کا ممنون ومشکور ہوں کہ انہوں نے مجالس کی ترتیب کے سلسلہ میں میرا بھرپور تعاون فرمایا، جس کے لئے میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم عطاء فرمائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ پہلی اور دوسری جلد کی طرح تیسری جلد کو بھی مقبولیت عطاء فرمائے، اور ان مجالس کی ترتیب کے سلسلہ کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطاء فرمائے اور امت کو نفع پہنچائے اور میرے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے، اور حضرت اقدس دامت برکاتہم کا سایہ ہم پر تا دیر قائم ودائم رکھے تا کہ ہم آپ کے علوم ظاہری وباطنی سے اور آپ کے مواعظ حسنہ سے اور آپ کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتے رہیں۔

محمد زبیر
استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم
۱۵؍ربیع الثانی ۱۴۳۱ھ

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے

باسمہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کی محبت کیسے ملتی ہے

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . أما بعد فقد قال النبی ﷺ قال اللّٰہ تعالی:"وجبت محبتی للمتحابین فیَّ و المتجالسین فیَّ والمتزاورین فیَّ والمتباذلین فیَّ (أو کما قال علیہ الصلاۃ والسلام)(مؤطا امام مالك :۱۷٤۸، مسند احمد:۲۲٦٥۱)

میں نے ایک حدیث قدسی آپ کے سامنے پڑھی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ خبر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: "میری محبت واجب ہوگئی ان لوگوں کے لیے جو میرے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اوران لوگوں کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی، ضروری ہوگئی ، جو میری محبت کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہیں اوران کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی، جو میری محبت کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اورآخری جملہ میں فرماتے ہیں کہ "ان لوگوں کے لیے بھی میری محبت واجب ہوگئی جو میری ہی محبت کی خاطر مال ودولت خرچ کرتے ہیں)

یہ حدیث ایک عجیب قسم کی حدیث ہے، اس میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ میری محبت کیسے ملتی ہے اور کب ملتی ہے۔

جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

سن لے اے دوست جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

اللہ اکبر! جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتے ہیں اور اس کا اچھا وقت آجاتا ہے تو خود وہی بتاتے ہیں کہ کیسے ملنا ہے ہم سے؟ کہاں ملنا ہے ہم سے؟ اور ملنے کی راہ کیا ہے؟ یہ سب باتیں وہ خود ہی بتلا دیتے ہیں۔ اور اگر کسی کے ایام بھلے نہیں آتے تو آدمی ٹکروں پر ٹکّریں کھاتا رہتا ہے، نماز بھی جاری، ذکر بھی جاری، تلاوت بھی جاری، سب جاری اور دوسری طرف سے فضیحت بھی جاری، اس لیے کہ اس کا بھلا وقت نہیں آیا۔

شیطان نے بہت سجدے مارے لیکن کیا اس کا کوئی سجدہ اس کے کام آیا؟ بہت سجدے کیے یہاں تک کہ بعض علماء لکھتے ہیں کہ زمین کا کوئی چپہ ایسا نہیں جہاں اس نے سجدہ نہ کیا ہو، چپہ چپہ پر اس کا سجدہ، لیکن اس کا سجدہ اسے کچھ بھی کام نہیں آیا، کیوں؟ اس لیے کہ اس کے لیے کہ بھلے ایام آئے ہی نہیں۔

اب دیکھئے کہ اللہ نے اپنی محبت کے حصول کا کیا پتہ دیا ہے؟ اس حدیث میں کل چار قسم کے لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ اپنی محبت عطاء فرماتے ہیں، ایک وہ جو ایک دوسرے سے اللہ کے لئے محبت کرتے ہیں، دوسرے وہ جو اللہ کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہیں، تیسرے وہ جو اللہ کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں اور چوتھے وہ جو اللہ کے لئے مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔

اور یہ چار الگ الگ قسم کے لوگ نہیں ہیں، بلکہ یہ چار وہ ہیں جن کے اندر یہ چاروں صفات یکجا ملتی ہیں، گویا کہ یہ چاروں کی چاروں صفات ایک ہی ذات کے اندر ملتی ہیں، اس لیے کہ وہ آپس میں لازم ملزوم ہیں، ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں۔ اور جب ایک پایا جائے تو دوسرے کے نہ پائے جانے کا کوئی سوال نہیں۔ لہذا اس حدیث سے یہ سمجھ میں آیا کہ اللہ کی محبت ان لوگوں کو ملتی ہے جن کے

اندر یہ چار صفات موجود ہوں۔لہٰذا اللہ کی محبت کا پتہ یہ ہے کہ ان چار صفات کو پالیں،جس کو یہ چار صفات مل گئیں اس کو اللہ کی محبت مل گئی۔

ہر ایک اللہ کی محبت کا خواہاں ہے

بھائیو!ہم میں کون ایسا ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالی کی محبت اسے ملے؟ سب چاہتے ہیں کہ اللہ کی محبت ہم کو مل جائے، ہر آدمی کی آرزو ہے،جستجو ہے،تلاش ہے،تمنا ہے،خواہش ہے کہ اللہ کی محبت ملے،حتی کہ جو لوگ گناہوں میں ملوث ہیں، وہ لوگ بھی چاہتے ہیں کہ ان کو اللہ کی محبت حاصل ہو،آپ کسی شرابی سے پوچھ کر دیکھئے،اور کسی زناکار سے پوچھ کر دیکھئے،کسی فاسق اور فاجر سے پوچھ کر دیکھئے بلکہ کافر سے پوچھ کر دیکھئے وہ بھی اللہ کی محبت چاہتا ہے۔یہ ایسی چیز ہے کہ اس چیز کی الفت اور محبت خدا نے سب کے دلوں میں ڈال رکھی ہے،اسی لیے اللہ کی معرفت انسان کی طبعی خواہش ہے،اللہ سے محبت انسان کی فطری آرزو ہے۔

جو مضطرب ہے اس کو ادھر التفات ہے
آخر خدا کے نام میں کوئی تو بات ہے

یہ الگ بات ہے کہ اسے شیطان بھٹکا بھٹکا کر غلط راہوں پر ڈالتا ہے جس کی وجہ سے وہ اس میں کامیاب نہیں ہوتا،لیکن جہاں تک مسئلہ ہے نفس کی خواہش کا تو وہ ہر انسان کے دل میں ہے کہ اللہ کی محبت چاہئے اور اللہ کی معرفت چاہئے۔

پہلی صفت-اللہ والوں سے محبت

اب دیکھئے کہ اللہ کی محبت کن کن کو ملتی ہے؟اس حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے سب سے پہلے فرمایا کہ”وجبت محبتی للمتحابیین فی“ کہ اللہ کی محبت

ایک تو ان کو ملتی ہے جو اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔

یہ بات بہت واضح ہے کہ اللہ کے لیے محبت اسی آدمی سے ہوسکتی ہے جو اللہ کا محبوب ولاڈلا ہے، ورنہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ مثلاً کسی کافر سے محبت کریں اور کہیں کہ میں اللہ کے لیے ایک کافر سے محبت رکھتا ہوں؟ کسی فاجر سے، کافر سے اور کسی غلط کار انسان سے آپ محبت کریں اور پھر یہ دعویٰ کریں کہ میں اس آدمی سے جو محبت کررہا ہوں وہ محض اللہ کی محبت کے لیے ہے تو یہ بات حدیث کے منشاء کے خلاف ہے، اور اس دعوے کے اندر کوئی واقعیت اور کوئی حقیقت نہیں۔

اس لیے یہاں لامحالہ مراد یہ ہے کہ اللہ سے ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں یعنی نیک لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد اولیاء اللہ کی اور نیک لوگوں کی محبت ہے۔

دوسری بات اس میں سمجھنے کی یہ ہے کہ "متحابین" عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ "تحابب" سے بنا ہے اور اس میں اشتراک پایا جاتا ہے، اس لئے اس کا ترجمہ ہے "آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنا" لہٰذا "متحابین" دو قسم کے لوگ ہوں گے: ایک محبت کرنے والے ہوں گے اور ایک وہ ہوں گے جن سے محبت کی جائے، اسی وقت "متحابین" کا اطلاق صحیح ہوتا ہے، تو اب مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ محض اللہ کی محبت میں اللہ کے محبوب بندوں سے محبت کریں گے اور دوسرے وہ لوگ جو اللہ کے محبوب ہیں وہ بھی ان لوگوں سے اس لیے محبت کریں گے کہ یہ اللہ کو چاہتے ہیں، اور اللہ کی محبت حاصل کرنے ان کی خدمت میں آئے ہیں۔ ادھر سے بھی محبت کا تحقق ہو، ادھر سے بھی محبت کا تحقق ہو، جب دونوں طرف سے تحقق محبت کا ہوا تو اشتراک ہوگیا۔

لہٰذا اولیاء اللہ کی خدمت میں جانا ہے؛ کیوں؟ ان سے محبت رکھنا ہے؛ کیوں؟ ان سے تعلق رکھنا ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ ان سے محبت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اپنی محبت ضرور بالضرور دیتے ہیں۔

ان سے ملنے کی ہے یہی یک راہ
ملنے والوں سے راہ پیدا کر

ارے جناب! اگر آپ اللہ کو چاہتے ہیں تو انہیں لوگوں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس اللہ ملے گا، چاول خریدنے انھیں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس چاول ملے گا، سونا خریدنے انھیں کے پاس تو جائیں گے جن کے پاس سونا ملے گا، اگر کسی آدمی کو سونا چاہیے اور وہ چلا گیا لوہار کے پاس تو اسے کبھی بھی سونا نہیں ملے گا۔ اسی طرح کافر کے پاس کفر ملے گا، فاسق کے پاس فسق ملے گا، خدا کی محبت نہیں ملے گی، جن کے پاس خدا کی محبت ہے وہ ہیں اولیاء اللہ، ان کے دلوں کے اندر جو خدا کی محبت ہے، اس کو پانے کے لیے ان سے محبت کیجئے۔ یہ ہے حاصل اس حدیثِ پاک کا۔

اللہ کے لئے محبت کرنے والوں کا مقام

ایک حدیث میں ہے، اللہ کے نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ فرماتے ہیں: ''أَلْمُتَحَابُّوْنَ فِي جَلَالِي لَهُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ يَغْبِطُهُمُ النَّبِيُّوْنَ وَ الشُّهَدَاءُ'' (جو لوگ میرے جلال کی وجہ سے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں، ان کے لیے قیامت کے دن نور کے ممبر بچھائے جائیں گے اور ان کو دیکھ کر انبیاء اور صدیقین بھی رشک کریں گے)۔ (ترمذی: ۲/۶۴، مسند احمد: ۲۲۰۸۰)

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی علیہ الصلوۃ والسلام دعاؤں میں مسلسل

ایک دعا یہ بھی کرتے تھے:

﴿ أَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ يَّنْفَعُنِيْ حُبَّهُ عِنْدَکَ ﴾

(اے اللہ! مجھے تیری محبت عطاء فرما اور اس شخص کی بھی محبت عطاء فرما جس کی محبت تیرے نزدیک کام آنے والی ہے) (ترمذی:۲/۱۸۷)

اللہ کے نبی دعاء میں کہہ رہے ہیں: اے اللہ! اس شخص کی بھی محبت عطاء فرما جس کی محبت تیرے پاس مجھے کام آنے والی ہے۔ سب سے بڑے تو حضور ہی ہیں، ان سے بڑا تو کوئی نہیں حتیٰ کہ انبیاء بھی نہیں، آپ سردارِ انبیاء ہیں، آپ سید الاولین والآخرین ہیں، آپ سید الکائنات ہیں، آپ سید الانبیاء ہیں، سید المرسلین ہیں، آپ امام الانبیاء ہیں، آپ سے بڑا تو کوئی نہیں، اس کے باوجود یہ دعاء مانگنا دراصل ہمیں اور آپ کو اللہ والوں کا مقام بتانے اور سمجھانے کے لیے ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ والوں کی محبت مطلوب عندالشرع ہے۔ اور دوسری بات یہ بھی سمجھ میں آئی کہ اللہ کے ولیوں سے محبت رکھیں گے تو اللہ کے نزدیک وہ کام بھی آئے گی، کبھی ان کی سفارش ہو جائے گی، کبھی ان کی دعاء لگ جائے گی۔

بعض بزرگان دین نے ایک عجیب بات فرمائی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب بندوں کے دلوں میں جھانکتے ہیں، اور ان کے دلوں میں جن جن کی محبت ہوتی ہے ان کو بھی مقبول بنا دیتے ہیں۔

اللہ اکبر! گویا اللہ تعالیٰ کہتے ہیں: یہ میرے بندے کا دل ہے اور اس دل میں دیکھو فلاں فلاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ بندہ ان بندوں سے محبت کرتا ہے، جب ان سے یہ بندہ محبت کرتا ہے تو پھر میں ان کو بھی قبول کر لیتا ہوں۔

اہل اللہ کے جلیس محروم نہیں ہوتے

اسی لیے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو اولیاء اللہ سے تعلق رکھنے والے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو ہمیشہ محفوظ و مامون رکھتا ہے، جو اولیاء اللہ سے محبت کے ساتھ دین سیکھتے ہیں، اولیاء اللہ کی سرپرستی میں عمل سیکھتے ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ دین پر چلنا انگلی پکڑ پکڑ کر سیکھتے ہیں، جیسے بچہ اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھتا ہے تو انشاء اللہ! اللہ تعالیٰ ان کو کفر سے، شرک سے، بدعت سے، ضلالت وگمراہی سے محفوظ و مامون رکھیں گے۔

ایک حدیث ذہن میں آ گئی، وہ یہ کہ نبی کریم ﷺ نے ایک طویل حدیث میں فرمایا کہ اللہ کے فرشتے راستوں میں ذاکرین کو تلاش کرتے رہتے ہیں، جب وہ اللہ کے پاس جاتے ہیں تو اللہ تعالی ان سے اہل ذکر کے بارے میں پوچھتے ہیں پھر فرماتے ہیں کہ تم گواہ رہنا کہ میں نے ان کی مغفرت کر دی، تو ایک فرشتہ کہتا ہے کہ اے اللہ! ان میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو ذکر کے لئے نہیں بلکہ اپنی کسی حاجت کی وجہ سے وہاں آیا تھا، تو اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ: ”**هُمُ الْجُلُسَاءُ لَايَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ**“ (یہ اہل ذکر وہ لوگ ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں ہے) (بخاری: ۶۴۰۸، صحیح ابن حبان: ۱۳۵/۳)

اولیاء اللہ سے محبت وتعلق کا فائدہ، امام رازی کا واقعہ

اولیاء اللہ سے تعلق ومحبت رکھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالی ان کی وجہ سے ہمیں نواز دیتے ہیں، اور ایمان محفوظ رہتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ امام رازیؒ ایک جلیل القدر عالم، فاضل، مفسر اور اسی کے ساتھ ساتھ آپ بہت بڑے

فلسفی منطقی تھے، آپ نے محبت خداوندی کی خاطر ایک اللہ والے سے بیعت کی، شیخ نے اذکار و وظائف بتائے رات میں اٹھکر تہجد پڑھنے کو کہا، ذکر کرنے کا حکم دیا۔

امام رازی حکم کے مطابق جب ذکر کے لیے رات میں بیٹھتے تو ان کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اندر سے ایک دھواں نکل رہا ہے، انھوں نے چند دن تو دیکھا، اس کے بعد اپنے شیخ کے پاس جا کر شکایت کی کہ حضرت! میں ذکر کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل کے اندر ایک آگ ہے، اس کا دھواں نکل کر میرے منہ سے باہر جا رہا ہے۔

شیخ نے کہا کہ یہ اللہ کی محبت کی آگ ہے جو دل میں لگ رہی ہے، اور تمہارے فلسفہ اور منطق کے علوم کو جلا رہی ہے، اسی کا یہ دھواں ہے۔ امام رازی کو یہ سن کر بڑا افسوس ہوا، اس لیے کہ ان علوم کے پیچھے تو عمر لگائی تھی، زندگی کھپائی تھی، بڑا پیسہ خرچ کیا تھا، رات رات جاگتے رہے تھے، اپنا سارا آرام اور عیش اس کے پیچھے گنوا ڈالا تھا، یہاں تک کہ دنیا میں منطقیوں اور فلسفیوں کے امام قرار پائے۔

تو امام رازی نے کہا کہ اتنا سارا علم جو میں نے اتنی محنت اور مجاہدہ سے حاصل کیا ہے، اگر وہ جل کر خاک ہو جاتا ہے تو یہ مجھے منظور نہیں ہے۔ اس لیے واپس چلے آئے، لیکن آگ تو اندر لگ چکی تھی، وہ ایک چنگاری کی شکل میں اندر دبی رہی، زمانہ گزرتا رہا، گزرتا رہا، پھر ایک وقت وہ آیا جو ہر انسان کے لیے اللہ نے مقدر کر رکھا ہے یعنی موت کا وقت۔ موت کے وقت شیطان بہکانے کے لیے آیا اور اس نے امام رازی سے بحث شروع کر دی کہ تم اللہ کو ایک مانتے ہو؟ بتاؤ کیا دلیل ہے؟ امام رازی نے اپنے دماغ سے ایک سو دلیلیں اللہ کی وحدانیت پر فلسفیانہ منطقیانہ تیار کی تھیں۔

امام رازی نے دلیل پیش کی، لیکن شیطان تو ان سے بھی بڑا فلسفی تھا، اس نے

اس دلیل میں نقص وعیب نکال دیا، امام رازی نے کہا کہ یہ دلیل چھوڑو، دوسری لو۔ اس نے اس دلیل میں بھی کوئی کسر نکال دی۔ انھوں نے تیسری دلیل پیش کی، شیطان نے اس کے اندر بھی کوئی کھوٹ نکال دیا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ انھوں نے ننانوے دلیلیں پیش کیں اور اس نے سب کو توڑ دیا۔ اب روح قبض ہونے والی ہے، شیطان ادھر بہکانے میں مشغول ہے، اسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے شیخ کو الہام کیا، وہ اس وقت وضو کررہے تھے، ان کے قلب پر الہام ہوا کہ تمہارے وہ مرید جو آئے تھے تمہارے پاس اور تم نے میری محبت کی آگ ان کے دل میں لگادی تھی لیکن وہ پھر بھی واپس ہوگئے تھے۔ آگ لگ جانے کے بعد میں کسی کو محروم نہیں کیا کرتا، ذرا ان کی طرف آپ توجہ کریں۔ امام رازیؒ کی وہ گفتگو جو شیطان کے ساتھ چل رہی تھی، اللہ نے اِن بزرگ کو پہنچا دی، شیخ کو آواز آئی اور وہ سن رہے تھے۔

شیخ نے کہا کہ یہ کیا بحث ومباحثہ میں مبتلا ہو، کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میں بے دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں۔ یہ دلیل، وہ دلیل، یہ کیا دلیلیں ہیں؟ اللہ نے کہہ دیا کافی ہے ہمارے لیے، اب کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ امام رازی کو اللہ نے شیخ کی آواز سنائی، شیخ کی وہ آواز کان میں آتے ہی امام رازی کی زبان سے نکلا کہ میں بے دلیل خدا کو ایک مانتا ہوں۔ جب یہ کہا تو اسی وقت ان کی روح قبض ہوگئی اور شیطان بھاگ گیا۔

معلوم ہوا کہ جو اس راستہ پر چل پڑا، جو اس راستہ میں داخلہ لے لیا وہ کبھی محروم نہیں ہوگا، اللہ کبھی نہ کبھی اس کو پہنچا ہی دیتے ہیں۔

اللہ کے ولی کا ادب اور مغفرت، امام احمد بن حنبل کا واقعہ

بزرگوں کے واقعات میں لکھا ہے کہ امام احمد ابن حنبلؒ کے زمانہ میں ایک شخص کا انتقال ہوا۔ کسی کے خواب میں وہ شخص آیا تو اس نے پوچھا کہ بھائی! تیرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کیا معاملہ ہوا؟ تو اس نے کہا کہ اللہ کے فضل سے میری مغفرت ہوگئی۔ پوچھا کہ کس بنیاد پر مغفرت ہوئی؟ کہا کہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مجھے وضو کرنے کی ضرورت پڑی تو میں وضو کرنے کے لیے ایک نہر کے کنارے پہنچا، میں نے دیکھا کہ نیچے کی طرف امام احمد بن حنبلؒ بیٹھ کر وضو کر رہے ہیں تو میں نے یہ خیال کیا کہ وہ وہاں وضو کر رہے ہیں، مجھے بھی وضو کرنا ہے، اگر میں یہاں بیٹھ کر وضو کروں گا تو میرا غسالہ (اعضاء کا دھویا ہوا پانی) ان کی طرف جائے گا اور ان کے وضو کے پانی میں ملے گا، یہ ادب کے خلاف ہے، اس لیے مجھے وہ جہاں بیٹھے ہیں اس سے نیچے بیٹھ کر وضو کرنا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں وہاں سے اٹھا اور امام احمد بن حنبل جہاں بیٹھے تھے، اس کے نیچے جا کر میں نے وضو کیا تا کہ ان کا غسالہ میری طرف آئے گا تو مجھے بھی کچھ تبرک حاصل ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس ادب پر میری بخشش ہوگئی۔

اس واقعہ میں غور کیجئے کہ اللہ والے کا ایک معمولی ادب کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مغفرت جیسی عظیم دولت عطاء فرما دی، جو شخص ہمیشہ ان کی اتباع کرے تو اسے کیا کچھ اللہ تعالیٰ نہیں دیں گے۔ اسی لئے بخاری کی ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ: "هُمْ قَوْمٌ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ" کہ یہ اولیاء اللہ کی قوم وہ قوم ہے کہ ان کے پاس بیٹھنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ (بخاری: ٦٤٠٨)

دوسری صفت ـ مجالست

آگے حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی محبت پانے والوں کی دوسری صفت

بیان کی کہ "والمتجالسین فیّ"(جو میرے لئے مصاحبت اور مجالست اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے بھی میری محبت واجب ہو گئی)

مجالست و مصاحبت کیا ہے؟ کہ نیک لوگوں کی صحبت و معیت میں رہا جائے، ان کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا ہو۔ اس حدیث میں مجالست پر اللہ کی محبت دیئے جانے کا ذکر ہے کہ جو اللہ والوں کے پاس اٹھتا بیٹھتا ہو اس کے لئے بھی اللہ کی محبت واجب ہو گئی۔

اے اللہ کو چاہنے والو! اگر تم واقعۃً اللہ کے طالب ہو تو جاؤ اہل اللہ کی صحبت اختیار کرو۔ اس سے اللہ کی محبت تم میں بھی منتقل ہو جائے گی۔

کیسے؟ سنو کہ حدیث میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "نیک لوگوں کی صحبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی عطار ہو اور آدمی اس کے پاس پہنچے تو جب تک اس کے پاس رہے گا، ہو سکتا ہے کہ وہ خود اسے عطر لگا دے، عطر پیش کر دے، اگر نہیں تو کم از کم جب تک وہاں بیٹھا رہے گا، اس کا دل و دماغ عطر کی خوشبوؤں سے معطر ہوتا رہے گا اور فرمایا کہ بری صحبت کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی آدمی کسی لوہار کے پاس اس کی بھٹی میں جا کر بیٹھ جائے، جب تک وہاں بیٹھے گا یا تو یہ ہو گا کہ اس کے کپڑے جلیں گے، کہیں چنگاریاں آئیں گی، اس کو جلائیں گی، اگر یہ نہیں ہو گا تو کم از کم از کم وہاں کے دھوئیں سے اس کا دماغ مکدر ہو جائے گا۔ (بخاری: ۱/۲۸۴، مسلم: ۲/۳۳۰)

اسی طرح نیک صحبت میں جب بیٹھے گا، اللہ کے ولیوں کی صحبت میں بیٹھے گا، نیک کردار لوگوں کی صحبت میں بیٹھے گا تو وہاں اللہ کا ذکر ہوتا رہے گا، رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہوتا رہے گا، دین کا ذکر ہوتا رہے گا، دین کی فکر ہوتی رہے گی، دل و دماغ اس کی

وجہ سے معطر ہوجائے گا اور جب تک ان کے ساتھ بیٹھے گا دماغ کے اندر صالح تبدیلیاں بھی شروع ہوجائیں گی، اگر طبیعت میں ایسی تبدیلی پیدا ہوگئی جو پائیدار ہو تو پھر بیڑہ پار ہوجائے گا، اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو جب تک بیٹھے گا اس وقت تک تو یہ ہوگا کہ اس کے دل میں نیکی کا جذبہ وخیال، آخرت کی فکر وتڑپ پیدا ہوجائے گی۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے ایک عمدہ مثال سے سمجھا دیا ہے۔

معلوم ہوا کہ نیک صحبت بہت ضروری ہے، نیک لوگوں کی مجلس کا اثر ضرور مرتب ہوتا ہے، دنیا کے اندر آپ دیکھ لیجئے، بڑی مجلسیں ہوتی ہیں، بری بھی ہوتی ہیں، اور اچھی بھی ہیں، مختلف قسم کی ہیں، دنیوی بھی ہیں، دینی بھی ہیں۔ ہر مجلس کا رنگ الگ ہوتا ہے، ہر مجلس کا اثر الگ ہوتا ہے، ہر مجلس کی کیفیت الگ ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ مجالس وصحبتوں کا اثر ضرور ہوتا ہے اور مجالس کا اثر صاحب مجلس کی وجہ سے ہوتا ہے۔

خود قرآن کریم نے بھی اس کا حکم دیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صادقین کے ساتھ رہا کرو) (التوبۃ :۱۱۹)

اس میں ''کُوْنُوْا'' فرمایا گیا، اس کے معنی ہیں ''رہا کرو'' ایک دفعہ رہو نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر استمرار ہے، ہوسکتا ہے کہ کوئی طالب علم سوال کر بیٹھے کہ اس میں استمرار کہاں سے آیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عربی داں جانتے ہیں کہ امر کا صیغہ مضارع سے بنتا ہے، جب مضارع سے بنتا ہے تو مضارع کی خصوصیات بھی اس کے اندر رہتی ہیں، لہذا مضارع میں تجدد بھی ہوتا ہے، مضارع کے اندر استمرار بھی ہوتا ہے، تو امر میں بھی استمرار اور تجدد پایا جائیگا۔

تو ''کونوا'' کا ترجمہ ہے، اولیاء اللہ ساتھ مستقل رہا کرو، یہ نہیں کہ ایک دفعہ جا کر پھر اس کے بعد بند کر دو۔

مجالس کا اثر مرتب ہونے پر ایک حسی مثال

بھائیو! مجالس کا اثر کس طرح مرتب ہوتا ہے اس کو ایک حسی مثال سے سمجھئے، کہ اگر کسی جگہ دو چار آدمی بیٹھ کر ہنس رہے ہوں، کسی بات پر کوئی تبصرہ انہوں نے کیا، کسی بات کا تذکرہ کیا اور اس میں کسی بات پر ہنسی آ گئی اور سب ہنسنے لگے، اسی ہنسی کے موقعہ پر آپ وہاں پہنچ گئے، اور وہ لوگ برابر ہنسنے میں مشغول ہوں۔ تو آپ بتائیے کہ آپ وہاں روئیں گے یا خاموش بیٹھے گے، یا آپ بھی ہنسیں گے؟ ظاہر ہے کہ آپ بھی ضرور ہنسیں گے۔ اب یہاں سوال یہ ہے کہ آپ نے تو کچھ سنا نہیں کہ بات کیا ہے، آپ کو بالکل معلوم نہیں ہے کہ اہل مجلس کیوں ہنس رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ بھی ہنسیں گے۔ یہ ہے اثر کا منتقل ہونا، ان کے ہنسنے کا اثر آپ کے دل پر پڑ رہا ہے، اور آپ کو بھی ہنسی آ رہی ہے۔

بالکل اسی طریقہ پر ایک جگہ پر چند لوگ بیٹھے ہوئے رو رہے تھے اور آپ کو بالکل خبر نہیں تھی کہ وہ کیوں رو رہے ہیں، اپنی کسی بیماری سے رو رہے ہیں، کسی پریشانی سے رو رہے ہیں، کسی کے مار دینے سے رو رہے ہیں، یا اور بھی کوئی بات ہوسکتی ہے۔ اتفاق سے آپ اس مجلس میں پہنچ گئے تو خود بخود آپ کو بھی رونا آ جائے گا، بغیر وجہ کے جانے آپ بھی رونا شروع کر دیں گے۔ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ آپ کیوں رو رہے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ مجھے پتہ نہیں ہے۔ یہ ہے مجلس کا اثر۔

اسی طرح مجالسِ اولیاء کے ذریعہ سے غیر شعوری طور پر علوم منتقل ہوتے ہیں، معرفت منتقل ہوتی ہے، محبت منتقل ہوتی ہے، اور دیگر کیفیات باطنی منتقل ہوتی ہیں،

اس کا انکار کرنا بداہت کا انکار ہے، اس کا انکار دن کے اجالے میں سورج کے انکار کے مرادف ہے۔

مجلس کا اثر کیسے ہوتا ہے؟ ایک حکیم صاحب کا واقعہ

حضرت مولانا حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ کے ایک مرید تھے، انھوں نے ایک دفعہ حضرت تھانوی کے پاس خط لکھا کہ حضرت! میرے اندر غصہ بہت زیادہ ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ میری اصلاح ہو جائے۔ لہٰذا اس کے لیے کوئی نسخہ تجویز فرما دیں۔ وہ صاحب لکھنؤ سے قریب کے رہنے والے تھے۔

حضرت نے ان کو جواب لکھا کہ لکھنؤ میں میرے خلیفہ فلاں حکیم صاحب رہتے ہیں، فلاں جگہ پر ان کا مطب، کلینک ہے، تم ان سے اجازت لے کر ان کے پاس بیٹھ جایا کرو، وہ تو اپنے کام میں مشغول رہیں گے لیکن تم ان کے پاس جا کر بیٹھ جایا کرو اور یہ بھی لکھا کہ پندرہ دن تک بیٹھنے کے بعد مجھے خط لکھنا کہ کیا اثر ہوا۔

چنانچہ وہ صاحب پتہ تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے، حکیم صاحب کی کلینک مل گئی، اور ان سے ملاقات کی اور کہا کہ حضرت نے مجھے ایسا لکھا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں بیٹھا کروں، اگر آپ اجازت دیں تو یہاں بیٹھ جایا کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ وہ حکیم صاحب تو اپنے کام میں مشغول رہتے، بیماروں کی نبض دیکھتے، دوائیاں تجویز کرتے تھے، اور یہ صاحب ان کے قریب بیٹھے رہتے تھے۔ پندرہ دن کے بعد انھوں نے حضرت تھانوی کو خط لکھا کہ اللہ کا فضل ہے کہ غصہ بالکل کافور ہو گیا، انھوں نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ حضرت! غصہ تو میرا کافور ہو گیا، لیکن ایک سوال ذہن میں آ گیا ہے کہ حکیم صاحب نے نہ مجھے کچھ کہا اور نہ میں نے ان سے کچھ کہا، صرف ان کے پاس بیٹھنے سے میرا غصہ کیسے ختم ہو گیا؟ یہ

فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت کے پاس خط آیا تو اس کا جواب لکھا کہ جی! نہ انہوں نے کچھ کہا، نہ تم نے کچھ کہا، لیکن ان کے دل میں جو حلم کا مادہ ہے، صحبت کی تاثیر سے وہ منتقل ہو کر تمہارے دل میں آ گیا۔ اللہ اکبر! یہ ہے تاثیر صحبت اولیاء کی۔

لہذا یہ نیک لوگوں کی مصاحبت ومجالست بہت ضروری ہے، مجالست ایک ذریعہ ووسیلہ ہے اللہ کی معرفت کو پانے کا، اللہ کی محبت کو پانے کا، اسی کا ذکر مذکورہ حدیث کے اندر کیا گیا ہے۔

تیسری صفت - اہل اللہ کی زیارت

اب تیسری صفت سنئے، اس حدیث میں آگے فرمایا کہ: ''والمتزاورین فی'' (کہ میری محبت ان کے لئے بھی واجب ہو گئی جو میری خاطر ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں) لہذا اللہ کی محبت پانا ہو تو ایک کام یہ کرنا ہوگا کہ اہل اللہ کی زیارت وملاقات کی جائے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ: ایک شخص نے اپنے ایک مومن بھائی کی زیارت کی جو دوسرے گاؤں میں رہتا تھا، تو اللہ نے اس کی حفاظت کے لئے ایک فرشتہ کو اس کے راستے پر مقرر کر دیا، جب وہ شخص چلتے ہوئے اس فرشتے کے قریب سے گزرا تو فرشتہ نے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے کہا کہ میرے بھائی جو اس گاؤں میں ہیں ان کے پاس جانے کا ارادہ ہے۔ فرشتہ نے پوچھا کہ کیا تمہاری کوئی اس سے رشتہ داری ہے؟ اس نے کہا نہیں، بلکہ صرف اللہ کے واسطے اس کی زیارت کو جا رہا ہوں، فرشتہ نے کہا کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اللہ نے تم کو بتایا ہے کہ اللہ بھی تم سے محبت کرتا ہے جس طرح تم اللہ کے لئے اس بندے سے محبت کرتے ہو۔ (مسلم: ۶۷۱۴، احمد: ۹۵۲۹)

بھائیو! جب اللہ کے واسطے اللہ کے محبوب بندوں کی زیارت کی جاتی ہے تو اللہ خوش ہوتے ہیں اور اس کو اپنی محبت عطا کر دیتے ہیں۔ اور بارگاہ الٰہی کے مقربین کی زیارت پر صرف آخرت ہی کی نعمتیں نہیں بلکہ دنیا کی نعمتیں بھی ملتی ہیں۔ ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی بندے کی اللہ کے لئے زیارت کرتا ہے اس کو ایک منادی پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ: تو خوش رہے اور تیرا سفر (یعنی آخرت کا سفر) بھی آرام سے ہو اور تو جنت میں اپنی منزل بنائے۔ (ترمذی: ۲۱۳۹)

غور فرمائیے کہ اس میں دین و دنیا دونوں کی بھلائی کی اللہ کا فرشتہ دعاء دے رہا ہے، کہ تو دنیا میں خوش رہے اور آخرت کا سفر بھی آرام سے ہو اور جنت میں منزل بھی بنالے۔ یہ کس بات پر دعاء دی جاتی ہے؟ اللہ کے نیک بندوں کی زیارت کرنے پر، معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں کی زیارت و ملاقات کے لئے جانا چاہئے۔ یہ کام بہت بہترین کام ہے۔

مگر آجکل لوگوں میں اس کا رواج ہی ختم ہو گیا کہ اللہ والوں کی ملاقات و زیارت کی خاطر سفر کریں، ان کے مقام پر پہنچ کر ان سے استفادہ کریں۔ بلکہ اب کوئی بزرگ آجاتے ہیں تو لوگ بھیڑ کر کے ان کو دیکھ لیتے ہیں، اور وہ بھی ان کو تکلیف و اذیت پہنچا کر دیکھ لیتے ہیں۔ مصافحہ کے لئے ایک دوسرے پر تشدد کرتے ہیں، خود ان کو بھی تکلیف دیتے ہیں۔ یہ زیارت کوئی زیارت نہیں۔ ادب کے ساتھ ان کے پاس جائیے، اگر دور ہوں تو سفر کیجئے۔

چوتھی صفت: اہل اللہ پر خرچ

اب ایک صفت آخری رہ گئی جس پر اللہ کی جانب سے محبت عطا ہوتی ہے، اور

اس کا ذکر اس جملہ میں کیا گیا ہے: ’’والمتباذلین فی‘‘ (کہ میری محبت ان کے لئے بھی واجب ہوگئی جو ایک دوسرے پر محض میرے واسطے خرچ کرتے ہیں) لہذا اللہ کی محبت پانا ہو تو اللہ کے راستہ میں اللہ کی خاطر خرچ بھی کرنا چاہئے۔ اس میں مدارس ودینی کاموں پر خرچ بھی داخل ہے، کیونکہ دین پر اور اہل دین پر خرچ اللہ ہی کے لئے ہوتا ہے، اس کا اور کوئی مقصد نہیں، اور نہ ہونا چاہئے، لہذا تمام دینی خدمات وکاموں پر، خواہ وہ مدارس ہوں یا خانقاہیں ہوں، یا مساجد ہوں یا تبلیغی ودعوتی کام ہوں، جہادی ضرورتیں ہوں، یا طلبہ کی ضروریات ہوں، ان سب پر خرچ اللہ کی خاطر خرچ میں داخل ہے، اور اس پر اس حدیث میں یہ وعدہ ہے کہ اللہ کی محبت ملے گی۔

سخاوت اولیاء اللہ کی صفت ہے

بزرگو! اسی وجہ سے سخاوت کو ولی کا خاصہ کہا گیا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالی نے فرمایا کہ:

﴿وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّأَسِيْرًا﴾ [الدھر:۸]
(وہ اللہ کی محبت میں مسکین ویتیم وقیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)

ایک اور جگہ فرمایا گیا کہ:

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ [البقرۃ:۱۷۷]

(لیکن بھلائی یہ ہے کہ کوئی اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر، اور اللہ کی کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے، اور اللہ کی محبت میں رشتہ داروں، یتیموں،

مسکینوں اور مسافر کو مال دے)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: " مَا جَبَلَ اللّٰهُ تَعَالَى وَلِيًّا لَهٗ اِلَّا عَلَى السَّخَاءِ " (اللہ نے اپنا کوئی ولی ایسا نہیں پیدا کیا جس میں سخاوت نہ ہو)(جمع الجوامع للسیوطی:۶۵۰، بسند ضعیف)

حضرت علیؓ کی سخاوت کا واقعہ

ابھی جو سورہ دہر کی آیت اوپر سنا تا آیا ہوں، وہ آیت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی کے یہاں فاقہ تھا، کھانے کو کوئی چیز میسر نہیں تھی، آپ نے اس موقعہ پر ایک رات کسی کے باغ کو پانی سینچ کر ڈالنے کی مزدوری کی، اور اس کام پر صبح کو باغ والے نے کچھ ''جو'' دئے، آپ اس کو لیکر آئے اور گھر میں اس ''جو'' کے تین حصے بنا کر ایک حصہ چکی میں پسوایا اور اس سے خزیرہ نام کا ایک کھانا پکایا گیا، اور کھانے کے لئے بیٹھے تو ایک مسکین آیا اور دستک دی کہ اللہ کے نام پر کچھ دیدو، آپ نے اور گھر کے افراد نے وہ سارا کھانا فقیر کو دیدیا، پھر باقی آٹے میں سے کچھ نکال کر پکایا اور کھانے بیٹھے تو ایک یتیم آیا کہ اللہ کے نام پر کچھ دیدو، آپ نے یہ کھانا بھی اللہ کے نام پر اس یتیم کو دیدیا، اور آٹے کے آخری بچے ہوئے حصہ کو لیکر اس کو پکایا، اور کھانے بیٹھے تو ایک قیدی آیا اور سوال کیا، آپ نے یہ بھی اللہ کے نام پر دیدیا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، اور اس میں آپ کی تعریف فرمائی گئی۔(اسباب النزول واحدی:۴۰۷)

بھائیو! یہ اللہ کا کرم ہی ہوتا ہے کہ کوئی سخاوت کا کام کیا کرے، اور یہ کرم حضرات صحابہ پر اللہ کا بے حد تھا، اس لئے وہ حضرات حیرت انگیز قسم کی سخاوت بھی کرتے تھے۔ جس کا ایک نمونہ یہ ہے۔

بیک وقت ایک لاکھ اسی ہزار کی سخاوت

لیجئے، ایک اور حیرت ناک سخاوت کا واقعہ سنئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی خدمت میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے دو بوروں میں ایک لاکھ اسی ہزار درہم بھیجے، حضرت عائشہ نے ایک طباق منگوایا اور یہ ساری رقم لوگوں میں تقسیم کرنا شروع کر دیا، جب شام ہوئی تو اپنی باندی سے فرمایا کہ میری افطاری لاؤ، باندی نے ایک روٹی اور زیتون کا تیل پیش کیا، حضرت عائشہ کی ایک خادمہ ام درہ تھیں، انھوں نے عرض کیا کہ کیا آپ نے جو مال تقسیم کیا اس میں ایک درہم کا گوشت ہمارے لئے نہیں خریدا جا سکتا تھا جس سے ہم لوگ افطار کرتے؟ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اگر تم نے مجھے یاد دلایا ہوتا تو میں خرید لیتی۔

یہ حیرت انگیز قسم کی سخاوت ہے کہ خود تو یاد نہیں رہے، اور ساری دنیا پر لٹا دیا، اور رقم بھی کوئی معمولی نہیں، بلکہ ایک لاکھ اسی ہزار درہم، کیا ٹھکانہ ہے اس سخاوت کا!

حضرت ابن عباسؓ کی سخاوت کا ایک واقعہ

اسی طرح ایک واقعہ حضرت ابن عباس کا کتابوں میں لکھا ہے، وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس شہرہ بصرہ کے چند علماء آئے، اس وقت حضرت ابن عباس بصرہ کے گورنر تھے، انھوں نے کہا کہ ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں جو صوام وقوام یعنی دن بھر روزہ رکھنے والے اور رات بھر نماز پڑھنے والے، بڑے عابد وزاہد اور اللہ والے ہیں، ہم میں سے ہر شخص کی خواہش ہے کہ ان جیسے بن جائیں، انھوں نے اپنی لڑکی کا نکاح اپنے ایک غریب بھتیجے سے کر دیا ہے، اور وہ اس قابل نہیں کہ اپنی بیٹی کی رخصتی کا انتظام کر سکیں۔ یہ سن کر حضرت ابن عباس ان علماء کو

اپنے گھر لے گئے اور ایک صندوق کھولکر اس میں سے درہموں کی چھ تھیلیاں نکالیں اور فرمایا کہ یہ لے جاؤ، پھر کہنے لگے کہ ٹھیرو، یہ کوئی انصاف کی بات نہیں کہ ہم ایک شخص کی عبادت میں خلل ڈالدیں، لہذا مجھے بھی ساتھ لیتے چلو تاکہ ہم سب اس کی بیٹی کی رخصتی میں اس کی مدد کریں، دنیا اتنی قابل قدر نہیں کہ مومن کی عبادت میں اس سے خلل ڈالا جائے، اور ہم اتنے بڑے نہیں کہ اولیاء اللہ کی خدمت نہ کریں۔

ایثار سخاوت کا اعلیٰ درجہ

بھائیو! ایک بات یہاں اور جان لیں کہ ایثار سخاوت کا اعلی درجہ ہے، اور ایثار کہتے ہیں خود پر دوسروں کو ترجیح دینا، خود کو بھوک لگی ہے مگر خود نہیں کھاتا دوسروں کو کھلاتا ہے، خود پیاسا ہے مگر دوسروں کو پلاتا ہے۔ حضرات صحابہ کی یہی خصوصیت تھی کہ وہ محض سخی نہیں تھے، بلکہ ایثار کرتے تھے۔ اسی لئے قرآن نے ان کی تعریف میں فرمایا کہ:

﴿ وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [الحشر: ۹]

(وہ حضرات اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود ان کو تنگی ہو)

یعنی خود کو بھوگ و پیاس وغیرہ کی پریشانی ہے، مگر اس کے باوجود وہ حضرات دوسروں کو دیتے ہیں اور خود صبر کر لیتے ہیں۔

صحابہ کا ایثار- واقعات کی روشنی میں

یہاں ان حضرات کے ایثار کی چند مثالیں سناتا ہوں، ان سے ان کے بلند مقامات کا کچھ تھوڑا سا اندازہ ہوسکتا ہے۔

حدیث وتفاسیر کی کتابوں میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے

پاس آئے اور انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے سخت فاقہ لگا ہے۔آپ نے اپنی عورتوں سے معلوم کیا کہ کوئی چیز تم لوگوں کے پاس ہے؟ لیکن کسی جگہ بھی کوئی کھانے کی چیز نہیں تھی۔آپ نے اعلان کیا کہ کوئی ہے جو ہمارے مہمان کی آج رات مہمان نوازی کرے؟ تو حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے ،انھوں نے کہا کہ میں ان کی مہمان نوازی کروں گا۔پھر ان کو اپنے گھر لے گئے ،اور اپنی بیوی سے کہا کہ مہمان رسول کی خاطر داری میں کوئی کسر نہ چھوڑنا ،ان کی بیوی نے کہا کہ آج ہمارے گھر سوائے بچوں کے کھانے کے کوئی چیز نہیں ہے۔انھوں نے کہا کہ بچوں کو بہلا پھسلا کر سلادو ،اور ہم بھی آج اللہ کے نبی کے مہمان کی خاطر بھوکے رہ جائیں گے اور جو کھانا ہے،اس کو لے آؤ،اور جب ہم کھانے بیٹھیں تو کسی بہانے سے چراغ بجھادو،تاکہ مہمان سمجھیں کہ ہم بھی ان کے ساتھ کھارہے ہیں۔ چنانچہ ان کی بیوی نے ایسا ہی کیا۔اس طرح مہمان کو سارا کھانا کھلا دیا اور خود وہ اور ان کے بیوی بچے سب بھوکے رہ گئے ۔ جب صبح ہوئی اور یہ حضرات رسول اللہ کی خدمت میں گئے تو آپ نے فرمایا کہ فلاں مرد وفلاں عورت سے اللہ نے تعجب کیا اور ان کے بارے میں آیت نازل کی ہے۔

پھر یہ آیت سنائی: ﴿وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ [الحشر:۹]

(وہ حضرات اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگر چہ خود ان کو تنگی ہو) (الدر المنثور:۸/۷ا۱،الکشف والبیان للنیسابوری:۹/۲۶۹)

اسی آیت کے شان نزول میں بعض مفسرین کرام نے یہ واقعہ بھی روایت کیا ہے کہ ایک صحابی کو کسی نے بکری کی سری ہدیہ میں بھیجی ،ان صحابی نے کہا کہ فلاں

بھائی صاحب اولاد ہیں، وہ مجھ سے زیادہ اس کے محتاج ہیں، لہذا ان کو دیدو۔ لہذا وہ سری ان کے گھر بھیج دی گئی۔ وہ دوسرے صحابی کہنے لگے کہ میرے سے فلاں صاحب محتاج ہیں، لہذا ان کو دیدو، وہ سری وہاں سے ایک تیسرے صحابی کے پاس پہنچی، اس طرح ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے گھر ہوتی ہوتی سات گھروں کا چکر لگا کر، اور بعض روایات میں ہے کہ نو گھروں کا چکر لگا کر وہ سری پھر پہلے صحابی کے پاس ہی آ گئی۔ اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

(الدر المنثور: ۸/۱۰۸، الکشف والبیان للنیسابوری: ۹/۲۶۹)

ایک اور حیرت انگیز واقعہ تاریخ نے محفوظ کیا ہے، وہ یہ کہ حضرت ابوجہم بن حذیفہ ایک صحابی ہیں اور انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی تھی، زمانہ جاہلیت بھی دیکھا اور زمانہ اسلام بھی دیکھا تھا، وہ کہتے ہیں کہ جنگ یرموک میں میرے چچازاد بھائی کو تلاش کرنے نکلا اور ساتھ میں ایک پانی کا مشکیزہ لے لیا تا کہ اگر وہ مل جائیں اور پانی کی ضرورت پڑے تو پریشانی نہ ہو، کہتے ہیں کہ میں نے ان کو ایک جگہ پالیا، وہ نزع کی حالت میں زخمی پڑے ہوئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ کیا میں تمہیں پانی پلاؤں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! اتنے میں ان کے قریب ایک اور شخص زخمی حالت میں پڑے ہوئے تھے انھوں نے آہ کی، میرے چچازاد بھائی نے کہا کہ پہلے ان کو پانی پلاؤ، دیکھا تو وہ حضرت عمرو بن العاص کے بھائی ہشام بن العاص تھے، میں ان کے پاس پہنچا اور کہا کہ کیا پانی پلاؤں؟ تو انھوں نے کہا کہ ہاں! اتنے میں ایک اور شخص کے کراہنے کی آواز آئی، تو ہشام کہنے لگے کہ اس کو پہلے پلا دو، حضرت ابوجہم کہتے ہیں کہ میں اس کے پاس پہنچا تو ان کا انتقال ہو چکا تھا، لہذا میں ہشام کے پاس آیا، دیکھا تو ان کا بھی انتقال ہو گیا ہے، یہ دیکھ کر میں اپنے چچازاد بھائی کے پاس آیا

کہ ان کو پانی پلا دوں ، مگر جب ان کے پاس پہنچا تو ان کا بھی وصال ہو چکا تھا۔
(مختصر تاریخ دمشق: ۱۴۲/۸)

یہ تھے حضرات صحابہ جن کے دلوں میں اللہ و رسول کی محبت اس طرح سمائی گئی تھی کہ وہ ہر چیز کو اس کے لئے قربان کر سکتے تھے۔ یہ اللہ و رسول کے عاشقین بھی تھے اور محبوبین بھی تھے۔

ایک اللہ والے غلام کا کتے پر ایثار

صحابہ تو بہ ہر حال صحابہ تھے، ان کے علاوہ بھی ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے بے مثال سخاوت و ایثار کا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ مجھے ایک غلام کا قصہ یاد آیا کہ عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنی ایک زمین کے سلسلہ میں ایک مقام پر گیا، وہاں ایک صاحب کے باغ میں بیٹھا تھا، دیکھا کہ ایک کالا غلام وہاں موجود ہے، اور کھانا کھا رہا ہے، اس کے پاس تین روٹیاں تھیں، اتنے میں ایک کتا آیا، اور اس غلام نے اس کتے کو ایک روٹی ڈالدی، کتا وہ روٹی کھا کر پھر آیا ، اس غلام نے ایک اور روٹی اس کو ڈالدی ، کتے نے وہ بھی کھالی اور پھر آ کھڑا ہوا، اس غلام نے آخری روٹی بھی اس کو ڈالدی۔ عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں کہ میں یہ سارا ماجرا ایک طرف بیٹھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس غلام سے پوچھا کہ روزانہ تجھے کتنی خوراک ملتی ہے؟ اس نے کہا کہ یہی جو آپ نے دیکھی یعنی تین روٹیاں، عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ تو نے تو ساری روٹیاں کتے کو ڈالدیں، اب تو کیا کھائے گا؟ اس نے کہا کہ میں بس بھوکا رہ جاؤں گا۔ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا؟ تو وہ کہنے لگا کہ اصل یہ ہے کہ یہ علاقہ کوئی کتوں کا نہیں ہے، یہ کتا کہیں دور سے بھوکا آیا ہے، میں نے یہ

اچھا نہیں سمجھا کہ میں تو کھالوں اور کتا کھڑا دیکھتا رہے۔

اللہ اکبر! یہ حیرت انگیز سخاوت وایثار ہے، جس کی نظیر ملنی مشکل ہے کہ خود بھوکا رہ کر کتے کو سارا کھانا کھلا دیا، آج لوگ اپنے بھائیوں تک کی طرف نظر نہیں کرتے، سگا بھائی پریشان ہے، خود فضول خرچی کرتے ہیں مگر اپنے بھائی کے کھانے پینے اور دوا دارو کا بھی خیال نہیں کرتے۔ ہمارے اسلاف کے یہ واقعات بتاتے ہیں کہ انھوں نے سخاوت کے ذریعہ مال لٹا کر محبت الٰہی کا خزانہ پالیا تھا۔اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ایک شخص کو اللہ کی محبت اپنا مال خرچ کر کے مل جائے تو اس سے سستا سودا کوئی نہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ

جیسے ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالی سے عرض کیا کہ اے اللہ! میں آپ کو پانا چاہتا ہوں۔آپ کی قیمت کیا ہے؟ اگر آپ کی قیمت معلوم ہو جائے تو کوشش کر کے آپ کو پالوں گا۔اللہ نے فرمایا کہ میری قیمت معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو کہ میری قیمت دونوں عالم ہیں۔اس پر وہ بزرگ وجد میں آ گئے اور اللہ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ! اگر آپ کی قیمت صرف یہ ہے کہ دو عالم دے دیئے جائیں تو یہ تو بہت سستا سودا ہے۔ کہنے لگے کہ

قیمتِ خود ہر دو عالم گفتۂ نرخ بالا کن، ارزانی ہنوز

یعنی آپ نے اپنی قیمت دو عالم بتائی ہے، اپنی قیمت میں اضافہ کیجئے، کہ یہ تو بہت کم ہے۔اس طرح اللہ کی محبت اگر دنیا کے ان معمولی ٹکوں کے بدلہ میں مل جائے تو بہت سستا سودا ہے۔

سخاوت کی بہت سی شکلیں ہیں

اب یہاں ایک بات اور سمجھ لیں کہ سخاوت صرف مال کی نہیں ہوتی ، بلکہ سخاوت بہت سی چیزوں کی ہوتی ہے۔ایک سخاوت تو مال کی ہوتی ہے جو مالدار لوگ کریں گے۔اور ایک سخاوت علم کی ہوتی ہے جو حضرات علماء کی جانب سے ہوتی ہے ،ایک سخاوت محنت و خدمت کی ہوتی ہے جو قوت و طاقت والوں کی طرف سے ہوتی ہے۔لہذا ہر شخص اپنے بساط اور اپنی استعداد کے مطابق سخاوت کر سکتا ہے۔کسی کے پاس مال نہیں ہے تو وہ اپنے علم یا محنت و خدمت کے ذریعہ سخاوت کرے،کسی کے پاس علم نہیں ہے تو وہ نیک لوگوں کی خدمت کرے ، اس طرح کسی نہ کسی طرح سخاوت کا درجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔اور اس سخاوت کا بھی یہی پھل ہے کہ اللہ اپنی محبت سے نوازتے ہیں۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالی ہم سب کو اپنی محبت و معرفت سے نوازیں اور اپنے محبوب بندوں میں شامل فرمائیں۔آمین۔

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

باسمہ تعالیٰ

انسانی دل ایک کمپیوٹر ہے

ایک حدیث کی جدید اور انوکھی تشریح

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ . اما بعد : فقد قال النبی ﷺ ﴿ **أَلَا اِنَّ فِي الْجَسَدِ لَمُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّه وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّه ، اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ** ﴾

(بخاری:۱۳/۱، مسلم:۸۲/۲)

دینی بھائیو! میں نے ایک حدیث پڑھی ہے جس میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ: ''کان کھول کر سن لو کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ صحیح رہتا ہے تو جسم کا پورا نظام صحیح رہتا ہے اور اگر وہ ٹیڑھا ہو جائے ،خراب ہو جائے تو جسم کا پورا نظام خراب ہو جاتا ہے، جان لو کہ وہ لوتھڑا دل ہے''۔

یہ ایک بہت ہی اہم حدیث ہے، جس میں اصلاح قلب کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ دل جسم کے اندر سب سے اہم ہے اور اسی پر جسم کا ظاہری نظام بھی قائم ہے اور باطنی نظام بھی ، لہذا دل کا نظام و سسٹم صحیح ہو تو جسم کا نظام صحیح رہتا ہے اور اگر دل کا سسٹم خراب ہو جاتا ہے تو جسم کا پورا نظام و سسٹم برباد ہو جاتا ہے۔

اس وقت میں اس حدیث کی تشریح کرنا چاہتا ہوں ، اور اللہ نے اس حدیث کی توضیح وتشریح میں ایک بات میرے دل میں ڈالی ہے، اسی کو اس وقت پیش کروں گا۔

بزرگو! ابھی کچھ دیر پہلے یہاں جامعہ میں دوصاحبان ملاقات کے لئے آئے تھے، جوایک سافٹ ویر کمپنی میں کام کرتے ہیں، انھوں نے کچھ اصلاحی باتیں سننے کی خواہش کی، ان سے گفتگو کے دوران ایک مضمون دل میں آیا اوراسی کے ساتھ مذکورہ حدیث کامفہوم اوراس کی شرح بھی سامنے آگئی، میں نے ان کے سامنے اسی کوپیش کردیا، میں اسی کو یہاں آپ حضرات کوبھی سنانا چاہتا ہوں۔

خطاب میں مخاطب کی رعایت

یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ موجودہ دور کمپیوٹر کا دور ہے، سافٹ ویر کا دور ہے، بنگلوربھی اس سافٹ ویر کی دنیا میں بہت آگے ہے، جوصاحبان آئے تھے وہ بھی سافٹ ویر کمپنی میں ملازمت کرتے ہیں، اس لئے میرے ذہن میں ایک بات اسی کے حوالہ سے آئی، کیونکہ خطاب میں مخاطب کی رعایت ضروری ہے، اگر مخاطب ہو جاہل اوراس سے خطاب کیا جائے عالمانہ وفاضلانہ تو وہ پوری بات نہیں سمجھ سکتا، اسی طرح مخاطب ہوعالم وفاضل اورخطاب میں وہ طریقہ استعمال کیاجائے جوایک عامی کے مناسب ہے تو یہ مناسب نہ ہوگا۔ پھراس میں بھی اگر ڈاکٹر سے اس کی اپنی اصطلاحات وزبان میں گفتگوکی جائے تووہ بہت جلد مانوس ہوجاتا ہے اور بات کا اثر جلدقبول کرتا ہے، اگرمخاطب انجینئر ہےاوراس سے گفتگو میں اس کی اصطلاحات کا سہارالیاجائےتواس کا بڑااثر مرتب ہوتا ہے۔علماءکواس کی بھی رعایت کرنا چاہئے۔ الغرض میں نے جب دیکھا کہ یہ لوگ سافٹ ویرانجینئر ہیں تو میں نے انہی کی زبان میں گفتگوشروع کی۔

کمپیوٹر میں تین چیزیں ہیں

ان کے سامنے جوعرض کیا گیا خلاصہ اس مضمون کا یہ ہے کہ کمپیوٹر میں دوچیزیں

ہوتی ہیں: ایک کو ہارڈ ویر (HARD WARE) کہتے ہیں، اور ہارڈ ویر اس کا ظاہری جسم ہے، جو نظر آتا ہے اور دوسری چیز سافٹ ویر (SOFT WARE) ہے، یہ دراصل کمپیوٹر کی جان و روح ہے۔ پھر ہارڈ ویر میں ایک تو اس کی ہارڈ ڈسک (HARD DISK) ہوتی ہے اور ایک اس کا مانیٹر (MONITOR) ہوتا ہے۔ اس طرح کمپیوٹر میں کل تین چیزیں ہوتی ہیں: ایک ہے مانیٹر، دوسری ہے ہارڈ ڈسک اور تیسری ہے سافٹ ویر (SOFT WARE)۔

اب سنئے کہ مانیٹر تو صرف یہ کام کرتا ہے کہ کمپیوٹر کے اندر کی چیزوں کو اسکرین پر دکھاتا اور ظاہر کرتا ہے، اس کے سوا اس کا کوئی کام نہیں۔ اور ہارڈ ڈسک اس میں اصل چیز اور س کی روح ہے، اسی سے کمپیوٹر کا پورا اسسٹم چلتا ہے۔ اور سافٹ ویر اس ہارڈ ڈسک میں ایک چیز ڈالی جاتی ہے، جب آپ سافٹ ویر اس میں ڈالیں گے تو وہ اس کو اخذ یعنی (catch) کر لے گا، اور پھر اسی چیز کو مانیٹر کے ذریعہ دکھائے گا، مانیٹر کا کام صرف مظاہرہ کا ہے، یعنی دکھانے کا، ڈسپلے کرنے کا، اصل چیز یہ نہیں ہے، یہ دراصل کمپیوٹر کا جسم ہے اور ہارڈ ڈسک اس کمپیوٹر کے جسم کا دل ہے اور جو اس کے اندر سافٹ ویر بھرا ہوا ہوتا ہے، وہ دراصل اس کی روح ہے۔

ہارڈ ڈسک کو آپ پکڑ سکتے ہیں، چھو سکتے ہیں، دکھا سکتے ہیں، بتا سکتے ہیں، خرید کے اسے ہاتھ میں اٹھا کر لا سکتے ہیں، لیکن سافٹ ویر جو ہارڈ ڈسک کے اندر ڈالا جاتا ہے اس کو آپ پکڑ نہیں سکتے، اس کو آپ چھو نہیں سکتے، یہ ایک معنوی چیز ہے، جو ہارڈ ڈسک کے اندر داخل کر دی جاتی ہے، جب آپ اسے اس کے اندر داخل کریں گے تو مانیٹر دکھائے گا کہ اس میں کیا کیا چیزیں ہیں، اس کے اندر جو جو عجیب و غریب چیزیں ہیں، وہ سب اس کے اندر سے نظر آئیں گی۔ اور سافٹ ویر

ڈالے بغیر کمپیوٹر کوئی کام نہیں کرسکتا، اس کو کام میں لانا ہو تو سافٹ ویر اس میں داخل کرنا پڑے گا۔

انسان کی تمثیل کمپیوٹر سے

جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب یہ سمجھو کہ اسی طرح انسان کی مثال ایک کمپیوٹر کی سی ہے، اور اس میں بھی دو چیزیں ہیں: ایک ہارڈ ویر ہے یہ اس کا جسم ہے، اور اس میں ایک ظاہری جسم ہے، یہ مانیٹر کے مانند ہے اور ایک اندرونی جسم ہے، یہ دل ہے، یہ ہارڈ ڈسک کی طرح ہے، اور یہ دونوں چیزیں انسان میں ہارڈ ویر کی طرح ہیں، اور اس ہارڈ ویر کو آپ پکڑ سکتے ہیں،، دیکھ سکتے ہیں، کسی کو دکھا بھی سکتے ہیں، دل کو بھی آپ نکالیں گے تو ہاتھ میں آجائے گا، اور یہ دیکھا بھی جا سکتا ہے، اور دکھایا بھی جاسکتا ہے۔ اور دوسری چیز اس دل میں ڈالی جانے والی چیز ہے، جیسے ایمان و کفر، نیکی یا برائی، طاعت یا معصیت وغیرہ، یہ اس انسانی کمپیوٹر کا سافٹ ویر ہے۔

بھائیو! اب غور کرو کہ جس طرح کمپیوٹر سافٹ ویر کے بغیر کام نہیں کرتا، اسی طرح دل کے اندر ایمان و نیکی کا سافٹ ویر داخل کئے بغیر انسان بھی صحیح طور پر کام نہیں کرسکتا، لہذا ایک سافٹ ویر آپ کو اپنے دل کے اندر داخل کرنا پڑے گا، جو سافٹ ویر داخل کریں گے وہی آپ کے اعمال وافعال سے نظر آئے گا، وہی آپ کے اندر سے نظر آئے گا، اور یہ نظر آئے گا کہاں؟ مانیٹر میں، اور وہ مانیٹر انسان کا جسم ہے۔ سافٹ ویر کو رکھنے والی چیز ہارڈ ڈسک ہے اور ہارڈ ڈسک کے اندر جس سافٹ ویر کو آپ نے داخل کر دیا ہے، اس کا مظاہرہ کرنے کے لیے جسم مانیٹر ہے، اس میں آپ کے سارے عمل جو اندر سے آئیں گے، وہ مظاہرہ میں آئیں گے، اچھا عمل،

برا عمل، نیکی وطاعت کا عمل، برائی ومعصیت کا عمل، شر کا عمل، خیر کا عمل، شیطانی عمل، رحمانی عمل، سب اسی جسم پر ظاہر ہوگا، لیکن ظاہر کیسے ہوگا؟ دل کی وجہ سے ظاہر ہوگا، لیکن دل بھی یہ کام خودنہیں کرتا، بلکہ جو سافٹ ویر آپ اس میں ڈالیں گے، اسی سافٹ ویر کو آپ کے اعضاء سے دکھائے گا۔

یہ مثال میری سمجھ میں آئی اور مجھے یہ حدیث بھی سمجھ میں آئی کہ اللہ کے نبی کہتے ہیں کہ جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے وہ دل ہے، جب وہ صحیح رہتا ہے، یعنی جب اچھا سافٹ ویر اس میں داخل کیا جاتا ہے، جب اسے صالح بنایا جاتا ہے، اسے ڈھنگ کا بنایا جاتا ہے، اس کے اندر بہترین چیزیں داخل کی جاتی ہیں تو جسم بھی صحیح وسالم رہتا ہے، اور اگر دل کی ہارڈ ڈسک میں کوئی گندہ سافٹ ویر ڈال دیا تو جسم سے بھی برائی وخباثت ہی ظاہر ہوگی۔

دل کے لئے ایمانی سافٹ ویر

اب سنئے کہ اعمال واخلاق جو جسم سے ظاہر ہوتے ہیں ان کے صحیح واچھے ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دل میں ایمانی سافٹ ویر داخل کئے جائیں، یہ ایمانی سافٹ ویر کیا ہیں؟ یہ محبت وعشق الٰہی، ذکر و یاد الٰہی، خوف وخشیت الٰہی، توکل و اعتماد علی اللہ، انابت وتوجہ الی اللہ، اخلاص وللّٰہیت، خشوع وخضوع، عشق رسول، عظمت رسول، خوف وفکر آخرت، زہد وقناعت، وغیرہ کے سافٹ ویر ہیں۔ مثال کے طور پر خوفِ خداوندی کا سافٹ ویر اس میں آپ داخل کردیں، محبت خداوندی کا سافٹ ویر آپ اس میں داخل کردیں، اور عشقِ محمدی کا سافٹ ویر آپ اس میں داخل کردیں اور اسی طریقہ پر آپ اس کے اندر اخلاص کا سافٹ ویر داخل کردیں، تواضع کا ایک سافٹ ویر داخل کردیں، اسی طرح بہت سارے یہ سافٹ ویر داخل

کئے جا سکتے ہیں، جب اس قسم کے سافٹ ویر اس میں داخل کر دیں گے تو اب آپ کے اس مانیٹر سے یعنی جسم کے اعضاء سے، اسی طرح کے نیک وعمدہ اعمال وافعال آنے لگیں گے، اب اس سے تواضع چھلکتی ہے، اخلاص اس سے ظاہر ہوتا ہے، اللہ کا خوف محسوس ہوتا ہے، کبھی آنسو چھلک پڑتے ہیں، کبھی دل میں اللہ کے ڈر اور خوف کی وجہ سے ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہونے لگتی ہے، آدمی کا دل بھی، دماغ بھی سب اس سے متاثر ہوتے ہے، اللہ کی محبت آجاتی ہے، نمازوں کی طرف دل چلنے لگتا ہے، خشوع وخضوع کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، دماغ آخرت کے کاموں کی طرف چلنے لگتا ہے۔

یہ ساری باتیں جو آپ کے جسم کے مانیٹر سے ظہور میں آتی ہیں، یہ دراصل دل کی ہارڈ ڈسک کی وجہ سے ہیں بلکہ اس کے اندر جو پڑا ہوا سافٹ ویر ہے اس کی وجہ سے ہیں۔

شیطانی سافٹ ویر

اس کے برخلاف دل کو بگاڑنے والے سافٹ ویر بھی ہوتے ہیں، جو ایمانی سافٹ ویر کے برخلاف دل کو تباہ وبرباد کرتے ہیں، جیسے مثال کے طور پر اللہ سے غفلت کا سافٹ ویر، دنیا کی محبت کا سافٹ ویر، تکبر کا سافٹ ویر، یا ریا کاری کا سافٹ ویر، خواہش نفس کا سافٹ ویر، آخرت سے غفلت کا سافٹ ویر، وغیرہ۔ اور فرض کیجئے کہ آپ نے دل کی اس ہارڈ ڈسک میں جیسے دنیا کے لوگ کمپیوٹر میں غلط سافٹ ویر بھی داخل کر دیتے ہیں۔ مثلاً اس کے اندر ناچ گانا، فحش وعریاں تصاویر، حیا سوز مناظر، یا ایمان سوز باتیں، اسی طرح مختلف قسم کی گندی اور خبیث قسم کی چیزیں، شیطانی قسم کے اعمال کے سافٹ ویر اس میں داخل کر دیتے ہیں، اس طرح

کے شیطانی سافٹ ویرانسٹال کردے تو جو سافٹ ویراس میں رہے گا، وہی نظر آئے گا، آپ اسے کھولیں گے تو ننگے ناچ بھی نظر آئیں گے، خباثتیں بھی نظر آئیں گی، شرارتیں بھی نظر آئیں گی۔

اسی طرح دل کے اندر اگر غلط سافٹ ویر آپ نے داخل کر دیا تو آپ کے اعمال سے بھی اور آپ کے جسم کے مانیٹر سے بھی وہی سب چیزیں چھلکیں گی۔

لہٰذا جو خبائث ورذائل ہمارے اعمال سے صادر ہوتے ہیں وہ دراصل دل کی ہارڈ ڈسک کی وجہ سے ہوتے ہیں۔

حدیث مذکور کی شرح

اس تمہید کے بعد اب سنئے کہ اللہ کے نبی ﷺ اسی کو فرماتے ہیں کہ جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے:

''**اِذَا صَلُحَتْ**'' (جب یہ لوتھڑا صحیح رہتا ہے)، اچھا سافٹ ویر اس میں داخل کیا جاتا ہے ایمان کا، طاعت وعبادت کے چسکہ کا، محبت الٰہی کا، خوف الٰہی کا، تقوی وتزکیہ کا اخلاس وللّٰہیت کا، خوف وفکر آخرت کا تو پھر کیا ہوتا ہے:

''**صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّه**'' (پورے جسم کا نظام صحیح طور پر قائم رہتا ہے) اور اس کے مانیٹر سے بھی اچھے اچھے اعمال، اچھی اچھی باتیں صادر ہوتی ہیں۔ زبان سے اللہ کا ذکر، دین کی باتیں، لوگوں کی بھلائی کی باتیں صادر ہوں گی، ہاتھ پیر سے نیک اعمال واخلاق کا ظہور ہوگا، کانوں اور آنکھوں سے بھی صلاح وتقوی نکلے گا۔

''**وَاِذَا فَسَدَتْ**'' (اور اگر یہ لوتھڑا خراب وفاسد ہو جاتا ہے) غلط سافٹ ویر اس میں داخل کر دیا جاتا ہے، بے ایمانی کا، غفلت کا، معصیت کا، تکبر وعجب کا، دنیا

کی محبت کا، اور یہ دل کا ہارڈ ڈسک خراب ہوجائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

"فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّه" (تو پورا جسم کا نظام خراب ہوجائے گا) پھر پورے جسم سے غلط ہی غلط چیزیں نظر آئیں گی، حیا سوز و ایمان سوز اعمال صادر ہوں گے، کفر و شرک دکھائی دے گا، معصیت و گناہ کی باتیں ظاہر ہوں گی، نہ زبان ٹھیک چلے گی، نہ ہاتھ پیر صحیح کام کریں گے، نہ آنکھ و کان ڈھنگ و سلیقہ کے ہوں گے، الغرض سارا جسم غلط ہی کام کرے گا۔

حضرات صوفیاء کا کام

لہذا انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے دل میں اچھے اچھے سافٹ ویر داخل کرے اور برے و گندے سافٹ ویر سے پرہیز کرے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرات صوفیاء کا یہی کام ہے، وہ آپ کے دل کو نیکی و طاعت کے جذبات سے بھر دینا چاہتے ہیں، وہ اللہ کی محبت و معرفت سے قلوب کو لبریز کرنا چاہتے ہیں، دنیا کی محبت سے دلوں کو خالی کرنا چاہتے ہیں، لہذا حضرات مشائخ کے یہاں جو محنت ہوتی ہے، اس محنت کا خلاصہ اگر آج کی کمپیوٹر کی زبان میں، سائنس کی زبان میں پیش کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ مشائخ دو کام کرتے ہیں: ایک یہ کہ آپ کو اچھے سافٹ ویر اپنے جسم میں داخل کرنے کی تلقین اور گندے سافٹ ویر سے دور رہنے کی تعلیم دیا کرتے ہیں، اور دوسرے یہ کہ وہ خود یہ سافٹ ویر فراہم بھی کرتے ہیں، اس کی دکان انہی کے پاس ہے۔

دل کا سافٹ ویر کہاں ملے گا؟

اگر آپ کہیں کہ وہ ایمانی و روحانی سافٹ ویر کہاں ملے گا؟ یہ دنیا کے سافٹ ویر تو ہم کو مل جاتے ہیں، بہت سی کمپنیاں ان کو بناتی ہیں، اور اس کے ایڈورٹائیز آتے

رہتے ہیں ،اخبار میں ایڈورٹائیز ، رسائل وجرائد میں ایڈورٹائیز،اسی طرح ٹیلی ویژن میں اس کا ایڈورٹائیز ،ہرجگہ پراس کا ایڈورٹائیز ہوتا ہے ،بورڈ بہت بڑے بڑے لگے ہوئے ہیں ، اوران کی کمپنیاں بڑی بڑی عمارتوں میں قائم ہیں ،نظرآتی رہتی ہیں۔مگر دل کا سافٹ ویر کہاں ملے گا؟

قرآن کریم نے اس کا جواب دیا ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴾ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرواور نیک لوگوں کے ساتھ رہو)

اگر جدید انداز میں موجودہ حالات کے پیش نظر یوں ترجمہ کریں تو بھی صحیح ہے کہ ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈر کا سافٹ ویر خریدلو) یہ آج کا جدید ترجمہ ہے،لوگ چاہتے بھی ہیں کہ جدید جدید ترجمے ہوں ، لیجئے جدید ترجمہ میں کرر ہا ہوں۔

اس پرسوال پیدا ہوا کہ یہ سافٹ ویر کہاں سے خریدیں؟ تو اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ:﴿وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (نیک لوگوں کی مجلسوں کو چلے جاؤ، ان کے پاس یہ سافٹ ویر مل جائے گا) نیک لوگوں کی معیت میں ،مجلس میں ،صحبت میں ،نیکوں کے قریب رہنے سے وہ سافٹ ویر تم کو مل سکتا ہے۔

معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ کی مجالس میں ، اولیاء اللہ کی صحبتوں میں اللہ نے وہ سافٹ ویر رکھ دیا ہے، جو آدمی ان کی صحبت میں بصدق دل رہتا ہے،اسے خریدنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی ، دنیا کے سافٹ ویر تو ہزاروں روپے دے کر خریدنا پڑتا ہے ،لیکن یہاں اولیاء اللہ کے پاس سے تو یہ سافٹ ویر مفت میں کاپی (copy) ہوجاتا اور منتقل ہوتا رہتا ہے۔یہ اللہ والے دل کی ہارڈ ڈسک میں داخل کئے جانے والے سافٹ ویر کے ''سافٹ ویر انجینیر '' بھی ہیں ،اوراس کے ڈیلر بھی

مگران کے یہاں کی ڈیلنگ بھی عجیب ہے کہ سب کو مفت میں دیتے ہیں۔لہذا جس کو یہ روحانی وایمانی سافٹ ویر چاہیئے اس کو اولیاء اللہ وصالحین کی خدمت میں جانا چاہیئے،اوران سے یہ حاصل کرنا چاہیئے۔

دل کا وائرس[virus]

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لیں کہ کمپیوٹر کی دنیا میں ایک چیز اور بھی ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ کمپیوٹر والے کہتے ہیں کہ کمپیوٹر میں وائرس [virus] آجاتا ہے، جس کی وجہ سے کمپیوٹر کھولتے ہیں تو اسٹارٹ ہی نہیں ہوتا، اور کبھی اسٹک ہوجاتا ہے اور کبھی بہت دیر سے چلتا ہے، اور اس کی وجہ سے اس میں ڈلے ہوئے سافٹ ویر خراب ہوجاتے ہیں۔

اب سافٹ ویر انجینیر دیکھ کر کہتا ہے کہ اس میں وائرس [virus] آگیا ہے۔ کیا ہے وائرس؟ کیا بلا ہے یہ؟ وائرس کہتے ہیں زہریلے مادہ کو، جب یہ وائرس زہریلا مادہ کمپیوٹر پر حملہ کرتا ہے تو اس کے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے، یہ تو کمپیوٹر کا وائرس ہے، اور ہمارے دل کے لحاظ سے اور آپ کو سمجھانے کے لیے وائرس کا ایک ترجمہ میں یہ کرسکتا ہوں کہ وائرس ہے ''شیطان''، وائرس کیا ہے؟ اس ہمارے کمپیوٹر کے شیطان کا نام ''وائرس'' ہے۔لہذا یہ بھی جب ہم پر حملہ کرتا ہے تو ہمارے پورے نظام کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا ہے، دل خراب، دماغ خراب، آنکھیں خراب، کان خراب، زبان خراب، ہاتھ پیر خراب، سارے اعضاء نکمے ہوجاتے ہیں۔

اس شیطانی وائرس کا ذکر حدیث میں آیا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: ''**اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّم**''

(کہ شیطان انسان کے اندر خون کی طرح یا خون کی رگوں میں دوڑتا ہے) (صحیح بخاری:۲۰۳۸،صحیح مسلم:۵۸۰۷،صحیح ابن حبان:۳۷۴۱)

اس حدیث میں ایک لفظ آیا ہے:''مجری الدم''اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ یہ لفظ''مجری''مصدر ہو اور دوڑنے کے معنے میں ہو،اس صورت میں اس حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ شیطان انسان کے اندر اس طرح دوڑتا ہے جس طرح اس کے اندر خون دوڑتا ہے۔اور یہ مجری اس صورت میں''یجری'' کا مفعول مطلق ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ یہ''مجری''اسم ظرف ہو،اور دوڑنے کی جگہ کے معنے میں ہو،اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ: شیطان انسان کے اندر خون دوڑنے کی جگہ میں یعنی اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔پہلی صورت میں یہ بتایا ہے کہ شیطان انسان کے اندر دوڑتا ہے،مگر کہاں دوڑتا ہے؟ یہ نہیں بتایا گیا۔اور دوسری صورت میں یہ بتایا گیا ہے کہ شیطان انسان کے اندر کہاں دوڑتا ہے؟ خون دوڑنے کی جگہ میں دوڑتا ہے،یعنی رگوں میں دوڑتا ہے۔الغرض شیطان انسان کے اندر دوڑتا ہے،داخل ہوتا ہے۔اور اس طرح یہ وائرس اس کو بیکار و خراب کرتا ہے۔

دل کا اینٹی وائرس (Anti-Virus)

اس لئے جس طرح کمپیوٹر کو وائرس سے بچایا جاتا ہے اسی طرح ہمیں بھی خود کو شیطان سے بچانا ضروری ہے۔اب سوال یہ ہے کہ اس وائرس سے کیسے بچیں؟ کمپیوٹر والے کہتے ہیں کہ وائرس بڑا خبیث ہوتا ہے،اس کو ختم کرنے کے لیے اینٹی وائرس (Anti - Virus) سافٹ ویر بھی کمپیوٹر میں داخل کیا جاتا ہے۔اینٹی وائرس کا مطلب''زہر مخالف''سافٹ ویر،اور وہاں جس طرح اینٹی وائرس ضروری ہے اسی طرح دل کے لئے ایک اینٹی وائرس یعنی''شیطان کا مخالف''سافٹ ویر

چاہئے۔اینٹی'' کے معنی''مخالف''، جیسے اینٹی اسلام کے معنی کیا؟ اسلام مخالف۔اسی طرح اینٹی وائرس کا مطلب ہوا''وائرس مخالف'' یہ وائرس اس میں آ گیا، اس کا ایک مخالف ایک سافٹ ویراس میں داخل کرنا پڑتا ہے، جب آپ اس میں وہ ڈالیں تو جونہی وائرس اس میں داخل ہوگا، فوراً وہ بتائے گا کہ آپ کے کمپیوٹر میں وائرس آ گیا ہے، مجھے کام میں لاؤ، میں اس کو پکڑ کے ختم کردوں گا۔اگر آپ نے اس پر کلک کردیا، تو کلک کرتے ہی وہ فوراً اسے پکڑ کر جہاں بھی ہوگا اسے ختم کردے گا۔ یہ ہے اینٹی وائرس سافٹ ویر۔

اسی طرح بھائیو! ہمارے دل کے لئے بھی ایک اینٹی وائرس سافٹ ویر کی ضرورت ہے، تاکہ ہمارا نظام دل وجسم خراب نہ ہوجائے۔یہ اینٹی وائرس کیا ہے؟ وہ اللہ کا ڈروخوف ہے، اور یہ''خوف الہی کا اینٹی وائرس سافٹ ویر'' بھی حضرات اولیاء اللہ ہی ہمارے دل میں داخل کرتے ہیں۔اور اسی کا نام''اینٹی شیطان'' ہے۔تو خوفِ الٰہی کے اینٹی وائرس کو دل میں ڈال کے چھوڑ دو، اب وہ دل میں پڑا رہے گا، جہاں کہیں شیطان آپ کے جسم پر حملہ کرے گا، یا دل میں گھس کر بہکائے گا تو وہ فوراً پکڑ لے گا، اور اس کو باہر نکال دے گا۔

خلاصہ کلام

میرے بھائیو! اس تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے اندر دل اصل ہے، اس کی اچھائی و برائی کا اثر ہمارے ظاہر پر پڑتا ہے، دل اچھا تو سب اچھا، دل برا تو سب برا، لہذا ہمیں ضرورت ہے کہ ہم اپنے دل کی اصلاح وتزکیہ کا کام کریں، اور اس کا طریق یہ سمجھ میں آیا کہ اس میں ایمانی وروحانی سافٹ ویر داخل کریں، یہی کہنا ہے کہ ہمارے دلوں میں بہترین سافٹ ویر داخل کرنے کی ضرورت ہے۔اللہ

کے عشق کا، اللہ کے خوف کا، اللہ کے تقویٰ کا اور اسی طریقہ پر اخلاص کا، اور تواضع کا، اور نیکیوں کا، نماز سے لگاؤ کا اور دین کے کاموں سے الفت ومحبت کا، یہ سب سافٹ ویر ہیں اور ایک کمپیوٹر میں بہت سارے سافٹ ویر داخل کیے جاسکتے ہیں ، اور وہ سب کام کر سکتے ہیں ۔اسی طرح برے وخبیث سافٹ ویر سے اس کو دور رکھیں ، نیز شیطانی وائرس سے اس کو بچائیں ،مگر یہ ایمانی وروحانی سافٹ ویر کہاں ملے گا ؟ یہ اہل اللہ کی خدمت میں جانے سے ملے گا ، اسی طرح وائرس سے بچانے کے لئے اس دل کی ہارڈ ڈسک میں اینٹی وائرس داخل کرنے کی ضرورت ہے ، اور یہ بھی اہل اللہ کے پاس ملے گا ، لہذا ان کی خدمت میں جایا جائے اور ان کو حاصل کیا جائے ۔

اسی طرح دل کی اس ہارڈ ڈسک کے اندر آپ ان سافٹ ویروں کو داخل کر دیجئے وہ سب اندر پڑے پڑے آپ کو بہترین انسان بنائیں گے ، اور آپ کے مانیٹر سے یعنی جسم کے اعضاء سے بہترین اعمال صادر کر کے لوگوں کو بتائیں گے ۔

اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی سمجھ عطا فرمائے اور عمل کی بھی توفیق عطا فرمائے ۔

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

باسمہ تعالیٰ

نبی ﷺ کی ذات اسوۂ حسنہ

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . اما بعد فقد قا ل

اللّٰہ تعالیٰ فی القرآن الکریم :

﴿ لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃ ﴾ (الاحزاب:۲۱)

(تحقیق کہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے)

بلا اتباع نبی کوئی اللہ تک نہیں پہنچ سکتا

قرآن اور حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لئے قابل تقلید بنانے کا مختلف جگہ متعدد عنوانات کے ساتھ ذکر موجود ہے اور اولیاء اللہ کا بلکہ تمام امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر کوئی بھی شخص اللہ کے دربار میں کوئی مقام حاصل نہیں کرسکتا، حضور کی اتباع کے ذریعہ ہی محبت خداوندی کا دروازہ کھلتا ہے، اگر اتباع محمدی کے بغیر کوئی شخص محبت خداوندی کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو قیامت تک نہیں کھل سکتا، یہی ایک راستہ ہے جو اللہ نے خود مقرر کردیا ہے، جب اللہ خود کسی راستے کو متعین کردے، مقرر کردے اور یہ بتادے کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے، تو پھر کسی اور راستے

پر چلنے سے کامیابی کیسے مل سکتی ہے؟

تو معلوم ہوا کہ یہی ایک راستہ ہے اللہ کی محبت کا اور اللہ کے راستے میں چلنے کا کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی جائے، اسی لئے قرآن میں اللہ تعالی نے دوسری جگہ فرمایا ہے: ﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ﴾ (اے نبی ﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کو چاہتے ہوتو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے) (آل عمران:۳۱)

باقی تجارت میں، دنیا میں، دنیا کی چیزوں میں آگے بڑھ جائے تو وہ الگ بات ہے، لیکن اللہ کے دربار میں کوئی مقام، کوئی منزلت آدمی کو اسی وقت ملتی ہے اور مل سکتی ہے جبکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا ہو، اور آپ کی اتباع تمام معاملات کے اندر ضروری ہے، عقائد میں، عبادات میں، معاملات میں، معاشرت میں، اخلاق میں، سیاست میں، تعلیم میں، تہذیب میں، تمدن میں، تمام چیزوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔

اُسوہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ﴾

(تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے)

محض اسوہ نہیں کہا، بلکہ اسوۂ حسنہ، یعنی بہترین اسوہ و بہترین نمونہ فرمایا، اسوہ اور نمونہ وہ چیز ہوتی ہے جس کو دیکھ کر دوسری چیز تیار کی جاتی ہے، جیسے کپڑوں کا جوڑا نمونے کے طور پر دیا جاتا ہے؛ تاکہ اسکے مطابق دوسرا کپڑا ڈھالا جائے، سیا جائے، گھر کا ماڈل دیا جاتا ہے؛ تاکہ دوسرا گھر اسی کے مطابق بنایا جائے، جوتے کا ماڈل

دیا جاتا ہے تاکہ اسی کے مطابق دوسرا جوتا تیار کیا جائے۔

اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور آپ کی زندگی کا عمل ساری دنیائے انسانیت کیلئے ایک ''ماڈل'' ہے اور ''بہترین نمونہ'' ہے، عقائد ہیں تو اس میں بھی آپ نمونہ ہیں، اعمال وعبادات ہیں تو اس میں بھی آپ نمونہ ہیں، معاشرت وتہذیب ہے تو اس میں بھی نمونہ ہیں، اور اخلاق ہیں تو اس میں بھی آپ ہمارے لئے نمونہ ہیں، اسی طرح تمام معاملات میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ ہیں، پھر اسی کے ساتھ آپ کی آنکھیں نمونہ ہیں ہماری آنکھوں کے لئے، آپ کے کان نمونہ ہیں ہمارے کانوں کے لئے، آپ کا دل نمونہ ہے ہمارے دل کے لئے، اسی طرح آپ کی زبان نمونہ ہے ہماری زبان کے لئے، آپ کے ہاتھ پیر نمونہ ہیں ہمارے ہاتھ پیر کے لئے۔

انسان اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مشین ہے

اس کو اس طرح سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مشین کی طرح بنایا ہے، اس کے اندر بہت سے پرزے لگے ہوئے ہیں اور یہ ایسی مشین ہے جس کے اندر ہر پرزہ اپنا اپنا کام کرتا ہے، جیسے دل ایک پرزہ ہے، زبان ایک پرزہ ہے، آنکھ، ناک، کان ان میں سے ہر ایک ایک ایک پرزہ اور پارٹ ہے، ہاتھ، پیر یہ الگ الگ پرزے ہیں، اس کے علاوہ بہت سے اجزاء، اعضاء، بہت سے پارٹس، بہت سے پرزے، اس مشین میں لگے ہوئے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ مشین ایک ہے، لیکن اس کا ہر پارٹ الگ پارٹ ادا کرتا ہے، یعنی الگ الگ کام کرتا ہے بہت سی مشینیں دنیا میں ایسی ہوتی ہیں کہ بہت سے پارٹ ملنے کے بعد کام ایک ہی کرتے ہیں۔ مثلاً: ''فریج'' ہے، فریج میں بہت سے پارٹس ہیں، لیکن پورے پارٹس مل کر کام تو ایک ہی کرتے ہیں، اسی طریقے پر ''بس'' ہے ایک مشین ہے، اس کے اندر بہت سے پارٹس

ہیں وہ پورے پارٹس مل کر جب کام کرتے ہیں تو کام تو ایک ہی ہوتا ہے۔

لیکن ہماری مشین جو اللہ نے بنائی ہے، یہ مشین ایسی ہے کہ اس کا ہر پارٹ کام کرتا ہے اور ہر ایک کا کام الگ الگ ہوتا ہے، یہ نہیں کہ پورے اجزاء اور پارٹس مل کر ایک ہی کام کرتے ہوں، مثلاً ناک کا کام الگ ہے، اس کی مستقل ایک ڈیوٹی ہے، زبان کا جو کام ہے وہ مستقل کام، آنکھ کا جو کام ہے وہ مستقل کام، اسی طرح کان کا کام ہے تو وہ مستقل کام، اس طرح ہر پارٹ الگ الگ کام کرتا ہے۔

کتاب اللہ اور رجال اللہ اس مشین کو چلانا سکھاتے ہیں

اس مشین کو چلانے کے لئے اور صحیح نہج پر اسکو (Active) کرنے کیلئے اور صحیح نہج پر اس کی نگرانی کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک تو اپنی کتاب نازل کی جس کے اندر اس کے اصول وطریقے بتادیئے کہ یہ مشین تمہیں ان ان اصولوں پر اور اس اس طرح چلانا ہے، لیکن مشین چلانے کیلئے صرف صحیفوں و کتابوں میں لکھے ہوئے حروف اور نقوش کام نہیں آتے، بلکہ اسے عملاً (Practical) بھی بتانا ضروری ہوتا ہے، اس کے لئے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔

اس کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے کوئی فیکٹری (Factory) مشین تیار کرتی ہے تو اس کا بروشر (Brochure) بھی تیار کرتی ہے اور ساتھ ساتھ کچھ اس مشین کو چلانے کے لئے اور اس کا مظاہرہ کرنے کے لئے بھی کچھ لوگ تیار کئے جاتے ہیں، وہ آکر آپ کو بتاتے ہیں کہ اس مشین کو چلانے کے لئے پہلے یہ بٹن دبانا ہے، پھر یہ بٹن دبانا ہے، اور اس طرح سے کام لینا ہے، اگر ایسا ہو جائے تو ایسا کرنا ہے، اور ایسا ہو جائے تو یوں کرنا ہے۔ ایک طرف بروشر میں بھی یہ پورا طریقہ لکھا ہوا ہوتا ہے، اور اس کے اندر ہر ہر پارٹ کی تصویر بھی ہوتی ہے اور ان کے نام کی نشاندہی بھی کی جاتی

ہے، پھر ہر پارٹ کا کام بھی بتایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کا طریقہ بھی بتایا جاتا ہے، کہ اس کو کس طرح (Operate) کرنا چاہیئے، الغرض بروشر میں سب کچھ لکھا ہوا موجود ہوتا ہے، لیکن کتنے لوگ ہیں جو صرف اس کو دیکھ کر چلانا سیکھ لیتے ہیں؟ شاید ہزاروں میں ایک ہوگا۔ جب دنیا کی مشین میں صرف لکھا ہوا کام نہیں آتا، بلکہ اس کے لئے کچھ (Practical) بتانے والے ضروری ہوتے ہیں تو پھر آپ سوچئے کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی مشین جو بہت بامقصد طور پر پیدا کی گئی ہے، اس کے ہر ہر جزء میں، ہر ہر پارٹ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بڑی حکمتیں، بڑی مصلحتیں رکھی ہیں اور انکا الگ الگ کام مقرر کر دیا ہے اور اس کام کو لینے کیلئے اس کا ایک طریقہ بھی مقرر کر دیا ہے کہ اس طریقہ پر اس سے یہ کام لینا ہے، تو پھر اس کو بتانے کیلئے صرف صحیفہء خداوندی کافی نہ تھا، بلکہ رجال خداوندی کی بھی ضرورت تھی، اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ اللہ نے شروع دور سے ایک طرف کتاب اللہ کا سلسلہ جاری کیا ہے تو دوسری طرف رجال اللہ کا بھی سلسلہ جاری کیا ہے، اللہ کی کتاب بھی آتی ہے اور اللہ کی طرف سے کچھ رجال کار بھی آتے ہیں، وہ آکر بتاتے ہیں کہ یہ طریقہ زندگی کرنے کا ہے، اس مشین کے چلانے کا، اس کے استعمال کرنے کا، اگر اس مشین کو اس کے برخلاف استعمال کرو گے تو یہ خراب ہو جائیگی، اور اگر صحیح طریقہ پر استعمال کرو تو ٹھیک وصحیح سالم رہے گی۔

بہت سے انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام آئے اور آخر میں ہمارے اور آپ کے آقا حضرت سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اور آپ نے اپنی زندگی کے اندر ایک ایک چیز کے بارے میں تفصیلی معلومات اور عملی طور پر اس کا ایک نمونہ ہمارے سامنے رکھ دیا، آنکھ کے بارے میں بھی رکھا، کان کے بارے میں بھی رکھا، دل کے بارے میں بھی رکھا، زبان کے بارے میں بھی رکھا،

ہاتھ پیر کے بارے میں بھی رکھا کہ یہ سب کے سب اجزاء اور پارٹ کس طرح استعمال میں لانا ہے اور ان کو اگر غلط استعمال کریں گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟ یہی بات ہمیں اور آپ کو سیکھنا ہے، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے ذریعے سے کہ ہماری اس مشین کو جو اللہ کی بنائی ہوئی ہے، دنیا میں ٹھیک ٹھیک چلا کر اس کو استعمال کر کے کیسے اس سے کام لیں۔

یہ مشین بطور امانت دی گئی ہے

یاد رکھیں کہ یہ اللہ کی عطا کردہ مشین ہے اور ہم کو بطور امانت دی گئی ہے، بطور ملکیت نہیں دی گئی ہے، ایک ہوتا ہے بطور ملکیت دیدینا اور ایک ہوتا ہے بطور امانت اور ودیعت دینا، بطور ملکیت دیدینے پر ہم مختار کل ہوتے ہیں جو چاہیں کریں، لیکن اللہ نے ہم کو بطور ملکیت نہیں دیا، ہم کو اس کی (Ownership) نہیں دی بلکہ ہمارے پاس محض بطور امانت کے رکھی ہوئی ہے۔ اسی لئے ایک حدیث میں اللہ کے نبی ﷺ نے اللہ کو مخاطب بنا کر عرض کیا ہے کہ: أللّٰهم ان قلوبنا و جوارحنا بيدك ، لم تملكنا منها شيئا ، فاذا فعلت ذلك بهما فكن أنت ولينا ''(اے اللہ! بلا شبہ ہمارے قلوب اور اعضاء آپ کے قبضہ میں ہیں، ان میں سے کسی چیز کا آپ نے ہمیں مالک نہیں بنایا، پس جب آپ ان کو ایسا کریں تو آپ ہی ہمارے محافظ بن جائیں) (الجامع الصغیر: ۱۵۱۲، کنز العمال: ۳۶۴۴)

معلوم ہوا کہ ہم ہمارے اعضاء کے مالک نہیں ہے کہ جو چاہیں کریں ، بلکہ صرف امین ہیں۔ اسی لیے علماء نے مسئلہ لکھا ہے کہ ہمارے اس جسم کا کوئی عضو اور پارٹ اٹھا کر ہم اپنی مرضی سے کسی کو نہیں دے سکتے ، مثلاً آپ کے جی میں آیا کہ اپنے بھائی کو میں اپنا گردہ دیدوں، اپنی آنکھ کسی کو دیدوں تو یہ جائز نہیں ہے۔

آپ کو کیا اختیار ہے؟ کیا یہ آپ کی اپنی Body ہے؟ آپ کا جسم ہے؟ آپ کی آنکھیں ہیں؟ آپ کے گردے ہیں؟ آپ کا دل ہے؟ نہیں، بلکہ یہ تو سب اللہ کا ہے اور اللہ کی اجازت کے بغیر اس میں کسی کو تصرف کا حق نہیں ہے، اس لیے مسئلہ یہ ہے کہ ان اجزاء واعضاء میں سے کسی عضو کو بغیر اللہ کی مرضی کے نہیں دے سکتے۔

اب رہا یہ کہ اللہ کی مرضی کب ہے، کب نہیں، کیسے معلوم ہوگا؟ آپ مفتی سے پوچھیں، مفتی بتائے گا کہ اللہ کی مرضی ہے کہ نہیں، اس لیے کہ وہ قرآن میں غور کریگا، احادیث میں غور کریگا، دلائل میں غور کریگا، اور فتوی دیگا۔

اگر مشین کا غلط استعمال ہو تو خراب ہو جائیگی

ایک اور بات بھی یہاں سمجھ لیں کہ مشین کا استعمال اگر غلط ہوا اور آپ اس سے وہ کام کرنا چاہیں جو اس کے فساد وخرابی کا سبب بنے تو وہ مشین خراب ہو جائیگی اور اس کے اوپر کچھ دوسرے اثرات مرتب ہو جائیں گے۔ یہاں یہ سمجھ لیں کہ کسی بھی چیز کا استعمال صحیح اسی وقت ہوگا جب اس میں دو باتوں کا دھیان دیں گے: ایک تو یہ کہ اس چیز کو اسی کے مقصد میں استعمال کیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کو اسی طریقہ کے مطابق استعمال کریں جو اس کے لئے مقرر ہے۔

مثال کے طور پر ہمارے سامنے یہ ٹیوب لائٹ جل رہا ہے، اس کو ایک تو اسی مقصد میں استعمال کرنا چاہئے جس کے لئے یہ بنایا گیا ہے، یہ بنایا گیا ہے ہمیں روشنی دینے کے لئے، اگر کوئی بے وقوف اس کام کے بجائے اس کو کسی اور کام مثلاً کسی کو مارنے میں استعمال کرے یا عصا بنالے تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اسی طرح کتاب پڑھنے، مطالعہ کرنے کے لئے ہے، اگر کوئی اس سے پنکھے کا کام لینے لگے تو یہ بات غلط ہوگی، کیونکہ اس کے مقصد کے خلاف استعمال کیا گیا۔

دوسرے یہ بھی ضروری ہے کہ چیز کے استعمال کرنے کا طریقہ بھی سیکھا جائے، ٹیوب لائٹ جلانے یا پنکھا چلانے کا ایک طریقہ ہے، استعمال کرنے کا ایک انداز ہے کہ کس طرح اس کو استعمال کریں، اگر خدانخواستہ اس طریقہ کے مطابق استعمال نہ کریں، تو ہوسکتا ہے کہ اس کا فائدہ نہ ہو اور خراب ہو جائے، مثلاً ایک آدمی نے دیکھا کہ ٹیوب لائٹ جل نہیں رہا ہے، اس کے جی میں آیا کہ یہ تو جلتا نہیں ہے، اس کو جلانا ہے، اس بیوقوف نے سوچا کہ یہ کیوں نہیں جلتا؟ اسکو میں جلاتا ہوں، میں روزانہ اپنے گھر کا ''اسٹو'' ماچس کی تیلی جلا کر جلا لیتا ہوں اور وہ جل جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی میں اس کو جلاؤنگا، اس نے ایک ماچس لا کر اس سے ایک تیلی نکالی اور اس کو جلایا اور اس سے ٹیوب لائٹ جلانے لگا۔

اب بتایئے کہ اس کا حشر کیا ہوگا؟ اس کو ساری دنیا کہے گی کہ یہ طریقہ نہیں ہے اس کو جلانے کا، یہ طریقہ دوسری چیزوں کے لئے استعمال ہوسکتا ہے، لیکن یہ طریقہ اس کے لئے استعمال کریں گے تو اس کے لئے خطرہ ہی خطرہ ہے۔

اولاً تو وہ کالا ہو جائیگا اور پھر ہوسکتا ہے کہ اگر تیز بھاپ اس کو لگ جائے تو پھٹ بھی جائے، اس لئے کہ یہ طریقہ اس کے استعمال کا ہرگز نہیں ہے۔

اب یہاں ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ایک چیز کو جلانے کا جو طریقہ مقرر ہے، اس طریقہ کے خلاف اگر اس کو استعمال کیا جاتا ہے تو اس کو خطرہ ہے کہ نہیں ہے؟

اسی طرح بھائیو! اگر ہمارے دل کو روشن کرنے کے لئے، دل کے اندر نور اور اجالا پیدا کرنے کے لئے کوئی آدمی وہ چیز استعمال نہ کرے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اور وہ چیز استعمال کرے جسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے خطرہ بتایا ہے، تو پھر اس کا دل روشن نہیں ہو سکے گا، دیکھئے ماچس سے

آپ سگریٹ جلا سکتے ہیں، موم بتی جلا سکتے ہیں، اپنی گیس لائٹ جلا سکتے ہیں، لیکن ٹیوب لائٹ ہرگز نہیں جلا سکتے، بلکہ جلائینگے تو کالا ہو جائیگا۔

اسی طرح سمجھئے دل بھی ایک روشن چیز کی طرح ہے، اس میں ایک آگ جلانے اور دھکانے کی ضرورت ہے، وہ آگ جو اس میں لگے گی وہ عشق الٰہی کی آگ ہے، اگر دل میں عشق الٰہی کی آگ جلا کر آپ اس کو روشن کریں گے تو انشاء اللہ اس کی روشنی بڑی خوبصورت ہوگی، اور بہت دور دور تک پہونچے گی، آپ کو بھی روشن کرے گی اور آپ کے پاس بیٹھنے والوں کو بھی روشن کرے گی، لیکن اگر کوئی بیوقوف صاحب اللہ کی محبت سے دل کو جلانے کے بجائے، دنیا کی محبت سے جلانا چاہیں تو دل کالا ہو جائیگا، روشن کبھی نہیں ہوگا۔

معلوم ہوا کہ دل کو روشن کرنا ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا پڑیگا کہ آپ کا اسوہ کیا ہے؟ آپ کو اللہ نے کیا طریقہ دے کر بھیجا ہے وہ طریقہ آپ ہم کو بتائیں، تاکہ ہم اس طریقہ سے اپنے دل کو روشن کریں۔ اسی طرح آنکھیں ہیں، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھوں سے جو کام لیا اور جس انداز سے کام لیا، آنکھوں کو اسی طرح استعمال کرنا چاہئے اور اسی مقصد میں استعمال کرنا چاہئے اور اگر اس کو مقصد سے ہٹا کر استعمال کریں گے اور غلط طریقہ پر اس کو استعمال کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آنکھوں کو اجاڑنے کا ہم کام کر رہے ہیں، آنکھوں کو بسانے کا کام ہم نہیں کر رہے ہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھوں سے کیا کام لیا؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دل سے کیا کام لیا؟ وہی کام ان سے ہمیں بھی لینا ہے۔

دل اللہ کی معرفت کی تجلی گاہ ہے

اسلئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث کے ذریعے بھی اور اپنے

عمل کے ذریعہ بھی بتایا ہے کہ دل کو اللہ کی محبت اور معرفت کا مسکن اور ٹھکانہ بناؤ، یہ ہے دل کا کام، اگر کوئی اس کے بجائے دل کے اندر دنیا بھر کی غلاظتیں لے جا کر بھر ڈالے، عورت کی محبت دل میں ہے، اور انسانوں کی محبت دل میں ہے، چیزوں کی محبت دل میں ہے اور مکانوں کی محبت دل میں ہے، پکوان کی محبت دل میں ہے، کھانوں کی محبت دل میں ہے، تو اس کی مثال ایسی ہے، جیسے کوئی آدمی بہترین قسم کا محل بنانے کے بعد اس کے اندر تمام قسم کی غلاظتیں اور مختلف قسم کی گندگیاں لا کر ڈال دے۔ دل اللہ کی معرفت کا تجلی گاہ ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت کا مسکن ہے، اس کے اندر دنیا کی اور مختلف قسم کی محبتیں لا کر ڈال رہا ہے، تو یہ گندگیاں ہیں، غلاظتیں ہیں، یہ غلاظتیں دل کے اندر آجائیں گی تو بھائی ذرا اندازہ کیجئے، آپ اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ جس نے محل بنایا اور پھر محل کے اندر غلاظتیں لا کر جمانا شروع کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کا دل کیسا تھا؟

الغرض آپ ﷺ کا دل ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے، اللہ کے نبی ﷺ کا دل کیا کیا کام کرتا تھا؟ کن کن خوبیوں کا وہ دل مالک تھا؟ کن چیزوں کو اس میں جگہ نہیں دی تھی؟ اس کے مطابق ہم کو اپنا دل بنانا ہے۔ آج ہمارے دلوں کو ہم دیکھ لیں کہ اس دل کے اندر وہ چیزیں جمع ہیں جو محمد ﷺ کے دل میں نہیں تھیں، اور وہ چیزیں ہمارے دل میں موجود نہیں ہیں، جو نبی ﷺ کے دل میں موجود تھیں، نبی ﷺ کا دل وہ دل تھا کہ اس میں دنیا کی محبت ایک رائی کے برابر نہیں تھی اور خدا کی محبت سو فیصد بسی ہوئی تھی۔

حدیث میں آتا ہے کہ نبی ﷺ کی خدمت میں کافروں کے بہت سارے گروگھنٹالوں نے ایک آدمی کو بھیجا، وہ آپ کی خدمت میں آیا اور کہا کہ: اے محمد ﷺ! مجھے فلاں اور فلاں نے آپ کے پاس بھیجا ہے، میں مکہ کے سرداروں کی طرف سے

آیا ہوں اور مجھے ایک بات آپ کے سامنے رکھنی ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہ پیغام لیکر آیا ہوں کہ اگر آپ دین اسلام چھوڑ دیں تو ہم آپ کو حکومت و سرداری دینے تیار ہیں، ہم آپ کو اپنا سردار بنالیں گے، اور آپ چاہیں تو ساری دولتیں آپ کے قدموں میں لاکر ڈالدیں گے، اور اگر آپکا مقصد عیش و راحت ہے تو ہم عرب کی خوبصورت لڑکیاں آپ پر نچھاور کردیں گے۔ بس یہ شرط ہے کہ آپ یہ دین کا کام کرنا چھوڑ دیں، توحید و سنت کا کام بند کردیں۔

اللہ کے نبی ﷺ اس کی بات سننے کے بعد پوچھتے ہیں، آپ کی بات ختم ہوگئی؟ وہ کہتا ہے، ہاں! میں نے اپنی بات پوری کرلی۔ اللہ کے نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ: ''اب میری بات سنو''، اس کے بعد آپ قرآن مجید کی تلاوت شروع کردیتے ہیں، سورہ حم سجدہ کی آیتیں پڑھنی شروع کردیتے ہیں، آپ پڑھتے رہے، یہاں تک کہ وہ آیتیں آگئیں جس میں قوم عاد کا اور مختلف قوموں اور لوگوں کا ذکر ہے، ان کی ہلاکت و تباہی کا ذکر ہے تو اس آدمی سے برداشت نہ ہوا اور وہ اللہ کے نبی ﷺ کے قریب پہونچ کر آپ کے منھ پر ہاتھ رکھکر کہتا ہے: ''اللہ کے لئے اس کو بند کرو میرے سینے میں اس کو سننے کی طاقت موجود نہیں ہے، اللہ کے نبی ﷺ بند کردیتے ہیں تو وہ اٹھ کر چلا جاتا ہے۔

کافر لوگ مکہ کے سردار وہاں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے ہیں کہ آپ کے پاس سے کیا جواب لاتا ہے؟ لیکن اس آدمی میں ان سے بات کرنے کی طاقت نہیں تھی، تو اپنے گھر چلا گیا اور تین دن تک لوگوں کو نظر بھی نہیں آیا، تین دن کے بعد وہ لوگوں کے سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ محمد ﷺ ایک ایسا کلام پیش کرتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا کلام نہیں سنا ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۱۵/۳۳۸، حیاۃ الصحابہ: ۱/۳۷)

تو بھائیو! ہمارے نبی ﷺ کو دنیا دی جارہی تھی، دولت و مال آپ کے قدموں میں ڈالنے کے وعدے کئے جارہے تھے، لیکن آپ نے یہ فرمایا کہ امارت، عیش و عشرت اور مال و دولت تو میرے پیروں میں ہے، اس میں سے کسی کو بھی لینا نہیں چاہتا، دنیا کی دولت اور دنیا کی چیزوں کی محبت محمد ﷺ کے دل کے اندر ایک پائی کے برابر بھی نہیں تھی۔

مال و دولت سے نبی ﷺ کا استغناء

حدیث میں آتا ہے کہ مدینہ ہجرت کے بعد بہت سارے ممالک فتح ہوتے چلے گئے، بحرین کا ملک بھی فتح ہوگیا، اس وقت اللہ کے نبی ﷺ نے لوگوں کو بحرین بھیجا کہ جاؤ (tax) ٹیکس وصول کر کے لاؤ۔ چنانچہ حضرات صحابہ گئے، اور بحرین سے دولت کا انبار لے کر آئے، اس میں سونا، چاندی، اناج و غلہ اور کپڑا اور دیگر مختلف قیمتی چیزیں تھیں۔

یہ سب چیزیں مسجد نبوی کے صحن میں جمع کر دی گئیں، اور اللہ کے نبی ﷺ کو خبر کر دی گئی۔ ذرا سوچئے کہ اگر میں یا آپ اس جگہ ہوتے تو جا کر کم از کم دیکھتے کہ کتنی دولت آئی ہے؟ اور کیا کیا مال آیا ہے؟ لیکن اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، مسجد میں ڈالدو اور آرام کرو، صحابہؓ اپنی اپنی جگہ چلے گئے، لوگوں میں شہرت ہوگئی کہ بحرین سے بہت کچھ مال آگیا ہے، یہ دور فقر و فاقہ کا دور تھا، ایسے دور میں بحرین سے اس قدر مال جمع ہوگیا تھا، فجر کی نماز کا وقت ہوگیا تو مدینہ کی مختلف مساجد کے نمازی بھی مسجد نبوی کے اندر آکر جمع ہوگئے، ایک جم غفیر دوسرے دنوں کے لحاظ سے کچھ زیادہ ہی تھا، اب لوگ انتظار میں ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نماز فجر پڑھانے کے لئے آئیں گے۔

چنانچہ وقت ہوا تو آپ ﷺ تشریف لائے، حضرت بلالؓ ساتھ میں موجود تھے لوگوں کا خیال تھا کہ آپ ﷺ آ کر مال کا جائزہ لیں گے اور ایک ایک چیز کو اچھی طرح غور و فکر سے دیکھیں گے، لیکن دیکھتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ تشریف لائے اور ایک نگاہ بھی اٹھا کر مال کی طرف نہیں دیکھا، بلکہ سیدھا محراب کے اندر تشریف لے گئے اور نماز پڑھائی، اس کے بعد مصلیوں کی طرف چہرہ کرکے بیٹھ گئے اور پوچھا کہ تم لوگ مختلف محلوں کے یہاں جمع ہو گئے، شاید تم لوگوں کو یہ خبر ملی ہوگی کہ بحرین سے مال آیا ہے، اس لئے تم لوگ یہاں جمع ہو گئے ہو، صحابہؓ نے عرض کیا، ہاں! یا رسول اللہ! ہم اسی لئے جمع ہوئے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

پچھلی امتیں جو تباہ و ہلاک ہوئیں، وہ مال و دولت میں غرق ہونے کی وجہ سے ہلاک ہوئیں، مجھے کوئی خوف تمہارے فقر و فاقہ کا نہیں ہے، اگر مجھے کسی بات کا خوف تمہارے بارے میں ہے تو یہی کہ دنیا تمہارے اوپر وسیع کر دی جائے اور تم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں مسابقت (race) کرو گے اور ہلاک کر دیئے جاؤ گے، پھر اس کے بعد مال کے پاس تشریف لائے اور حضرت بلالؓ سے فرمایا کہ تقسیم کرنا شروع کرو، جس کو جس چیز کی ضرورت ہو دیتے چلے جاؤ، حضرت بلال حبشی تقسیم کرتے رہے یہاں تک کہ جو کچھ آیا تھا سب تقسیم ہو گیا، جب اللہ کے نبی ﷺ وہاں سے اٹھے ہیں تو یوں اپنا دامن جھاڑ کر اٹھ گئے کہ ایک پائی بھی اپنے لئے نہیں رکھی۔ (بخاری: ۱/۴۴۷، مسلم: ۲/۴۰۷)

یہ اللہ کے نبی ﷺ کا اسوہ ہے کہ اتنے مال کی فراوانی کے باوجود ایک نگاہ بھی اٹھا کر آپ نے نہیں دیکھی اور حضرات صحابہؓ کے دلوں میں جو تھوڑی سی محبت جمع ہو گئی تھی، اس کو بھی کھینچ کر نکال دیا۔

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے نمازعصر پڑھائی، نماز کے بعد آپ ﷺ لوگوں کو پھلانگتے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ گھر گئے، حضرات صحابہؓ پریشان ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ کو کیا ضرورت پیش آگئی کہ آپ دوڑتے ہوئے اور لوگوں کو پھلانگتے ہوئے گھر تشریف لے گئے؟.......کچھ دیر بعد واپس آئے، اور دیکھا کہ ان حضرات کو تعجب ہو رہا ہے تو صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ نماز میں مجھے یاد آیا کہ میرے گھر میں ایک سونے کا ٹکڑا رہ گیا ہے، میں نے یہ مکروہ سمجھا کہ وہ مجھے مشغول کر لے، ایک روایت میں یوں فرمایا کہ کہیں وہ میرے پاس رات میں رہ نہ جائے، لہذا میں نے اس کو تقسیم کرنے کا حکم دیدیا ہے۔
(بخاری:۸۵۱،نسائی:۱۳۶۴)

یہ تھے اللہ کے نبی ﷺ، کہ آپ کے دل میں دنیا کی کوئی محبت نہیں تھی، اب اللہ کے نبی کا دل دیکھو کہ کیسا تھا، میں یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ نبی ﷺ کی ذات میں تمہارے لئے نمونہ موجود ہے، آپ کے دل کو دیکھ کر اپنا دل بھی ویسا ہی بنالو۔

اللہ کے نبی کے دل میں خوف الٰہی

ایک صفت ہمارے نبی ﷺ کے دل کی یہ تھی کہ آپ کے دل میں خدا کا خوف بے پناہ موجود تھا؟ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے، آپ ﷺ کو شدید بھوک لگی، اور کھانے کے لئے کچھ بھی موجود نہیں تھا، آپ گھر کے باہر تشریف لائے، دیکھا تو ایک طرف صدیق اکبر نظر آئے، دوپہر کی شدید گرمی کا وقت تھا، آپ نے ان سے پوچھا: ''اے ابوبکر! ایسے وقت کیوں باہر آگئے؟'' تو انہوں نے کہا کہ یارسول اللہ! بھوک کی شدت نے باہر نکلنے پر مجبور کیا، اس لئے باہر نکل آیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے بھی بھوک نے ہی مجبور کیا؛ اس لئے میں بھی باہر نکل آیا

ہوں، دونوں حضرات کچھ آگے بڑھے تو حضرت عمر بن خطابؓ نظر آئے، ان سے پوچھا کہ اس وقت باہر کیوں؟ تو انکا بھی وہی عذر کہ بھوک کی شدت نے مجبور کیا۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ چلو ابوالہیثم کے باغ میں چلیں گے، یہ ایک صحابی تھے، ان کا مدینہ کے اندر بڑا باغ تھا، حضور ﷺ وہاں تشریف لے گئے، اس وقت ابوالہیثم وہاں موجود نہیں تھے، ان کی بیوی موجود تھیں، انھوں نے حضور ﷺ کو دیکھا تو وہ خوش ہوگئیں، چادر بچھائیں، اس کے بعد کھانے کے لئے انگور وغیرہ لاکر رکھدیا، حضور اور صحابہ نوش فرمارہے تھے، اتنے میں حضرت ابوالہیثم بھی آگئے، آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، ان کی تو عید ہوگئی، ان کے پاس ایک بکری موجود تھی، اس کو جلدی سے ذبح کیا، اور اس کو بھونا، بیوی کو حکم دیا کہ روٹی پکاؤ، گرم گرم روٹیاں پکادی گئیں، سالن بھی تیار ہوگیا، لاکر حضور کے سامنے رکھ دیا، حضور نے بھی کھایا اور دیگر اصحاب نے بھی کھایا، فراغت کے بعد حضور نے رونا شروع کر دیا، حضور ﷺ کو دیکھ کر سب کو رونا آگیا اور ایک کہرام سا مچ گیا، لیکن کسی کو کچھ نہیں پتہ کہ کیوں رویا جارہا ہے؟ اللہ کے نبی کے رونے کو دیکھ کر سب کو رونا آگیا، ابوبکرؓ نے آپ سے پوچھا کہ: یا نبی اللہ! آپ کیوں رورہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ: ابوبکر! جو ابھی ہم نے کھانا کھایا ہے، قیامت کے میدان میں ان میں سے ایک ایک چیز کا ہمیں جواب دینا ہے؛ اس لئے رورہا ہوں۔ (ترمذی: ۶۲/۲)

ہمارا حال تو یہ ہے کہ صبح کھارہے ہیں، شام کھارہے ہیں، تین تین وقت کھارہے ہیں، اس کے علاوہ بھی کبھی لسی، کبھی چائے، اس کے باوجود ہمارے دلوں میں اللہ کا کوئی خوف نہیں ہے، جب اللہ کے نبی رورو کر یہ آخری جملہ ادا کررہے تھے تو سب کے دل میں عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔

اس لئے بھائیو! نبی کے جیسا دل بناؤ، اللہ کا خوف دل میں پیدا کرو اور اللہ کی محبت دل میں پیدا کرو، واقعات تو بہت ہیں، لیکن ایک (point) جو اس وقت میں نے اٹھایا ہے، میں ضروری سمجھتا ہوں کہ کم از کم اس نکتہ پر مجھے اور آپ کو اچھی طرح غور وخوض کر کے اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لینا چاہئے کہ ہمارا دل تو محمد ﷺ جیسا بن جائے، آج وہی فکر وہی خوف ہمارے اندر پیدا ہو تو انشاء اللہ ہماری پوری زندگی میں تبدیلی پیدا ہو جائیگی، اس لئے کہ اصل تو دل ہی ہے، تمام اعضاء جو بنتے ہیں وہ دل ہی سے بنتے ہیں۔

آپ کے دل میں تعلق مع اللہ کی کیفیت

اسی طرح ایک اور بات سن لیجئے، جو بہت اہم ہے کہ آپ ﷺ کے دل میں اللہ سے تعلق کی جو کیفیت تھی، وہ بے مثال و بے نظیر تھی۔ یہ بھی ایک چیز ہے جس کو ہمیں اپنے نبی کے اسوہ سے لینا اور سیکھنا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اللہ کے نبی گھر میں آتے تھے تو گھر کے کام کاج کرتے تھے اور جیسے ہی اذان ہوتی یا نماز کا وقت ہوتا تو نماز کے لئے نکل جاتے۔ (بخاری:٦٧٦، ترمذی:۲۴۸۹، الادب المفرد:۲۱۵/۱)

مطلب یہ ہوا کہ آپ علیہ السلام کا معمول تھا کہ گھر میں کام کاج میں شریک ہوتے، اور ازواج مطہرات کے ساتھ ہنسی مذاق بھی فرماتے تھے، اور جیسے ہی اذان کی آواز آتی تھی تو پھر آپ سب کام چھوڑ کر نماز کی طرف اور اللہ کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے۔ ملا علی قاری نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ:" ترك جميع عمله ، و كأنه لم يعرف أحدا من أهله " کہ آپ سب کاموں کو چھوڑ دیتے گویا کہ آپ اپنے اہل میں سے کسی کو جانتے پہچانتے ہی نہیں۔ (مرقاۃ:۴۸۷/۱۰)

حالانکہ آپ کا گھر میں ایک معمول یہ بھی تھا کہ آپ اپنی ازواج کے ساتھ ہنسی مزاح بھی کیا کرتے تھے۔

جیسے حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ حضرت عائشہؓ کے مکان میں تھے، انھوں نے حضور ﷺ کے لئے حریرہ گھر میں تیار کیا، اور لے آئیں، کہنے لگیں: اے اللہ کے نبی! میں نے یہ آپ کے لئے تیار کیا ہے، اس کو کھائیے، یہاں حضرت سودہ بھی حاضر تھیں، حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا: تم بھی کھاؤ، لیکن حضرت سودہ نے فرمایا کہ میں تو نہیں کھاؤنگی، وہ روٹھ گئیں، لیکن حضرت عائشہ نے اصرار کیا کہ تمہیں کھانا پڑیگا، یہ اصرار وانکار اتنا بڑھتا گیا کہ دونوں کے درمیان میں بات ذرا آگے بڑھ گئی، حضرت عائشہ نے کہا کہ: اگر تم اسے نہیں کھاؤ گی تو میں یہ کھانا تمہارے منھ پر مل دونگی، یعنی ایک مذاق اور تفریح کا موقعہ تھا۔

چنانچہ انہوں نے حریرہ میں ہاتھ ڈالکر ان کے منھ پر مل دیا، حضور ﷺ بازو بیٹھے ہوئے ہنس رہے تھے، مسکراہٹ آپ کے چہرے پر کھیل رہی تھی، جب حضرت سودہؓ کو دیکھا کہ ان کا پورا چہرہ کھانے سے ملوث ہو گیا ہے تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ عائشہ نے تمہارے منھ پر یہ لگایا ہے، اب میں ان کے ہاتھ پکڑ لیتا ہوں تم ان کے منھ پر یہ مل دو۔ چنانچہ حضرت عائشہ کے ہاتھوں کو حضور ﷺ نے پکڑ لیا تو حضرت سودہ نے حریرہ اٹھا کر ان کے منھ پر مل دیا اور پھر ایک ہنسی کا موقعہ فراہم ہو گیا۔ (حیاۃ الصحابہ: ۷۹۹/۲)

یہ تھا حضور ﷺ کے گھر کا ماحول بیویوں کے ساتھ، اور اسی کے ساتھ جب اللہ کی طرف سے بلاوا آجاتا تو نماز و ذکر کی جانب توجہ کا یہ عالم جو آپ نے سنا، یہ ہے خدا کی محبت، ایک طرف بیویوں کا حق بھی ادا کر رہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ جب اللہ کا پیغام آتا تھا تو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اب ہمارے سے حضور ﷺ کو کوئی تعلق

نہیں، یہ اللہ کی محبت ہے جو نبی ﷺ کے سینے میں موجود تھی۔

دل کو گندگیوں سے پاک کرو، ایک واقعہ

الغرض دل تو اللہ نے اسی لئے بنایا ہے کہ اس میں اللہ کی محبت پیدا کی جائے اور ہمارے دلوں کو آپ ﷺ کے دل جیسا بنایا جائے، دل میں محبت الٰہی کی جگہ کوئی اور چیز آجائے تو اللہ کبھی اسے برداشت نہیں کریں گے، مجھے ایک بات یاد آگئی، میں نے چند دن پہلے اپنے دوستوں کو سنایا تھا، غالباً دو یا تین ہفتے پہلے مجھ سے فون پر کچھ لوگوں نے رابطہ کیا اور کہا کہ یہاں ایک مکان ہے اور ایک بھائی بہن اس مکان میں رہتے ہیں، اس کے اندر غلاظتیں ہی غلاظتیں جمع ہیں، ہم محلے کے کچھ لوگ مل کر اس مکان کے اندر سے وہ گندگیاں اور غلاظتیں باہر نکال کر پھینک دینا چاہتے ہیں، تو کیا شرعاً ہم کو اس کی اجازت ہے؟ مسئلہ پوچھ رہے تھے۔

میں نے جواب دینے سے پہلے ان سے تفصیل پوچھی، کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ تاکہ تفصیل مجھے معلوم ہوجائے، تو انہوں نے جو تفصیل بتائی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے، انہوں نے کہا کہ ایک صاحب ہیں جو پہلے Education Department میں بڑے آفیسر تھے، بعد میں ان کا دماغ خراب ہوگیا، بچے اور بیوی سب ان کو چھوڑ کر چلے گئے، ان کی ایک بہن ہے، اس کا بیماریوں میں عجیب وغریب برا حال ہے، نہ اٹھ سکتی ہے، نہ کچھ کام کرسکتی ہے، نہ کچھ بول سکتی ہے، اپنے بیڈ پر پڑی ہوئی ہے، پیشاب وہیں، پاخانہ وہیں، کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں، بھائی کا حال یہ ہے کہ دماغ خراب ہونے کی وجہ سے راستہ چلتے ہوئے راستے میں جتنی گندگیاں اور غلاظتیں ہوتی ہیں وہ چن چن کر لاتا اور اپنے گھر میں جماتا ہے،

کاغذ پڑا ہے، وہ لاکر گھر میں ڈال رہا ہے، کوئی اخبار پڑا ہوا ہے، اسے اٹھا کر لا رہا ہے، کوئی لوہے کی چیز ملی اسے اٹھا کر گھر میں ڈال رہا ہے، کوئی پتھر ملا اسے اٹھا کر گھر میں ڈال رہا ہے، غرض یہ کہ چلتے پھرتے ہزاروں قسم کی اچھی بری چیزیں ملتی ہیں، دماغ خراب ہونے کی وجہ سے گھر میں لالا کر ڈالتا چلا جا رہا ہے، یہاں تک کہ جو اس کا پلنگ ہے، پلنگ پر بھی یہی سب کچھ رکھا ہوا ہے، وہ خود تو نیچے سوتا ہے، اور پلنگ کے اوپر یہ سب جمع کرتا ہے، اور پھر یہ چیزیں رکھے رکھے کبھی پانی پڑ گیا یا کچھ اور ہو گیا، اور وہ چیزیں خراب ہونے لگیں، سڑنے لگیں، اس طرح پورے گھر میں سوائے غلاظت، گندگی اور بدبو کے اور کچھ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس گھر کو خالی کرنا چاہتے ہیں، مگر ان صاحب کی اجازت نہیں ہے۔ اور وہ صاحب اسے خالی کرنے کیلئے تیار نہیں، اور وہ بہت مزاحمت کر رہے ہیں کہ تم لوگ ہمارے گھر میں کیوں آئے ہو؟ اور کیوں ان چیزوں کو نکال رہے ہو، یہ میری چیزیں ہیں، یہ اخبار مجھے کام آئیگا، پچیس سال پہلے کا اخبار بھی پڑا ہے، بیس سال پہلے کا بھی اخبار پڑا ہے، اور وہ اسے پھینکنے کے لئے تیار نہیں۔

میں نے کہا کہ جب یہ صورت حال ہے اور آپ لوگ ان کے گھر کو خالی کرنا چاہتے ہیں، اور اس کا مقصد دراصل ان کے گھر کو پاک کرنا ہے اور بیکار و بے ہودہ چیزوں سے خالی کرنا ہے تو یہ شرعاً جائز ہے، اس لئے کہ نکالنے کی چیز کو نکالنا تو گناہ نہیں ہے، کسی کے گھر کو صاف کرنا کوئی جرم نہیں، یہ الگ بات ہے کہ وہ صاحب اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اس کو سمجھیں کہ یہ غلط کام ہے۔

بھائیو! بزرگو! مجھے اس واقعہ سے بتانا کیا ہے؟ یہ بتانا ہے کہ جیسے ایک اچھے گھر میں اچھی چیزیں رکھنے کے بجائے گندگی، غلاظت کوئی جمع کرتا ہے، تو دنیا کا کوئی انسان اسے برداشت نہیں کرتا بلکہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے دماغ کے اندر خرابی

ہے اور واقعی خرابی بھی ہوتی ہے، اسی طرح جو اپنے دل کے محل کو خدا کی محبت سے سجانے کے بجائے دنیا کی غلاظتوں سے ملوث کر لیتا ہے تو آپ بتائیے کہ اس کے بارے میں کیا کہا جائے، ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے اندر ہم کو یہی درس دیا گیا ہے کہ اس دل کو کیسے سجائیں؟ پاک کریں؟

نجس دل میں اللہ کی تجلی نہیں ہوتی

یاد رکھو کہ دل کی خرابی بہت بڑی خرابی ہے، اس لئے وہاں گندگی ڈالنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیا اپنی آفس روم میں کوئی گندگی غلاظت ڈالے گا؟ جہاں سارے لوگ آتے جاتے ہوں، میل ملاقات وہیں ہوتی ہو، صوفہ رکھا ہوا ہو، فرنیچر ہو، ٹیبل رکھا ہوا ہو، ان کے اوپر چار پانچ جگہ گندگی اور غلاظت ڈال دی جائے۔ سوچو کہ کون آئیگا؟ آپ کے آفس میں یا ایسے گھر میں؟

اسی طرح اس گھر (دل) میں جس کے اندر گندگیاں اور غلاظتیں ڈالدی گئی ہوں، وہاں خدا کیسے آ سکتا ہے؟ نجس دل میں کبھی اللہ کی تجلی نہیں آتی، جس میں اخلاقی واعتقادی، نظریاتی ودیگر رذائل وخبائث ہوں۔ آج یہی ہمارا روگ ہے، سب سے بڑی مصیبت ہے، سب سے بڑا المیہ ہے، کہ ہم نے محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور آپ کے اسوۂ حسنہ سے دل کے بنانے کا فن نہیں سیکھا، دل کو سجانے کا فن نہیں سیکھا۔

دنیا والوں سے عبرت لیجئے

بھائیو! ہمیں اس سلسلہ میں دنیا والوں سے عبرت لینا چاہئے، آج دنیا ترقی کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہونچ رہی ہے، وہ ترقی کرتے کرتے اپنے گھروں کو سجانے کے لئے کیا کیا انداز اختیار کر رہی ہے، ہر کام کے لئے الگ الگ آدمی

موجود ہیں، مختلف قسم کے ڈیزائن ہوتے ہیں، اندرونی کام (Interior)، اور باہری کام (Exterior)، اور ہر ایک کے لئے الگ الگ اشخاص ہوتے ہیں (Interior) کام کی مخلوق الگ، وہ لوگ صرف اندرون خانہ کام کرتے ہیں، ان کا کام باہر کا نہیں، اور (Exterior) کام والے باہر کا کام کرتے ہیں، یہ لوگ اندر کا کام نہیں کرتے، صوفے والے ٹیبل کا کام نہیں کرتے، ٹیبل والے صوفے کا کام نہیں کرتے، کارپیٹ بچھانے والے چھت پر ڈیزائننگ کا کام نہیں کرتے، ہر ایک کے لئے الگ الگ قسم کے لوگ ہیں، اور ہر ایک اپنے فن کا فنکار ہے، اور ہر ایک اپنا فن دکھا رہا ہے اور لوگ ہر ایک سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے گھروں کو، اپنی آفسوں کو سجا رہے ہیں کہ ہمارا گھر ایسا ہونا چاہئے، ہماری آفس ایسی ہونی چاہئے، ہمارا دکان ایسا ہونا چاہیے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اگر سجاوٹ نہیں ہو رہی ہے تو اس دل کے گھر کی نہیں ہو رہی ہے، جو خالق کائنات اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بنایا ہے، کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے؟ ہمارے رہنے کے مکانات تو اتنے عالیشان ہوں، اور اللہ کا مکان ''دل'' اتنا گھٹیا اور اتنا گندا ہو کہ مت پوچھو، ساری غلاظتیں اس میں، حسد اس میں، کینہ اس میں، تکبر اس میں، بغض اس میں، مردار دنیا کی محبت اس میں، بے حساب گندگیاں اس میں۔

مرشدی شاہ ابرارالحق صاحب کا ایک مقولہ

حضرت مرشدی مولانا شاہ ابرارالحق صاحب نوراللہ مرقدہ، بار بار ایک جملہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، وہ جملہ یاد آ گیا، حضرت وہ جملہ قرآن و اذان و نماز کے بارے میں فرمایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ ''قرآن آج لوگوں کا بڑھیا نہیں ہے، اذان بڑھیا نہیں ہے''، اور کہتے تھے ''کھانا بڑھیا، پانی بڑھیا، مکان بڑھیا، دکان بڑھیا، حتی

کہ پان بھی بڑھیا لیکن قرآن بڑھیا نہیں''، یہ جملہ ہے حضرت کا۔

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح دنیا بھر کے دکان، دنیا بھر کے مکان سب عالیشان، ان کے اندر و باہر تمام سجاوٹوں کا ہم اہتمام کرتے ہیں، لیکن خدا کے دل کو بسانے اور سجانے کا کوئی اہتمام نہیں، محمد ﷺ کی سیرت میں دل کو سجانے کا بہت زیادہ اہتمام ہے، یہ فن وہاں سے سیکھنا ہے، اس کو آپ سجائیں کیسے؟ اس کو سجانے کے لئے کیا کرنا پڑیگا؟ اللہ کا ذکر، اللہ کے ذکر سے اللہ کے دل کی سجاوٹ ہوتی ہے، سبحان اللہ پڑھیں، الحمدللہ پڑھیں، اللہ اکبر پڑھیں، لا الہ الا اللہ پڑھیں، اور ذکر واذکار کریں، قرآن پاک کی تلاوت کریں، تو جوں جوں آپ قرآن پاک کی تلاوت اور ذکر واذکار کرتے جائیں گے تو اس اللہ کے گھر میں بیل بوٹے لگتے چلے جائیں گے، سبحان اللہ سے ایک پھول نکلے گا، الحمدللہ سے ایک پھول نکلے گا۔

ذکر اللہ سے معرفت ومحبت کا عکس دل پر پڑیگا، ایک واقعہ

جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اللہ ان کے دل میں بسیرا کرتا ہے، کیسا بسیرا، ایک عجیب وغریب واقعہ سنئے، آپ نے مہدوی فرقہ کا نام سنا ہوگا، اس فرقہ کے بارے میں تمام علماء کا کہنا ہے کہ یہ گمراہ فرقہ ہے، اور کافر ہے۔ اب رہی اس کی تفصیلات تو اس وقت کہنا نہیں ہے، اس فرقے کے جو بانی تھے، وہ بانی بنالئے گئے ہیں، وہ خود شاید بانی نہ ہوں، لوگوں نے ان کو بانی قرار دے لیا ہے، بہر حال یہ لوگ ان کو مانتے ہیں، ان کا نام ہے ''محمد جونپوری'' جونپور (یو، پی) کے رہنے والے تھے، ان کے بارے میں مورخین کی رائے مختلف ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ غلط قسم کے آدمی تھے، لوگوں کو ایک گمراہی پر ڈال گئے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ صوفی منش آدمی تھے، اللہ

والے تھے، بہ ہر حال وہ جیسے بھی تھے، اس وقت اس کی بھی بحث نہیں ہے، البتہ ان کا ایک واقعہ سنانا ہے، وہ یہ کہ انہوں نے اپنے کچھ لوگوں کے ساتھ غیروں سے جہاد کرنا شروع کیا، مختلف جگہ ان کی فوجیں جاتی تھیں، اور جہاد کرتی تھیں، تاریخ میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ ایک جگہ راجا دلیپ راؤ اور راجا کی فوج سے ان کی مڈ بھیڑ ہوئی اور آپس میں دونوں کا مقابلہ ہوا اور اس مقابلہ میں سید جونپوری نے بادشاہ کے اوپر حملہ کیا، وار کاری تھا، راجا گرا اور گر کر مر گیا، یہاں تک کہ اس کا سینہ پھٹ کر دل باہر نکل آیا، جب اس کا دل نکل کر باہر آ گیا، تو لوگوں نے ایک عجیب وغریب بات یہ دیکھی کہ اس کے دل کے اوپر اس مورتی کی تصویر تھی جس کی وہ پوجا کیا کرتا تھا، اس طرح جیسے چھپی ہوئی تصویر ہوتی ہو، اس کا کیا مطلب ہوا؟ مطلب یہ کہ جب وہ کافر بادشاہ پورے دھیان وتوجہ کے ساتھ اپنی مورتی کی پوجا کرتا تھا، تو دل نے اس کا عکس قبول کر لیا۔

بھائیو! ذرا سوچو کہ جو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا تو کیا خدا تعالیٰ کی معرفت ومحبت کا عکس اس کے دل پر نہیں آئیگا، کیوں نہیں؟ ایک عربی شاعر نے کہا ہے:

لِيْ حَبِيْبٌ خَيَالُهٗ نُصْبَ عَيْنِيْ
وَ اسْمُهٗ فِيْ ضَمَائِرِيْ مَكْنُوْنٌ
اِنْ تَذَكَّرْتُهٗ فَكُلِّيْ قُلُوْبٌ
وَ اِنْ تَأَمَّلْتُهٗ فَكُلِّيْ عُيُوْنٌ

یعنی میرا ایک محبوب ومعشوق ہے جس کا تصور وخیال ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے، اور اس کا نام میرے ضمیر میں پوشیدہ ہے، اگر میں اس کو یاد کرتا ہوں تو میں سراپا دل ہو جاتا ہوں اور اگر میں اس کو دیکھتا ہوں تو سراپا آنکھ بن جاتا ہوں۔

لہذا اللہ کو، اللہ کی محبت کو اپنے دل میں بسانے کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کا ذکر کرو، اس کی طرف دھیان لگاؤ، اس کی طرف محبت کے ساتھ متوجہ ہو جاؤ، جب یہ کام کریں گے تو انشاء اللہ! یہ دل محمد ﷺ کی سیرت کے مطابق اور آپ ﷺ کے اسوہ کے مطابق اللہ کا واقعی مسکن بنے گا اور اس مسکن میں خدا کی محبت رہے گی، پلے گی، پھلے گی، پھولے گی۔

حضرت نبی ﷺ کی آنکھ بھی اسوہ ہے

اسی طرح ہمارے نبی ﷺ کی آنکھیں بھی ہمارے لئے اسوہ ونمونہ ہیں۔ کس طرح؟ اس طرح کہ ہم یہ دیکھیں کہ آپ کی آنکھیں کہاں اور کس طرح استعمال ہوتی تھیں؟ آپ راستوں میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے نہیں چلتے تھے، بلکہ نگاہیں آپ کی نیچے کی جانب ہوتی تھیں۔ (طبقات ابن سعد: ۱/۳۷۹، سبل الھدی والرشاد: ۸/ ۱۵۹)

آپ کسی حرام وناجائز چیز کو نہیں دیکھتے تھے، کسی نامحرم پر نگاہ نہیں اٹھاتے تھے۔ نیز آپ کی آنکھیں اللہ کی محبت یا خوف سے روتی تھیں۔ ایک بار سورج گرہن ہو گیا تو آپ نے نماز کسوف پڑھائی اور لمبا لمبا رکوع اور لمبا لمبا سجدہ کیا، اور سجدہ میں روتے روتے کہتے جارہے تھے: "ألم تعدني أن لا تعذبهم و أنا فيهم" (اے اللہ! کیا آپ نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں جب تک ان لوگوں میں موجود ہوں آپ ان کو عذاب نہیں دیں گے) یہ کہتے جاتے اور روتے جاتے تھے۔ (شمائل ترمذی: حدیث: ۳۱۵)

ایک بار حضرت ابن مسعودؓ سے فرمایا کہ تم مجھے قرآن سناؤ، انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا میں آپ کو قرآن سناؤں جبکہ قرآن آپ پر نازل ہوا ہے؟ آپ

نے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ کسی اور سے قرآن سنوں۔ حضرت ابن مسعود نے قرآن پڑھنا شروع کیا اور سورہ نساء پڑھی۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں نے آپ کو دیکھا تو: ''رأیت عینی رسول اللّٰہ تھملان ''(دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی آنکھیں بہہ رہی ہیں) (شمائل:۳۱۴)

ساری چمک دمک تو انہی موتیوں سے ہے
آنسو نہ ہوں تو عشق میں کچھ آبرو نہیں

ہر چیز پر عبرت کے لئے نگاہ ڈالتے تھے، فضول و بے کار کسی چیز کو دیکھتے نہیں تھے۔ یہ ہے اللہ کے نبی ﷺ کی آنکھوں کو اسوہ بنانا، لہذا اس کے مطابق اپنی آنکھوں کو بنانا چاہئے۔

زبان نبوی اور اسوۂ حسنہ

اسی طرح مثال کے طور پر زبان کو لیجئے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی زبان کہاں اور کس طرح استعمال ہوتی تھی؟ آپ نہ اس کو گالی بکنے میں استعمال کرتے تھے، نہ کسی بری بات میں استعمال کرتے تھے، نہ کسی کو اس سے ذیت پہنچاتے تھے، بلکہ یہ زبان یا تو اللہ کا کلام پڑھنے میں یا ذکر اللہ میں یا کسی کو اچھے امور کی تعلیم و تبلیغ میں، وعظ و نصیحت میں استعمال ہوتی تھی، لہذا ہمیں بھی اپنی اپنی زبان کا استعمال صحیح طریقہ کے مطابق اسوۂ حسنہ کی روشنی میں کرنا چاہئے۔

الغرض یہ چند مثالیں اور اشارے ہیں، ان سے اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ کے نبی ﷺ کو ہمیں کس طرح اسوۂ حسنہ بنانا ہے۔ ہر ہر بات میں آپ کو نمونہ بنانا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہمیں بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین

معرفت الٰہی اور اس کے آثار

باسمہ تعالیٰ

معرفت الٰہی اور اس کے آثار

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ، امابعد

فاعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذریٰت:۵۶)

محترم حضرات !

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو بھی پیدا کیا اور دیگر مخلوقات کو بھی پیدا کیا، مگر علما نے لکھا ہے کہ انسان کے پیدا کرنے اور دیگر مخلوقات کے پیدا کرنے میں ایک بڑا فرق ہے، وہ یہ کہ انسان کی تخلیق کا مقصد اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے، اور دیگر مخلوقات کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اللہ کی معرفت کا انسان کے لئے ذریعہ بنیں، زمین اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے، آسمان اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے، چاند وسورج اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہیں، درخت کو اللہ نے اس لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ درخت کو اللہ کی معرفت ہو، اور نہ جانوروں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ جانور اللہ کے عارف بندے بن جائیں، عارف تو بنے گا وہ بندہ جس کو انسان کہتے ہیں، اسی لئے زمین کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اللہ کی عارف ہے، آسمان کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے، شجر وحجر کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے، چرند پرند کو اللہ کا عارف نہیں کہہ سکتے، ان کو معرفت

نصیب نہیں ہے، معرفت اللہ تعالی نے صرف انسان اور جنات کو عطاء کی ہے۔

قرآن کریم کی جو آیت میں نے تلاوت کی ہے، اس میں اسی طرف اشارہ ہے، چنانچہ اللہ تعالی فرماتے ہیں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (میں نے جنات اور انسانوں کو صرف میری عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) (الذاریت:۵۶)

حضرت ابن عباس و حضرت مجاهد کی تفسیر

حضرت ابن عباسؓ اور ان کے شاگرد حضرت مجاھدؒ نے " لیعبدون " کی تفسیر " لیعرفون " سے کی ہے، یعنی عبادت سے مراد یہاں اللہ کی معرفت اور پہچان ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے "سبحان الذی أسری الخ" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ: ابن عباس نے آیت: "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" کی تفسیر "الا لیعرفون" سے کی ہے۔ (روح المعانی:۱۵/۱۵)

اور حضرت مجاھد سے یہ تفسیر متعدد حضرات مفسرین نے نقل کی ہے، جیسے امام ابوحیان نے البحر المحیط میں، علامہ آلوسی نے روح المعانی میں، ابن عادل نے اللباب میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (البحر المحیط :۱۰۹/۸، روح المعانی:۱۵/۱۵، اللباب: ۴٦۸۰/۱)

الغرض یہاں اللہ تعالی کا مقصود یہ ہے کہ بندے میری معرفت حاصل کریں، اس لئے انسان و جنات کو پیدا فرمایا گیا۔

معرفت کو عبادت سے تعبیر کرنے میں حکمت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے "لیعبدون" کیوں فرمایا جبکہ مقصود

"لیعرفون "ہے؟ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ اللہ کی معرفت کا ذریعہ عبادت ہے، اگر اللہ کی معرفت پیدا کرنا ہے تو اس کا وسیلہ اور ذریعہ ہی اللہ کی عبادت ہے، لہذا اللہ کی عبادت کے بغیر اگر کوئی معرفت کا دعوی کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے، اس کی جانب اشارہ کرنے کے لئے معرفت کو عبادت سے تعبیر فرمایا گیا۔

اس میں ان جیسے لوگوں کا رد ہو گیا جو آج کل معرفت خداوندی کا دعوی کرتے ہیں، لیکن عبادت خداوندی سے عاری و خالی ہوتے ہیں، نہ نماز ہے، نہ روزہ ہے، نہ زکوۃ ہے، نہ سنت کی پابندی ہے، نہ ذکر ہے، نہ تسبیح ہے، دن رات اللہ کی نافرمانی ہے، پھر بھی معرفت کا دعوی ہے، نماز وہ نہیں پڑھیں گے، کہیں گے کہ ہم دل کی نماز پڑھتے ہیں، ذکر وہ نہیں کریں گے، کہیں گے کہ ہمارا دل ہر وقت ذاکر وشاغل رہتا ہے، زکوۃ وہ نہیں دیں گے، کہیں گے کہ زکوۃ سے مراد طہارت ہے، وہ ہمیں حاصل ہے، اس طرح تمام عبادات اور شرعی احکامات کے اندر تاویل کی راہ اختیار کرتے ہیں، اور گمراہی میں پھنس جاتے ہیں۔اس لئے اللہ تعالی جو علام الغیوب ہیں، جسے ساری کائنات کا علم ہے، اسے یہ بھی معلوم ہے کہ لوگ کیسی کیسی تاویلیں کریں گے، اس لئے قرآن میں خود ان کا علاج ذکر کردیا کہ اگر تم بغیر عبادت کے معرفت خداوندی کا دعوی کرتے ہو تو تم جھوٹے ہو۔

اسی لئے اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کو دنیا میں بھیجا، آپ دنیا میں سب سے بڑے عارف، سب سے زیادہ اللہ کو پہچاننے والے، اللہ کے نبی نے خود ہی فرمایا ہے :"ان أتقاكم و أعلمكم بالله أنا " کہ تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور اللہ کی معرفت رکھنے والا میں ہوں۔ (بخاری: حدیث: ۲۰)

اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ سب سے بڑے عارف باللہ تھے، اللہ تعالی نے معرفت سمجھانے آپ کو مبعوث فرمایا، آپ سے اعمال کروائے، عبادات: نماز، روزہ

زکاۃ، حج وقربانی، ذکرواذکار وغیرہ کراوئے تاکہ دنیا والوں کو بتائیں کہ یہی راستہ ہے، جس پر چل کر اللہ کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔

معرفت کی حقیقت

اب یہ سنئے کہ معرفت کسے کہتے ہیں؟ معرفت عربی کا لفظ ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں ''جاننا پہچاننا''، شریعت وتصوف کی راہ میں معرفت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو اس طرح جانا جائے پہچانا جائے کہ اس جاننے پہچاننے کے آثار اپنی ذات پر ظاہر ہونے لگیں۔ اللہ نے انسان کو اسی لئے پیدا کیا ہے۔

لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ ہم اللہ کی ذات کو جان نہیں سکتے تو پھر اللہ کو جاننے کا کیا مطلب ہے؟ جواب یہ ہے کہ اللہ کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی صفات کو جانا جائے، دوسرے اللہ تعالی کے افعال کو جانا جائے، تیسرے اللہ تعالی کے شئون کو جانا جائے، اللہ تعالی نے قرآن کریم میں اپنے افعال، اپنی صفات، اپنے شئون جگہ جگہ بیان فرمائے ہیں، انسان جب ان چیزوں کو جان لیتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کو اللہ کی پہچان حاصل ہے، اسے معرفت کی دولت مل گئی ہے۔

ذات خداوندی کی معرفت محال ہے

ابھی میں نے جو عرض کیا کہ اللہ کی ذات کو ہم نہیں جان سکتے، تو واقعی بات یہی ہے؛ اس لئے اللہ کی ذت کو جاننے کی کوشش نہ کرے، اس لئے کہ ذات کو جاننے کی کوشش کرے گا تو ناکام ہو جائے گا، کیونکہ اللہ کی ذات کو کوئی نہیں جان سکتا، ذات کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کیسے ہیں ذات کے اعتبار سے، جیسے انسان کی حقیقت ذات کے اعتبار سے یہ ہے کہ وہ مٹی سے بنایا گیا ہے، اس کے اعضاء اتنے ہیں، ان کے فلاں فلاں کام ہیں، اسی طرح دیگر مخلوقات کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ

کس چیز سے بنے ہیں، ان سب چیزوں کی پہچان ان کے مادہ سے ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی چاہے کہ مخلوقات کی طرح اللہ کی ذات کو جانوں تو یہ ناممکن بات ہے، اس لئے کہ اللہ کی ذات انسان کی عقل سے ماوراء ہے، انسان کی عقل نہ وہاں پہونچ سکتی ہے، نااس دنیا میں اس کی آنکھ اسے دیکھ سکتی ہے۔

اسی لئے اللہ تعالی نے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿لَاتُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾ (اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں) (الأنعام:۱۰۴)

اورحدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے: " تفكروا فی خلق الله لا تتفكروا في الله "(اللہ کی مخلوق میں غور وفکر کرو، اللہ کی ذات میں غور وفکر نہ کرو) (جامع الاحادیث:۱۰۹۰۱)

اسی لئے جب حضرت موسی علیہ السلام اللہ کی طرف سے فرعون کے پاس بھیجے گئے اور آپ نے فرعون سے کہا کہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول بن کر آیا ہوں تو فرعون نے کہا: **﴿وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾** (رب العالمین کیا چیز ہے) (الشعراء:۲۵)

یعنی ذات کے بارے میں پوچھ لیا۔ حضرت موسی سمجھ گئے کہ اسے معرفت کی ''الف ب'' بھی معلوم نہیں ہے، حالانکہ معرفت کی ''الف ب'' سے تو کوئی کافر بھی خالی نہیں۔

قرآن کریم میں ہے کہ جب کفار کی کشتی بھنور میں پھنس جاتی ہے، طوفان کی زد میں آجاتی ہے، تو اس وقت وہ لوگ بھی اللہ ہی کو پکارتے ہیں، اپنے بتوں کو بھول جاتے ہیں، کیا مطلب ہوا؟ مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے اپنی پہچان کافر کو بھی عطاء کی ہے، لیکن فرعون ملعون اتنا نابلد و بے وقوف تھا کہ اسے بالکل اللہ کی پہچان نہیں تھی جس کی وجہ سے ایسا غلط سوال کیا کہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ حالانکہ پوچھنا چاہئے

کہ ''رب العالمین'' کون ہے؟ جیسے آپ سے آکر کوئی پوچھے کہ آپ کیا چیز ہیں؟ تو آپ ہنسیں گے، یہ پوچھنا چاہئے کہ آپ کون ہیں؟

الغرض حضرت موسیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: ﴿رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ﴾ (وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی سب چیزوں کا رب ہے اگر تم یقین مانو) [الشعراء : ۲۴]

اور فرمایا: ﴿رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَائِكُمُ الْأَوَّلِيْنَ﴾ (اللہ وہ ہے جو زمین اور آسمان کا رب ہے، تمہارا اور تمہارے آباء واجداد کا رب ہے) [الشعراء: ۲۶]

اور فرمایا: ﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ مَابَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (وہ مشرق ومغرب اور ان کے درمیان کی چیزوں کا پروردگار ہے، اگر تم سمجھو) [الشعراء: ۲۸]

یعنی اللہ کی صفات کو بیان فرمایا، اللہ کی ذات کو بیان نہیں کیا، اس سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات کو کوئی جان نہیں سکتا۔ لہذا معرفت کا حاصل یہ ہوا کہ اللہ کی صفات وافعال کے بارے میں قرآن وحدیث اور انفس وآفاق میں پھیلے ہوئے دلائل میں غور وفکر کرتے ہوئے اس کی پہچان پیدا کرنا۔

جھوٹے مدعیان معرفت کی بے راہ روی

بعض لوگ اس لفظ معرفت کو بالکل غلط استعمال کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ایک شریعت والے ہیں، ایک معرفت والے ہیں، ان سے پوچھا جائے کہ معرفت کیا ہے؟ تو کہتے ہیں یہ کان میں کہی جانے والی بات ہے، سب کو نہیں بتائی جائیگی۔ اللہ تو معرفت کو قرآن میں کھلے عام بیان کررہا ہے، احادیث میں ہمارے آقا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے کھلے عام بیان فرمایا ہے، تو یہ کون ہوتے ہیں جو یہ کہیں

کہ معرفت عام نہیں ہے، اللہ نے تو اس لئے عام کر دیا تا کہ جو بندہ چاہے آسانی سے حاصل کر سکے اور جو لوگ معرفت کو خاص کرتے ہیں، ان سے ہوتا کچھ نہیں صرف دعوے کرتے ہیں۔

ہر ضروری چیز کو اللہ نے عام رکھا ہے

دنیا میں اللہ تعالی کا ایک اصول یہ ہے کہ انسان کو جس چیز کی جس قدر زیادہ ضرورت ہے، اللہ نے اسے اسی قدر عام کیا ہے، اور قیمتی بھی نہیں بنایا۔ مثلاً انسان کو کھانے کی زیادہ ضرورت تھی، اللہ نے اسے ہر جگہ عام کیا، دکان میں ملے گا، بازار میں ملے گا، ہر جگہ ملے گا۔ اسی طرح انسان کو پانی کی ضرورت کھانے سے بھی زیادہ ہوتی ہے؛ اس لئے اللہ تعالی نے پانی کو کھانے سے بھی زیادہ عام کیا ہے، اور اللہ نے ہر جگہ مفت رکھا ہے، ہم جو پانی کی بل دیتے ہیں وہ اللہ کو نہیں دیتے بلکہ پانی پہنچانے کا انتظام کرنے والوں کو دیتے ہیں، گورنمنٹ کو دیتے ہیں، اس لئے کہ انہوں نے اس اللہ کے پانی کو گھر گھر پہنچایا تو ہم ان کو سروس چارج دیتے ہیں، یہ پانی کا چارج نہیں ہے، پانی کا سروس چارج ہے، پانی کا چارج کون دے سکتا ہے؟ اگر اللہ تعالی پانی کا بل (bill) مانگنے لگیں تو آپ کسی بِل میں گھس جائیں گے، پانی کا بل نہیں دے سکیں گے، اور پانی سے زیادہ ضرورت انسان کو ہوا کی ہوتی ہے، اس لئے اللہ تعالی نے ہوا کو اتنا عام کیا ہے کہ آپ جہاں میں جہاں بھی جائیں گے وہیں ہوا آپ کا استقبال کرے گی، اس کا بھی کوئی بل کسی طور پر بھی نہیں لگتا، ایک انسان چوبیس گھنٹوں میں چوبیس ہزار دفعہ سانس لیتا ہے، یعنی ایک گھنٹے میں ایک ہزار دفعہ سانس لیتا ہے، اگر اللہ تعالی ایک گھنٹے کا بھی چارج کرتے تو انسان کی حالت کیا ہوتی؟

اس کے برخلاف جس چیز کی ضرورت کم ہوتی ہے، اللہ تعالی اسے خاص کرتے

چلے جاتے ہیں، اس پر پابندیاں لگاتے چلے جاتے ہیں، پابندیاں لگاتے لگاتے اسے قیمتی بھی بنادیتے ہیں، مقید کردیتے ہیں، محبوس کردیتے ہیں، مجبور کردیتے ہیں، اور قیمتی سے قیمتی بنادیتے ہیں، جیسے ''ہیرا'' انسان کی ضرورت کا نہیں ہے، اس لئے اللہ نے اسے اتنا قیمتی بنادیا کہ عام آدمی اسے خرید نہیں سکتا، اور محبوس بھی کردیا، ہم میں سے بہت سارے لوگوں نے ہیرے کو دیکھا ہی نہیں ہوگا، اسی طرح سونا، موتی وغیرہ ہیں۔

اب اس اصول کو سامنے رکھ کر میں ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اللہ کی معرفت انسان کو سانس سے زیادہ ضروری ہے، اس کے کھانے سے زیادہ ضروری ہے، اس کے پینے سے زیادہ ضروری ہے، اتنی زیادہ ضروری چیز کو کیا اللہ تعالی خاص کر کے رکھ دیں گے کہ بعض لوگوں کو دیدیں اور کہیں کہ تم ہی اسے لئے پھرنا، صرف کان میں بولنا۔ ہو ہی نہیں سکتا، ناممکن بات ہے، جیسے اللہ تعالی نے ضرورت انسانی کی اشیاء کو کھلے عام پیش کردیا ہے، اسی طرح معرفت الٰہی بھی ہماری روح کے لئے ضروری چیز ہے، جسے اللہ تعالی نے کھلے عام بیان فرمایا ہے، یہ کوئی مخفی اور پوشیدہ راز نہیں ہے۔

معرفت الٰہی کتنی عام ہے

اب میں آپ لوگوں کو بتاؤں گا کہ اللہ تعالی نے معرفت الٰہی کو انسانی ضرورت کے پیش نظر کتنا عام کیا ہے۔ قرآن کریم کی ہر آیت کے اندر معرفت موجود ہے۔

واقعہ لکھا ہے کہ ایک آدمی مسلمان ہوا، اس سے پوچھا گیا کہ کس چیز نے تمہیں اسلام کی طرف مائل کیا تو اس نے کہا کہ میں نے قرآن کریم پڑھا تو معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی ہر آیت میں اللہ تعالی نے اپنی کوئی نہ کوئی صفت بیان کی ہے، کہیں

بصیر فرمایا ہے تو کہیں خبیر، کہیں علیم فرمایا ہے تو کہیں علام الغیوب وغیرہ۔اس سے میں نے سمجھا کہ قرآن و اسلام در اصل اللہ کی معرفت کی تعلیم دیتے ہیں ،اس کے برخلاف عیسائی اور دوسرے مذاہب میں خدا کا کوئی خاص تذکرہ نہیں ،نہ اس کی صفات کا بیان ہے،اس لئے مجھے اسلام نے اپیل کیا اور میں مسلمان ہوگیا۔

تو معلوم ہوا ہر آیت میں معرفت کا سامان ہے، جو بھی قرآن کریم غور سے پڑھے گا تو وہ ضرور بالضرور اللہ کا عارف بندہ بن جائے گا، دوسری طرف احادیث نبوی بھی معرفت سے بھری پڑی ہیں،تیسرے یہ کہ اللہ نے ساری دنیا کی ہر چیز کو معرفت کا سامان بنادیا ہے، زمین کا ذرہ ذرہ معرفت الٰہی کا مظہر ہے، آسمان کا ذرہ ذرہ معرفت الٰہی کا مخزن ہے، سورج اللہ کی معرفت کا سامان، چاند اللہ کی معرفت کا سامان، شجر وحجر اللہ کی معرفت کا سامان، چیونٹی اللہ کی معرفت کا سامان، خود انسان اور اس کے اعضاء اللہ کی معرفت کا سامان ہیں۔

بھائیو! اب بتاؤ کہ اللہ کی معرفت کتنی عام ہے؟ کھانا لینے تو آپ کو بازار جانا پڑے گا، لیکن معرفت حاصل کرنے کہیں جانے کی ضرورت نہیں، نیچے دیکھو تو معرفت ،اوپر دیکھو تو معرفت ، داہنی طرف دیکھو تو معرفت ، بائیں طرف دیکھو تو معرفت، سامنے دیکھو تو معرفت، پیچھے دیکھو تو معرفت، ہر سو اللہ کی معرفت کا سامان جمع ہے۔

اسی لئے ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ وَّ

تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾(البقرۃ:۱۶۴)

(بلا شبہ زمین وآسمانوں کی تخلیق میں اور رات و دن کے آنے جانے میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کی نفع بخش چیزیں لیکر چلتی ہیں اور پانی میں جس کو اللہ نے آسمان سے نازل کیا، پھر اس سے زمین کے خشک ہوجانے کے بعد اس کو تر و تازہ کیا (اور کھیتیاں اگائیں) اور ان سے زمین میں ہر قسم کے حیوانات پھیلائے، اور ہواؤں کی سمتوں کے بدلنے میں (کہ کبھی پرُوا ہوا چلتی ہے تو کبھی پچھوا، کبھی گرم تو کبھی سرد) اور بادل میں جو زمین وآسمان کے درمیان معلق ہے، ان سب میں عقل سے کام لینے والوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں)

قرآن میں اس طرح کی سینکڑوں آیات ہیں جن میں اللہ تعالی نے انسانوں کو انفس وآفاق میں غور کر کے اللہ کی معرفت حاصل کرنے کی دعوت دی ہے۔

ایک جگہ کس قدر عجیب انداز سے فرمایا گیا کہ:

﴿ اَفَلاَ يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ، وَ اِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ، و اِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ﴾ [الغاشية:۱۷–۲۰]

(تو کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنایا گیا ہے، اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح کھڑے کئے گئے ہیں اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح پھیلائی گئی ہے)

اس میں سبھی لوگوں کو بالعموم اور عربوں کو بالخصوص دعوت دی گئی ہے جن کے پاس اونٹ ہوا کرتے تھے کہ اللہ کی قدرت دیکھنا ہو اور اس کی معرفت پیدا کرنا ہو تو

ان اونٹوں اور دیگر مخلوقات کو دیکھو اور معرفت حاصل کرو۔

حصول معرفت کا طریقہ

الغرض اللہ کی صفات کو جاننے اور ان پر غور کرنے سے اللہ کی معرفت آتی ہے، اللہ کی بے شمار صفات ہیں، جیسا کہ اللہ کے صفاتی ناموں سے معلوم ہوتا ہے، اللہ کے ہزاروں صفاتی نام ہیں، ہر نام میں اللہ کی ایک صفت بیان کی گئی ہے، ان میں سے ایک مثال کے طور پر اللہ کا رحم وکرم ہے، یہ ایک ایسی صفت ہے کہ بچہ بچہ جانتا ہے، ہر آن اور ہر لمحہ اللہ کی طرف سے ہمارے اوپر رحم وکرم کی بارش ہو رہی ہے، یہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کھلی ہوئی حقیقت کو کھولنے کی کوشش کرنا تحصیل حاصل ہے۔

اب ہم نے اللہ تعالیٰ کو جانا کہ ہمارا رب وہ رب ہے جو ہمارے اوپر ہر وقت احسان وکرم ورحم فرما رہا ہے، میں اٹھتا ہوں تو اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، بیٹھتا ہوں تو اللہ کا رحم میرے ساتھ، میں کھاتا ہوں تو اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کا رحم وکرم میرے ساتھ، سب جگہ رحم ہی رحم اور کرم ہی کرم ہو رہا ہے۔

آپ بستر سے اٹھ رہے ہیں، اگر خدا کا رحم وکرم شاملِ حال نہ ہوتو آپ بستر سے کیسے اٹھ جائیں گے؟ اگر خدا کا رحم وکرم نہ ہوا تو آپ کا کھانا آپ کے حلق کے اندر کیسے اتر جائے گا، وہی لقمہ آپ کے لیے موت کی دعوت بن سکتا تھا، لیکن وہ لقمہ آپ کھاتے ہیں، اندر بھی پہونچتا ہے، ہضم ہوتا ہے، اس سے قوت بنتی ہے اور آپ کام کاج کرنے کے قابل ہوتے ہیں، دین ودنیا کے بہت سارے کام کاج کرنے لگتے ہیں، کیا یہ اللہ تعالیٰ کا رحم وکرم شامل حال ہونے ہی کی وجہ سے نہیں ہے؟

کھاتے وقت اللہ کا عجیب رحم وکرم

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہ نے ایک جگہ پر فرمایا ہے کہ ہم جو روزانہ کھانا کھاتے ہیں، یہ اصل میں اگر ہم غور کریں تو دو دفعہ اپنے اوپر فائرنگ کرنے کی طرح ہے، بندوق چلانے کی طرح ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ جب آپ لقمہ لیتے ہیں اور منہ میں رکھتے ہیں اور حلق میں اتارتے ہیں تو حلق میں اتارنے کے وقت ایک ایسے کٹھن و نازک مرحلہ سے آپ کو گذارا جاتا ہے کہ اگر آدمی تھوڑی دیر سوچے تو پریشان ہوجائے، بڑا نازک مرحلہ ہوتا ہے۔

ہر انسان کے حلق میں دو نلکیاں ہوتی ہیں، ایک سامنے اور ایک پیچھے، پیچھے جو نلکی ہے، اس میں کھانا جاتا ہے اور سامنے جو نلکی ہے، اس میں ہوا کا آنا جانا ہوتا ہے، جس سے آپ سانس لیتے ہیں، تو پہلے سانس کی نلکی آتی ہے اور سانس کی نلکی کو پار کرکے کھانا پیچھے کی نلکی میں جاتا ہے، اب سوچئے کہ اگر ذرا سا پانی کا قطرہ یا ذرا سا کھانے کا دانہ پیچھے کی نلکی میں جانے کے بجائے پہلی میں اُتر جائے تو ہلاکت اور موت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا کیا نظام بنایا؟ حلق کے پاس ایک چھوٹی سے جیب بنائی ہے اور جب انسان کھانا یا پینا چاہتا ہے تو اس جیب کو حلق کے اوپر پل کی طرح بنادیتے ہیں، جب آپ کھانا کھاتے ہیں تو وہ جیب پلٹ کر اس پہلی نلکی کو بند کردیتی ہے، اور اس پر پل بن جاتی ہے اور کھانا اس پل پر سے پار ہوکر اندر دوسری اندر والی نلکی میں چلا جاتا ہے۔

یہ ہے سسٹم، اب اس سسٹم پر تھوڑی دیر کے لیے غور کیجئے کہ وہ جیب بند نہ ہوئی تو کیا ہوگا، اگر کوئی پروبلم (problem) آجائے پھر تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔

یہ رحم نہیں ہے اللہ کا؟ اگر خدا تعالیٰ کا رحم ایک منٹ کے لئے بھی بلکہ ایک منٹ

کے ۱۰۰ حصہ میں سے بھی تھوڑے حصہ میں نہ ہو تو پھر انسان کے لیے ہلاکت ہے۔ اب روزانہ ہم تین دفعہ کھانا کھاتے ہیں، دراصل تین دفعہ ہم روزانہ اپنے اوپر فائرنگ کرتے ہیں۔ اب کھاتے وقت آدمی یہ سوچے کہ میں کھانے جارہا ہوں، اور اندر کی جیب کھل رہی ہے، پل بن رہا ہے، وہ میرا کیسا خدا اور مالک ہے جس نے ایسا سسٹم بنا رکھا ہے۔ کیا اس سے اللہ کی معرفت پیدا نہیں ہوگی؟

صفت رحمت سے قرآن کی ابتداء

قرآن کریم جہاں شروع ہوا ہے، وہاں سب سے پہلے یہ آیت ہے۔ ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ﴾ (شروع اللہ کے نام سے جو بہت رحم والا نہایت مہربان ہے) رحیم ورحمان دو لفظ لائے گئے، دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں، دونوں کے اندر انتہائی مبالغہ ہے، رحمٰن کے معنی ہیں، بے انتہا رحم کرنے والا،، یہی معنی رحیم کا بھی ہے، اور دونوں میں فرق ہے، وہ فرق یہ ہے کہ رحمان اس کو کہتے ہیں جس کا رحم وکرم ہر چیز پر عام ہو، اور رحیم کہتے ہیں اس کو جس کا فضل وکرم ورحم مخصوص قسم کے لوگوں کے لیے مخصوص انداز کا ہو، جیسے انبیاء کے لیے مخصوص رحم ہے، اولیاء کے لیے مخصوص کرم ہے، اپنے خاص بندوں کے لیے مخصوص انداز کا اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، مخصوص رحم کرنے والے کو رحیم کہتے ہیں اور جس کی رحمت سب کے لیے عام ہو، چاہے کافر ہو، چاہے ماننے والا ہو، چاہے نہ ماننے والا ہو، چاہے وہ انسان ہو یا کوئی اور چیز ہو، سب کے لیے جس کی رحمت عام ہو، اسے رحمان کہتے ہیں۔

اسی لیے علماء کرام نے لکھا ہے کہ کسی انسان کو رحمٰن نام رکھنا تو جائز نہیں ہے، ہاں رحیم نام رکھ سکتے ہیں، اس لیے کہ انسان اس قدر عام رحم کا معاملہ کر ہی نہیں سکتا، لہذا انسان رحمان نہیں بلکہ عبدالرحمٰن ہے، رحمان کا بندہ ہے، لیکن رحیم چاہے تو رکھ

سکتے ہیں، اس لیے کہ مخصوص رحم انسان بھی کسی کے ساتھ کر دیتا ہے، لیکن عام رحم جیسے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اچھوں پر، بروں پر، انسانوں وجانوروں پر، ہر مخلوق پر، ہر طرح، ہر اعتبار سے، اس طرح رحم کرنے والا صرف اور صرف اللہ ہے۔

اللہ نے سب سے پہلے یہ آیت قرآن میں ذکر کی، یہ بتانے کے لیے کہ میری ذات کا عنوان ہی رحمان ورحیم ہے۔ جب ہم اللہ کی اس صفت میں غور کریں گے تو معرفت الٰہی پیدا ہوگی۔

تصوف کا ایک مسئلہ

جب آپ کو یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اسی سے ایک تصوف کا مسئلہ بھی حل ہو گیا وہ یہ کہ جہاں تک حصول معرفت کا مسئلہ ہے، اس کے لئے کسی شیخ ومرشد کی کوئی ضرورت نہیں، ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ بات عجیب لگے، لیکن حقیقت یہی ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا دنیا ومافیہا کا ہر ذرہ اپنے اندر معرفت الٰہی کا سامان رکھتا ہے، تو حصول معرفت کے لئے کسی شیخ کی ضرورت نہیں۔ اب سوال پیدا ہوگا کہ پھر پیر کی ضرورت کس لئے ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت کے آثار اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے شیخ کی ضرورت ہے، حصول معرفت کے لئے نہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے معرفت الٰہی کے سلسلہ میں کسی بھی انسان کو معذور قرار نہیں دیا ہے مثلاً کوئی کہنے لگے، اے اللہ! مجھے تیری معرفت ملی ہی نہیں، معلوم ہی نہیں ہوا، میں کیا کروں؟ اگر مجھے تیری معرفت مل جاتی تو میں تیری عبادت کرتا، اگر اللہ کے سامنے یوں کہے گا تو اس کا عذر معتبر نہیں ہوگا، اس لئے کہ کائنات کا ہر ذرہ معرفت کا سامان ہے۔ اسی لئے امام اعظم ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ کسی بھی انسان کو اللہ کی معرفت اور توحید بتانے کے لئے کسی نبی کا آنا ضروری نہیں، بلکہ اس کے لئے اس کی

عقل خود کافی ہے۔ معلوم ہوا جب معرفت الٰہی کے لئے نبی ہی کی ضرورت نہیں تو پھر شیخ کی کیا ضرورت ہے؟ ہاں معرفت کے آثار اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے شیخ کی ضرورت ہے۔

کیونکہ معرفت کی شرعی تعریف صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کی صفات کو جان لیا جائے، کیونکہ اتنا جاننا تو ہر مخلوق میں عام ہے، حتی کہ کافر بھی اتنا جانتا ہے، بلکہ معرفت کی تعریف یہ ہے کہ اللہ کو اس طرح سے جانے پہچانے کہ اس کے آثار نمایاں ہوں اور ان سے انسان متأثر ہو۔

معرفت کا علم آثارِ معرفت ہی سے ہوتا ہے

جب اللہ کی معرفت بندہ کے قلب میں آتی ہے تو اس پر اس کے کچھ آثار مرتب ہوتے ہیں اور ہر چیز میں یہی بات ہے کہ جب کسی چیز کو جاننے کے بعد اُس کا اثر مرتب ہو تب کہا جاتا ہے، سمجھا جاتا ہے، عوام میں بھی، خواص میں بھی کہ اس کو وہ چیز حاصل ہوگئی۔

مثال کے طور پر ایک لڑکا ہے، وہ اپنے باپ کو گالی دیتا ہے تو آپ اُسے کہتے ہیں کہ کیا حرکت کر رہا ہے، وہ تو تیرا باپ ہے باپ۔ وہ لڑکا آپ کو پلٹ کر یہ کہے گا کہ مجھے آپ سے زیادہ معلوم ہے کہ یہ میرا باپ ہے۔ باپ ہونے کا علم بیٹے کو جتنا ہے کسی اور کو کیا ہوسکتا ہے؟ ظاہر بات ہے، وہ دوسروں سے زیادہ اپنے باپ کی پہچان رکھتا ہے، لیکن اسے آپ بتاتے ہیں کہ بھائی! وہ تیرا باپ ہے باپ۔ کیوں بتاتے ہیں؟ اس لیے کہ باپ کو باپ جاننے کا جو اثر ہونا چاہئے، اس کا ادب، اس کی جلالت، اس کی عظمت، اس کا خوف، اس کی خشیت، وہ اس کے اندر نہیں ہے، اس لیے آپ اسے کہتے ہیں، بھائی! یہ تیرا باپ ہے باپ ۔وہ اگر آپ کو پلٹ کر یہ

جواب دے کہ مجھے تو آپ سے اچھا معلوم ہے کہ یہ میرا باپ ہے، تو آپ اسے کہتے ہیں کہ تو نے باپ کو جانا ہی نہیں ہے، اگر تو جان لیتا تو پھر اس کی عظمت نہ ہونے کا کیا سوال؟ اس سے محبت نہ ہونے کا کیا سوال؟ اس کا ادب نہ کرنے کا کیا سوال؟ ظاہر بات ہے کہ یہ چیزیں جاننے کا اثر ہیں، لازمہ ہیں، وہ اس کے اندر آنا ضروری ہے۔

جب تک معرفت و پہچان کا اثر نہیں پیدا ہوگا نہیں سمجھا جائے گا اور نہیں مانا جائے گا نہیں قبول کیا جائے گا کہ اسکو اس چیز کی معرفت حاصل ہے، ہوسکتا ہے کہ لغت و ڈکشنری کے معنی کے لحاظ سے حاصل ہوگئی ہو، مگر شریعت میں اس کو معرفت حاصل نہیں ہوئی۔

بالکل اسی طریقہ پر بھائیو! اللہ کی معرفت یعنی اللہ کے اوصاف اور کمالات اور اللہ کی خصوصیات کو جاننے و پہچاننے کا جو اثر ہونا چاہئے، جب تک وہ اثر ہمارے اندر نہیں پیدا ہوگا، یہی سمجھا جائے گا کہ اللہ کی معرفت نصیب نہیں ہے۔ اور جب اس معرفت کے آثار پیدا ہو جائیں تو سمجھا جائے گا کہ معرفت حاصل ہوگئی۔ اس لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ معرفت کا علم آثار معرفت ہی سے ہوتا ہے۔

اللہ کی معرفت کا پہلا اثر محبت ہے

اب آیئے یہ دیکھیں کہ معرفت الٰہی کے آثار کیا کیا ہیں؟ اللہ کی معرفت کا ایک اہم ترین اثر اللہ کی محبت ہے اور یہ قلب کی عبادت ہے، دل میں اللہ کی محبت آئے گی تو دل اللہ کا عبادت گذار بنے گا، اور جب دل کے اندر دنیا اور دنیا والوں کی محبت ہوگی تو دل گنہگار ہو جائے گا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ قُلۡ اِنۡ كَانَ اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ وَاِخۡوَانُكُمۡ وَاَزۡوَاجُكُمۡ وَعَشِيۡرَتُكُمۡ وَاَمۡوَالُ ۨاقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَتِجَارَةٌ تَخۡشَوۡنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرۡضَوۡنَهَآ اَحَبَّ اِلَيۡكُمۡ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَجِهَادٍ فِىۡ سَبِيۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِيۡنَ ﴾(التوبۃ:۲۴)

(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے ماں باپ، تمہاری اولاد، تمہارے بھائی بہن، بیویاں، رشتہ دار، تمہارے مال جو تم کماتے ہو، تجارت جس کے خسارے کا تم کو خطرہ لگا رہتا ہے، تمہارے مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب اگر تم کو اللہ ورسول اور اللہ کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ کا حکم یعنی عذاب آجائے، اور اللہ حد سے گزر جانے والوں کو ہدایت نہیں دیتے)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں کہا کہ ان لوگوں سے محبت نہ رکھو، اور تم ماں باپ سے محبت نہیں کر سکتے، بیوی سے محبت نہیں کر سکتے، جائیداد واملاک سے محبت نہیں رکھ سکتے، بلکہ یہ فرمایا کہ ان سے اللہ ورسول سے زیادہ محبت نہیں رکھ سکتے۔ ہاں والدین سے بھی محبت چاہئے، بیوی سے بھی محبت چاہئے، اگر والدین سے محبت نہ ہوگی تو والدین کا حق کیسے ادا ہوگا، ان کا ادب کیسے کریں گے۔ سب سے محبت ہو، لیکن وہ محبت کمزور ہو اور اللہ ورسول کی محبت غالب ہو۔

معلوم یہ ہوا کہ ساری چیزوں کی محبت کمزور ہونی چاہئے، اللہ اور رسول کی محبت غالب ہونا چاہئے۔ یہ معرفت کا اثر ہے، جب بندہ اللہ کو پہچان لے گا اور یہ بھی پہچان لے گا کہ ماں باپ کو بنانے والا بھی وہی، میری بیوی کو بنانے والا بھی وہی، میرے بھائی بہنوں کو پیدا کرنے والا بھی وہی، جائیداد املاک کو پیدا کر کے مجھ تک

پہونچا کر میرے لیے راحت کا سامان کرنے والا بھی وہی، تو اللہ کی محبت ضرور آئے گی، اس لیے جب معرفت آئے گی تو اللہ کی محبت ضرور آئے گی۔

معرفت سے ہی محبت پیدا ہوتی ہے، امام رَبِیْعَۃُ الرَّ ائے کا واقعہ

یاد رکھئے کہ جب تک انسان کو اللہ کی پہچان نہ ہو، اس کے دل میں اللہ کی محبت پیدا نہیں ہوسکتی، بہت زمانہ پہلے یعنی بنو امیہ کے دور کا واقعہ ہے، جب کہ امام مالک ابھی طالب علمی کی زندگی گذار رہے تھے، ان کے ایک استاذ تھے، جن کا نام رَبِیْعَۃُ الرَّ ائے تھا، بہت بڑے عالم تھے، آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ امام مالک کے استاذ کیسے ہوں گے؟ بہت بڑے جلیل القدر فقیہ بھی تھے اور محدث بھی تھے، اور اللہ والے بزرگ بھی تھے، ان کے والد کا نام فروخ تھا۔

جب امام ربیعۃ الرائے ماں کے پیٹ میں تھے تو ان کے والد فروخ خراسان کی جانب جہاد کی مہم پر امیر المومنین کے حکم سے نکل گئے، جب جہاد میں جانے کے لیے نکلے تو چوں کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ کب واپسی ہوگی اور کیا حالات ہوں گے کہ زندہ بھی آؤں گا یا اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں گا؟ اس لئے ان کے پاس جو ۳۰ رہزار دینار یا درہم تھے، انہوں نے اپنی بیوی کو دیا اور کہا کہ میں جہاد میں جارہا ہوں اور یہ تیس ہزار تمہارے حوالے ہیں، ضرورت کے مطابق اس میں سے خرچ کرتے رہنا، اگر اللہ تعالیٰ نے زندگی باقی رکھی اور واپسی ہوگئی تو پھر میں تم سے آکر حساب لے لوں گا یہ کہہ کر نکل گئے۔

جو نکلے تو ایسے حالات ان کے اوپر آئے کہ تاریخ بغداد کے مطابق تقریباً اس واقعہ کے ستائیس برس بعد ان کو لوٹنا نصیب ہوا، لمبے چوڑے عرصے کے بعد واپسی ہوئی۔ مدینہ ان کی بستی تھی اور اپنی بیوی کو مدینہ میں ہی چھوڑ کر گئے تھے، جب

واپس مدینہ آئے تو دیکھا کہ وہاں کی پوری فضا بدلی ہوئی ہے، نئی نئی سڑکیں بن گئی ہیں، نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں، خیر آئے اور بہت غور وفکر کے بعد اپنی گلی وغیرہ کو پہچانا اور اپنے گھر پہنچے اور جب پہونچے تو وہ رات کا وقت تھا، اپنے گھوڑے کو ایک طرف باندھا اور نیزے سے دروازہ کھولا، اور دروازے کے اندر گھسنے لگے۔

تو ایک صاحب باہر آرہے تھے، دونوں میں ملاقات ہوئی، جب انہوں نے دیکھا کہ یہ اندر گھس رہے ہیں تو ان کوٹوکا اور کہا کہ ارے اللہ کے دشمن! کسی کے گھر میں بلا اجازت جانا جائز نہیں ہے، تو فروخ نے کہا: یہ کسی کا گھر نہیں ہے، یہ تو میرا گھر ہے، میرے گھر میں کس سے اجازت لوں؟ اب دونوں میں تو تو میں میں ہونے لگی، وہ کہتے ہیں یہ میرا گھر ہے اور وہ کہتے ہیں تم گھس نہیں سکتے، یہ تو میرا گھر ہے، دونوں میں جو گفتگو ہوئی تو پڑوسی لوگ جمع ہوگئے، ربیعہ کہنے لگے کہ میں ان کو سلطان کے پاس فیصلہ کے لئے لے جاؤں گا اور فروخ نے کہا کہ ہاں میں بھی تم کو بادشاہ کے پاس لے جاؤں گا، یہ سب باتیں ہورہی تھیں کہ ان کی بیوی نے اندر سے سنا اور آکر دیکھا کہ کیا ہورہا ہے؟

جو دیکھا تو تماشا یہ نظر آیا کہ دونوں باپ بیٹے دست وگریبان ہیں، ان کو بڑا تعجب ہوا، اور انہوں نے کہا کہ یہ معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جھگڑا ہورہا ہے، پہچان نہیں ہے، باپ نے بیٹے کو پہچانا اور نہ بیٹے نے باپ کو پہچانا۔ بیوی نے کہا کہ تم دونوں آپس میں کیا کررہے ہو؟ بیٹے سے کہا: بیٹا ربیعہ! یہ تو تمہارے باپ ہیں، ملاقات کرواوران سے کہا فروخ یہ تمہارے بیٹے ہیں، ان سے ملاقات کرو۔ جب ماں نے پہچان کرائی تو پھر دونوں نے معافی چاہی اور روتے ہوئے آپس میں گلے ملنے لگے۔ (تاریخ بغداد: ۴۲۲/۸)

میں نے یہ مثال اس لیے دی تھی کہ جب دونوں میں پہچان نہیں تھی تو لب و لہجے میں فرق، اور انداز ایسا، اور جب بیٹے کو معلوم ہوا کہ یہ میرے ابا جی ہیں اور باپ کو معلوم ہوا کہ یہ میرا بیٹا ہے تو پھر گلے مل رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ معرفت و پہچان اتنی بڑی چیز ہے کہ جب پہچان ہوتی ہے تو دل میں محبت آتی ہے اور پہچان نہیں ہوتی تو دل میں محبت نہیں ہوتی۔ اس لیے جب انسان اللہ کی پہچان اپنے اندر پیدا کرتا ہے تو اس کے دل کے اندر اللہ کی محبت آجاتی ہے۔

معرفت کا ایک اثر خوف الٰہی ہے

معرفت کا ایک اثر خوف الٰہی ہے، کہ آدمی اللہ کی جلالت وعظمت کی وجہ سے اللہ سے خوف کھائے اور ڈرے۔ خوفِ خداوندی معرفت الٰہی کے اثرات میں سے بہت بڑا اثر ہے، جس میں اللہ کی معرفت ہوگی وہ اللہ کا خوف اور خشیت بھی رکھے گا اور جس کے دل میں خوف الٰہی نہ ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں معرفت الٰہی بھی نہیں ہے۔

اللہ کا خوف دو وجہ سے ہوتا ہے، ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیں گے، اس وجہ سے اللہ سے ڈر رہا ہے، یہ تھرڈ کلاس ڈر ہے، اور فسٹ کلاس ڈر یہ ہے کہ اس لیے ڈر رہا ہے کہ اللہ کی عظمت وجلالت اس کے دل میں ہے کہ اللہ کیسی عظیم و بھاری ذات ہے، کتنی قدرت والی ذات ہے، اس اللہ کی عظمت و کبرائی کے پیش نظر وہ اللہ سے ڈرتا ہے۔

دونوں بھی درست ہیں لیکن ان میں اعلیٰ وادنی کا فرق ہے۔ اللہ کی عظمت وجلالت کے پیش نظر ہمارے دلوں میں خوف خدا پیدا ہو جائے ، اور یہ کب پیدا

ہوگا؟ جب اللہ کی معرفت ہوگی۔ جیسے ایک شخص باپ کی عظمت کو جانتا ہے تو اس کا خوف وڈر اس کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔ باپ سے نہ ڈرنے والے دراصل باپ کی عظمت وجلالت سے واقف ہی نہیں ہوتے؛ اس لئے وہ باپ کی توہین کرتے اور اس سے بے خوف ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت کا مشاہدہ ہوجائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ کا ڈر نہ پیدا ہو۔ جب یہ معلوم ہو کہ اللہ کی ذات وہ ہے جس کے بارے میں خود اس نے کہا ہے کہ: ﴿یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ وَ یَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ﴾ (کہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو ارادہ کرتا ہے اس کا فیصلہ کرتا ہے) اس کی عظیم ہستی کے سامنے کسی نبی یا ولی یا فرشتہ کو لب کشائی کی مجال نہیں۔ اس کے سامنے کسی کی سفارش کرنا بھی اس کے اذن وحکم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ ان سب امور کی معرفت سے ضرور اللہ کا خوف پیدا ہوگا۔

خوف الٰہی بھی معرفت کا نتیجہ ہے، ایک واقعہ

اس سے معلوم ہوا کہ خوف بھی معرفت و پہچان کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے، اگر معرفت و پہچان نہ ہو تو خوف نہیں آسکتا، جب پہچان ہوگی تو خوف آجائے گا۔

امام جلال الدین رومیؒ نے لکھا ہے کہ ایک آدمی سفر پر نکلا، جنگل میں چلتا رہا، جنگل میں بہت دور چلنے کے بعد اسے تھکان ہوئی اور تھکان کی وجہ سے نیند غالب ہوگئی، اس نے سوچا کہ کہیں آرام کرلوں لیکن آرام کرنے اس لیے ہمت نہیں ہوئی کہ جنگل کا راستہ ہے اور جنگل کے راستہ میں کیسے آرام کروں؟ سوچتا رہا کہ کوئی چیز مجھے ایسی مل جائے جس کی وجہ سے مجھے کچھ سہارا مل جائے تو میں آرام کرلوں، بہت آگے جانے کے بعد دیکھا کہ ایک جانور سویا ہوا ہے، اس نے کہا کہ بہت اچھا،

یہ کوئی جانور سورہا ہے، میں بھی اس کے بازو سو جاؤں۔

چنانچہ جانور کے بازو وہ بھی جا کر لیٹ گیا، نیند کا اتنا غلبہ تھا، تھکان ایسی تھی کہ بس پڑتے ہی نیند لگ گئی، کچھ دیر بعد اسی راستے سے ایک دو آدمی آرہے تھے، پیچھے سے آتے آتے جب وہ وہاں پہنچے تو ایک عجیب منظر انہوں نے دیکھا کہ ایک انسان سویا ہوا ہے اور اس کے بازو جو جانور سویا ہوا ہے، وہ حقیقت میں شیر ہے، یہ لوگ بہت پریشان ہوئے کہ کہیں یہ شیر جاگے اور اس بیچارے کو کھا جائے۔ انہوں نے آہستہ سے سونے والے کو آواز دی اور جگایا، جب وہ جاگا تو ان لوگوں نے اس سے کہا کہ کہاں سوئے ہو؟ وہ تمہارے بازو شیر ہے شیر۔ بس جناب اتنا سنتے ہی وہ گھبرایا پریشان ہوا اور ڈر کے مارے اس کی جان نکل گئی اور مر گیا۔

دیکھئے جب تک اسے شیر کی معرفت و پہچان نہیں تھی تو اس پر شیر کا خوف بھی پیدا نہیں ہوا، جیسے ہی شیر کی معرفت حاصل ہوئی تو اس کا خوف بھی پیدا ہوا اور وہ مر گیا۔ اسی طرح جب اللہ کی پہچان انسان کو ہو جاتی ہے کہ اللہ کتنا بڑا اور زبردست ہے، کتنی بڑی طاقت والا ہے، وہ کیا سے کیا کر سکتا ہے،؟ جب یہ پہچان اللہ کی انسان کو ہوگی تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے دل کے اندر کوئی ہلچل نہ مچے اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں اللہ کا خوف پیدا نہ ہو۔

نبی ﷺ کا خوف

دیکھئے رسول اللہ ﷺ اور اولیاء اللہ کو معرفت حاصل تھی تو وہ حضرات اللہ کا ڈر و خوف بھی رکھتے تھے۔ حدیث میں ہے، ایک صحابی کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کی خدمت میں آیا تو دیکھا کہ:" وهو يصلي ولصدره أزيز كأزيز المرجل" (رسول اللہ ﷺ جب نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کے سینہ سے ایک آواز نکل رہی تھی

جیسے ہانڈی پکنے کی آواز ہوتی ہے)(ابوداود:۹۰۴،احمد:۱۶۳۵۵،شرح السنۃ:۳/۲۴۵، نسائی:۱۲۱۴)

حضرت عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی کوئی عجیب بات سنایئے جو آپ نے دیکھی ہو، حضرت عائشہ کچھ دیر خاموش رہیں، پھر کہا کہ ایک بار اللہ کے نبی میرے پاس رات میں لیٹے ہوئے تھے، آپ نے کہا کہ یا عائشہ! چھوڑ کہ میں آج رات اللہ کی عبادت کروں، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں تو آپ کا قرب چاہتی ہوں، اور یہ بھی کہ جو آپ کو پسند ہو۔ پھر آپ اٹھے اور وضو کیا اور نماز پڑھنے لگے اور برابر روتے رہے، یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھی مبارک اور زمین تر ہوگئی۔ پھر حضرت بلال آپ کو نماز فجر کیلئے بلانے آئے اور جب دیکھا کہ آپ رو رہے ہیں تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کیوں روتے ہیں جبکہ اللہ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کردئے ہیں تو فرمایا کہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔(صحیح ابن حبان:۲/۳۸۶،مشکل الآثار للطحاوی:۱۰/۲۳۶،موارد الظمآن :۱/۱۴۳)

صحابہ کا خوف

اسی طرح حضرات صحابہ بھی عارفین تھے تو ان کو بھی خوف خدا حاصل تھا۔ بخاری وغیرہ میں حضرات صحابہ کے بارے میں آیا ہے کہ ایک بار اللہ کے نبی ﷺ نے خطبہ دیا، حضرت انس کہتے ہیں کہ میں نے کبھی ایسا خطبہ نہیں سنا، آپ نے اس میں فرمایا کہ :’’ لو تعلمون ما أعلم لضحكتم قليلا و لبكيتم كثيرا‘‘(اگر تم ان باتوں کو جان لو جو میں جانتا ہوں تو تم بہت کم ہنستے اور زیادہ روتے) یہ سن کر

حضرات صحابہ سب کے سب رونے لگے۔ایک روایت میں ہے کہ صحابہ نے اپنے سروں کو ڈھانپ لیا اور رونے لگے۔(بخاری:۴۶۲۱)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے سورۂ مطففین نماز میں پڑھی اور آیت:''یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' (جس دن کہ لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے) تک پہنچے تو روتے رہے یہاں تک کہ بے ہوش کر گر پڑے۔(صفۃ الصفوۃ:۲۰۳/۱)

اولیاءاللہ کا خوف

حضرات اولیاءاللہ کا خوف بھی دیکھئے،ایک بڑے بزرگ حضرت منصور بن عمار گزرے ہیں،امام ابن الجوزی نے ان سے ایک اللہ والے کا قصہ ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات میں باہر نکلا،ابھی رات کا ایک حصہ باقی تھا، میں کسی کے ایک چھوٹے سے دروازے کے پاس بیٹھ گیا تو وہاں ایک نوجوان کی آواز آرہی تھی جو رورہا تھا،اور اللہ سے یوں کہتا جارہا تھا کہ اے اللہ! تیری عزت وجلالت کی قسم، میں گناہ کر کے تیری مخالفت کرنا نہیں چاہا،اور جب میں نے تیری نافرمانی کی ہے،تو میں تیری سزا سے لاعلم نہیں تھا،اور نہ تیری نظر سے غائب تھا، لیکن میرے نفس نے مجھے چکما و دھوکہ دیا اور مجھ پر بدبختی غالب آگئی،اور میرے گناہوں پر پڑے ہوئے تیرے پردے نے مجھے مغرور کردیا،اور اب مجھے تیرے عذاب سے کون بچائے گا اور اگر تیری رسی سے میں کٹ جاؤ گا تو کس کی رسی کو تھاموں گا، ہائے میں کتنی دفعہ توبہ کروں اور کتنی دفعہ پھر گناہوں کی طرف جاؤں؟ اب وقت آگیا کہ میں میرے رب سے شرماؤں۔حضرت منصور بن عمار کہتے ہیں کہ میں نے یہ سن کر زور سے یہ آیت پڑھ دی:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلاَئِكَةٌ غِلاَظٌ شِدَادٌ الخ ﴾[التحریم:٦]

(اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، جس کا ایندھن انسان و پتھر ہیں، جس پر سخت گیر و تندخو فرشتے مقرر ہیں)

کہتے ہیں کہ پھر میں نے ایک اضطراب و پریشانی کی آواز محسوس کی، اور اپنے کام سے چلا گیا، صبح کو جب واپس ہوا تو دیکھا کہ اسی گھر پر ایک جنازہ رکھا ہوا ہے اور ایک بوڑھی عورت وہاں آجا رہی ہے، میں نے اس سے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے تو کہنے لگی کہ میرے غم کو تازہ مت کرو، میں نے کہا کہ میں مسافر ہوں اس لئے پوچھ رہا ہوں تو کہنے لگی کہ یہ میرا بیٹا ہے، رات کسی نے ایک آیت پڑھ دی تھی جس میں جہنم کا ذکر تھا، اس کو سن کر میرا بیٹا بے قرار ہو گیا اور روتا رہا، یہاں تک کہ مر گیا۔ حضرت منصور کہتے ہیں کہ یہی ان حضرات کی صفت ہوتی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ (التبصرہ: علامہ ابن الجوازی: ۱۷)

تو دیکھئے یہ مثالیں میں نے دی کہ معرفت سے محبت بھی پیدا ہوتی ہے اور خوف بھی، دونوں جگہ جو مشترک مضمون ہے، وہ کیا ہے؟ ''پہچان''، پہچان ہوئی تو محبت آئی، پہچان ہوئی تو خوف آیا، پہچان نہیں تو محبت بھی نہیں، خوف بھی نہیں، اسی لیے عام طور پر اللہ کی محبت اور اللہ کا خوف نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں اللہ کی پہچان نہیں، صحیح معنوں میں اللہ کی پہچان ہو تو ضرور انشاء اللہ یہ دونوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

معرفت کا ایک اثر عبدیت و بندگی ہے؟

جب اللہ کی معرفت بندے کو نصیب ہوتی ہے تو بندے پر معرفت کا ایک اثر یہ

ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عبدیت و عجز کا حامل ہوجاتا ہے، اور اسی سے پھر اللہ تعالی کی عبادت کثرت سے کرتا ہے، اس عبدیت وعبادت کے اثر سے پہچانا جائے گا کہ معرفت حاصل ہے یا نہیں، اس لئے کہ ہمارے اور آپ کے لئے نمونہ اور اسوہ آپ ﷺ کی ذات اقدس ہے، آپ اللہ تعالی کے سب سے بڑے عارف تھے، اور سب سے زیادہ عبدیت بھی آپ میں تھی اور عبادت بھی آپ سب سے زیادہ کرنے والے تھے۔ اتنی عبادت کرتے تھے کہ پاؤں میں ورم آجاتا تھا، صحابہ کو ترس آجاتا تھا، پوچھتے یارسول اللہ! آپ تو بخشے بخشائے ہیں، اس قدر عبادت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ فرماتے: ''أفلا اکون عبدا شکورا'' (کیا میں اللہ کا شکر گذار بندہ نہ بنوں) (بخاری: ۱/۱۵۲، مسلم: ۲/۳۷۷)

اسی طرح تمام صحابہ اور اولیاء اللہ نے بھی اللہ کو پہچانا، جس کا اثر ان پر یہ ہوا کہ وہ کثرت سے عبادت انجام دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ معرفت کا ایک اثر عبادت ہے۔ لہذا جو بغیر عبادت کئے معرفت کا دعوی کرے وہ جھوٹا ہے۔

عبادت کیا ہے؟

عبادت کیا ہے؟ عبادت کسے کہتے ہیں ؟ اللہ کا جو بھی حکم بندے کو جہاں بھی آئے، جس وقت بھی آئے اسے انجام دینا عبادت ہے، عبادت دراصل انتہائی خضوع اور انتہائی ذلت کے اختیار کرنے کا نام ہے، اللہ کی بڑائی، اللہ کی جلالت، اللہ کی عظمت کے سامنے بندہ اپنے آپ کو ذلیل کردے تو اس کا نام عبادت ہے، پھر عبادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک قلبی عبادت اور ایک جسمانی عبادت، جسم سے بھی عبادت ہوتی ہے اور قلب سے بھی عبادت ہوتی ہے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے، ہم نماز پڑھتے ہیں، جسم حرکت میں آتا ہے کہ آدمی

ہاتھ اٹھاتا ہے، اللہ کے سامنے عاجزانہ باندھ لیتا ہے اور پھر اللہ کی ستائش کرنے لگتا ہے، پھر اس کے سامنے جھک جاتا ہے، جسے رکوع کہتے ہیں، پھر مزید اور جھکتے ہوئے اس کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتا ہے۔ یہ جو عبادت ہورہی ہے جسم کی عبادت ہے اور پھر ایک عبادت اسی عبادت کے اندر ہے، وہ ہے خشوع اور خضوع اور اخلاص، اب یہ جو اندرونی عبادت ہوتی ہے وہ بھی دراصل اسی کا جز ہے، اور وہ قلبی عبادت ہے، اور دونوں ضروری ہیں۔

اگر ایک آدمی صرف اٹھ رہا ہو، رکوع وسجدہ میں جھک رہا ہو، لیکن قلب کے اندر وہ خشوع نہ ہو، خضوع نہ ہو، اللہ سے محبت نہ ہو، تعلق نہ ہو تو وہ عبادت نہیں، بلکہ صرف اٹھنا اور بیٹھنا ہے۔ جیسے بہت سارے لوگ نماز پڑھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے پہلوانی کررہے ہیں، کسرت کررہے ہیں، اٹھ رہے ہیں، بیٹھ رہے ہیں، جھپٹ رہے ہیں اور تیز تیز رکوع وسجدہ ہورہا ہے، اور آزوبازو کے لوگوں کو ذرا اپنی قوت دکھاتے ہوئے مار بھی رہے ہیں۔ یہ کوئی عبادت ہے؟ عبادت تو عاجزی کا نام ہے، عبادت وہ ہے جس کے اندر انتہائی ذلت اور مسکنت بھری ہوئی ہو۔

ڈینگ مارنے والے معرفت سے خالی

اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اللہ والے کبھی اپنی بڑائی نہیں کرتے، وہ ڈینگیں نہیں مارتے، بلکہ وہ تو عاجزی وانکساری والے ہوتے ہیں۔ کسی شاعر نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ:

تکمیل بشر نہیں ہے سلطاں ہونا
یا صف میں فرشتوں کے نمایاں ہونا
تکمیل بشر ہے عجز وبندگی کا احساس
انسان کی معراج ہے انساں ہونا

آج ایک طبقہ ولایت کا مدعی ایسا پیدا ہوگیا ہے کہ صرف ڈینگیں مارنا اس کا کام ہے، کبھی ولایت کا دعوی، کبھی کرامت کا دعوی، کبھی بزرگی کا دعوی، یہ سب باتیں اولیاء اللہ کی صفات سے دور ہیں۔ وہ عجز و بندگی کو ہی اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی انکساری کا حال

اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی عاجزی و انکساری کا کیا حال تھا؟ ایک بار آپ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص کو لایا گیا اور اس پر اس وقت آپ کے رعب کی وجہ سے کپکپی طاری ہوگئی، آپ نے اس کو دیکھا تو ایک عجیب انکساری و تواضع کا جملہ فرمایا، وہ یہ کہ: ''أنا ابن امرأة من قريش كانت تأكل القديد في هذه البطحاء '' (میں تو قریش کی ایک عورت کا لڑکا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی) اور ایک روایت میں یوں ہے کہ اپنے اوپر آسانی کر، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، ایک عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔ (مستدرک:۱۵۸/۴، ابن ماجہ:۳۳۱۲)

اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے اس عاجزی و انکساری کا! اور یہ درحقیقت اللہ جل شانہ کی عظمت و جلالت کی معرفت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز

اس عاجزی و انکساری پر آپ ﷺ کی ایک دعا کی طرف ذہن منتقل ہوگیا، جس میں آپ نے اللہ تعالی کے سامنے انتہائی و غایت درجہ کی تواضع و انکساری کا مظاہرہ کیا ہے، وہ دعاء یہ ہے:

''اَللّٰهُمَّ إِنَّکَ تَسْمَعُ کَلَامِيْ وَ تَرٰی مَکَانِيْ وَ تَعْلَمُ سِرِّيْ وَ

عَلانِيَتِيْ وَلَا يَخْفٰى عَلَيْکَ شَيْءٌ مِنْ أَمْرِيْ وَ أَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ الْمُسْتَغِيْثُ الْمُسْتَجِيْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِيْ، أَسْئَلُکَ مَسْئَلَةَ الْمِسْكِيْنِ وَ أَبْتَهِلُ إِلَيْکَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِيْلِ وَ أَدْعُوْکَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِيْرِ مَنْ خَضَعَتْ لَکَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَکَ عَيْنَاهُ وَ ذَلَّ جَسَدُهٗ وَ رَغِمَ أَنْفُهٗ لَکَ، اَللّٰهُمَّ لا تَجْعَلْنِيْ بِدُعَائِکَ شَقِيًّا وَّ کُنْ بِيْ رَءُ وْفًا رَّحِيْمًا يَا خَيْرَ الْمَسْئُوْلِيْنَ وَ يَا خَيْرَ الْمُعْطِيْنَ " (اے اللہ! بلا شبہ تو میری بات سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے، اور میری پوشیدہ وظاہر ہر قسم کی بات کو جانتا ہے، اور تجھ پر میری کوئی بات مخفی نہیں، اور میں مصیبت زدہ ہوں، فقیر ہوں، فریادی ہوں ، پناہ جو ہوں، ترساں و ہراساں ہوں ، اپنے گناہوں کا معترف و اقراری مجرم ہوں، میں تجھ سے مسکین کی طرح سوال کرتا ہوں ، اور تیرے سامنے ذلیل گناہ گار کی طرح گڑگڑاتا ہوں، اور تجھ سے خوف زدہ آفت رسیدہ کی طرح مانگتا ہوں، جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو، اور جس کے آنسو بہہ رہے ہوں، اور جس کا جسم تیرے سامنے عاجز ہو، اور جو تیرے سامنے اپنی ناک رگڑتا ہو، اے اللہ! تو مجھے دعا میں ناکام نہ فرما، اور مجھ پر تو رحیم وکریم ہوجا، اے سوال کئے جانے والوں میں سب سے بہتر اور اے عطا کرنے والوں میں سب سے بہتر) (المعجم الکبیر طبرانی: ۱۱/۱۷۴، المعجم الصغیر: ۱۵/۲)

اس دعا کا ایک ایک لفظ جس فروتنی وعاجزی ومسکنت وتواضع وانکساری کا حامل ہے وہ بہت ہی واضح و ظاہر ہے ۔ الغرض یہ عجز و انکساری بھی معرفت خداوندی کا ایک اثر ہے۔

اللہ کی معرفت کا ایک اثر توکل علی اللہ ہے

جب بندے کو اللہ کی پہچان ہوتی ہے تو پہچان کے نتیجہ میں وہ اللہ پر اعتماد ضرور کرے گا ، اللہ پر بھروسہ ضرور کرے گا، جن لوگوں کو اللہ پر بھروسہ نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کو خدا کی پہچان نہیں ہے ۔ کیسے؟ اس لیے کہ جب وہ اللہ کو پہچانے گا تو اللہ کی صفات کی حقیقت سامنے آئے گی کہ میرا اللہ وہ اللہ ہے جو میرے لیے ہر چیز میں بھلائی چاہتا ہے، میرے لیے کوئی مصیبت نہیں چاہتا، میرے لیے کوئی پریشانی نہیں چاہتا، میرے لیے اچھائی اور بھلائی ہی چاہتا ہے ، برائی نہیں چاہتا، جو کچھ بھی وہ کرتا ہے ہماری بھلائی کے لئے کرتا ہے۔ تو جب وہ کھلے طور پر یہ دیکھتا ہے تو اس کا دل کہتا ہے کہ اس کے اوپر مجھے کلی اعتماد کرنا ہے کہ جو کرتا ہے صحیح کرتا ہے۔

حضرت علی کا ایمان افروز واقعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک ایمان افروز ارشاد و واقعہ ملاحظہ کیجئے، وہ یہ کہ مسافر بن عوف بن الاحمر نے ایک بار جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اہل نھروان سے جہاد کے لئے نکلنا چاہتے تھے، کہا کہ آپ اس وقت نہ جائیں اور دن کے تین گھنٹے گزرنے کے بعد جائیں ، حضرت علی نے پوچھا کہ کیوں؟ اس نے کہا کہ کیونکہ آپ اس گھڑی میں جائیں گے تو آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو بلاء و شدید نقصان پہنچے گا، اور اگر اس وقت میں جائیں جو میں نے بتایا ہے تو آپ کو کامیابی و غلبہ نصیب ہوگا۔ حضرت علی نے فرمایا کہ حضرت محمد ﷺ کا کوئی نجومی نہیں تھا اور نہ اب تک ہمارا کوئی نجومی ہے، کیا تو جانتا ہے کہ اس تیرے گھوڑے کے پیٹ میں کیا

ہے؟اس نے کہا کہ ہاں اگر میں حساب لگاؤں تو جان لوں گا،آپ نے کہا کہ جس نے تیری اس بات کی تصدیق کی اس نے قرآن کی تکذیب کی، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو یہ کہتے ہیں کہ ﴿إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ﴾ (اللہ ہی پاس قیامت کا علم ہے وہی بارش نازل کرتا ہےاور وہی جانتا ہے کہ ماں کے رحم میں کیا ہے) حضرت محمد ﷺ نے کبھی اس چیز کے جاننے کا دعویٰ نہیں کیا جس کا تو نے دعوی کیا ہے، کیا تو گمان کرتا ہےتو اس گھڑی ووقت کو جانتا ہے جس میں سفر کرنے سے کوئی برائی لاحق ہوگی؟ اس نے کہا کہ ہاں! آپ نے فرمایا کہ جس نے تیری اس بات کی تصدیق کی وہ گویا برائی کے پہنچانے کے بارے میں اللہ سے مستغنی ہوگیا اور اس کو مناسب ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر تجھے ہی اپنے معاملہ کا متولی بنادے، کیونکہ تو گمان کرتا ہے کہ تو اس کو اس گھڑی کی جانب ہدایت کرسکتا ہے جس میں سفر کرنے سے وہ برائی سے نجات پا جائے گا، پس جس نے اس بات کو سچ سمجھا مجھے اس پر اندیشہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرنے والے کی طرح ہے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ اے اللہ! کوئی فال نہیں ہے مگر تیرا فال اور کوئی خیر نہیں ہے مگر تیرا خیر، پھر اس شخص سے فرمایا کہ ہم تیری تکذیب ومخالفت کرتے ہیں اور اسی گھڑی میں سفر کرتے ہیں جس سے تو نے روکا ہے، پھر آپ نے لوگوں کو دیکھ کر فرمایا کہ اے لوگو! تم علم نجوم سے بچو، مگر وہ جس سے خشکی وسمندر کی اندھیریوں میں راستہ پاسکو، نجومی تو کافر ہے اور کافر جہنمی ہے۔ پھر اس شخص سے کہا کہ اللہ کی قسم! اگر مجھے یہ بات پہنچی کہ تو علم نجوم میں غور وفکر کرتا اور اس پر عمل کرتا ہے تو میں تجھے تیرے یا میرے رہنے تک حبس دوام میں رکھ دوں گا اور جتنا میرے بس میں ہے

اس قدر تجھ کو بخشش سے محروم کردوں گا۔

اس کے بعد آپ اسی وقت میں سفر پر نکلے جس میں نکلنے سے اس نے منع کیا تھا، اور اہل نھر وان کے پاس آئے اور ان کو قتل کیا، پھر فرمایا کہ اگر ہم اُس وقت میں چلتے جس میں چلنے کا اس شخص نے حکم دیا تھا اور فتح وغلبہ پاتے تو کوئی کہنے والا یہ کہتا کہ یہ اسی وقت میں چلے تھے جس میں چلنے کا نجومی نے حکم دیا تھا۔ حضرت محمد ﷺ کا کوئی نجومی نہیں تھا اور نہ اب تک ہمارا کوئی نجومی ہے، مگر اللہ نے ہمارے لئے کسریٰ اور قیصر کے شہروں اور دیگر ممالک کو فتح کرادیا، پس تم اللہ پر توکل کرو اور اسی پر اعتماد کرو، کہ وہی اپنے ماسوا سے ہمارے لئے کافی ہے۔ (مسند الحارث: ۲/۶۰۱، کنز العمال: ۵/۲۳۵)

یہ ہے توکل علی اللہ، جو انسان کو معرفت خداوندی کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، جس سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرا پروردگار میرا کارساز حقیقی ہے، مجھے کسی فکر کی ضرورت نہیں۔

ایک شعر اور حضرت تھانوی کی اس میں اصلاح

یہاں مجھے ایک شاعر کا شعر یاد آ گیا، وہ کہتا ہے کہ:

کارساز ما بفکر کار ما فکر ما در کار ما آزار ما

(ہمارا کارساز حقیقی ہمارے کاموں کی فکر میں لگا ہوا ہے، لہٰذا ہمارے کاموں میں ہمارا فکر کرنا خود کو تکلیف پہنچانا ہے)

اس شعر میں شاعر نے اللہ کے لئے فکر کا لفظ استعمال کیا ہے، حالانکہ اللہ کو کسی فکر کی ضرورت نہیں، اس لئے حضرت حکیم الامت تھانوی نے فرمایا کہ یہ شاعر جاہل

ہے عارف نہیں، اس لئے اسے یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ اللہ کے لئے کیا لفظ استعمال کرنا چاہئے، اور کیا نہ کرنا چاہئے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو کسی کے کام بنانے کے لئے فکر کی ضرورت پڑتی ہے؟ نہیں، لہذا حضرت تھانوی نے فرمایا کہ میں اس شعر میں ذرا ترمیم کرتا ہوں، وہ ترمیم یہ ہے کہ:

کارساز مابساز کار ما　　فکر ما در کار ما آزار ما

اب کیا مطلب ہوا؟ یہ مطلب ہوا کہ ہمارا کارساز حقیقی ہمارے کاموں کے بنانے میں لگا ہوا ہے، لہذا ہمارا خود کے کاموں کی فکر میں لگنا خود کو تکلیف دینا ہے۔

دیکھئے کہ حضرت تھانوی نے کس طرح ذرا سی تبدیلی سے اس شعر کو صحیح کر دیا اور اس کے مضمون کو اسلامی عقیدے سے ہم آہنگ کر دیا۔ الغرض معرفت کا یہ اثر ہے کہ اللہ پر اعتماد و توکل پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے، جو بھی کام کرے، سب عین حکمت و مصلحت ہے۔

اللہ ہر کام وقت پر کرتا ہے، ایک بزرگ کا واقعہ

ایک قصہ یاد آگیا کہ ایک بزرگ جا رہے تھے، بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی، یہ بڑی پریشانی کے ساتھ چل رہے تھے، اچانک بارش ہونے لگی، ٹھنڈے ٹھنڈے بارش کے قطرات جب ان کے جسم پر پڑے تو ان کی زبان پر بے ساختہ و بے اختیار ایک جملہ آگیا، انہوں نے کہا کہ واہ! آج کیا وقت پر بارش ہوئی! اس پر فوراً اللہ کی طرف سے الہام ہوا، اور عتاب نازل ہوا کہ او بے ادب! کیا ہم نے کبھی بے وقت بھی بارش برسائی ہے؟ جو بھی کرتے ہیں وقت پر ہی تو کرتے ہیں، تجھے پیدا کیا تو وقت پر کیا، تجھے ماریں گے تو وقت پر ماریں گے، تجھے بخار دی تو وقت پر دیا، تجھے

صحت دی تو وقت پر دیا۔ کیا مطلب ہوا؟ کہ اللہ تعالی پر جب اعتماد ہو کہ وہ سب کام حکمت و مصلحت کے مطابق کرتے ہیں تو اللہ پر توکل و اعتماد کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔

معرفت کا ایک اثر رضا بالقضاء

اور اسی توکل و اعتماد سے ایک اور اثر معرفت کا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عارف باللہ، اللہ تعالی کے ہر فیصلہ پر راضی رہتا ہے۔ اس کو اسلام میں رضا بالقضاء کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک اہم اثر و علامت ہے معرفت الہیہ کا، اس کے بغیر تو ایمان بھی مکمل نہیں ہوتا، لہذا ضروری ہے کہ اللہ کے ہر فیصلہ پر مومن راضی رہے اور راضی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ دل اللہ کے ہر فیصلہ پر مطمئن رہے کہ جو بھی اس نے کیا صحیح و درست کیا اور ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعاؤں میں بھی اللہ سے اس کا سوال کیا ہے۔ آپ نے ایک دعا میں فرمایا کہ: '' **أللّٰهُم إني أَسئلك الرَّضا بالقضاء** '' (اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں رضا بالقضاء) (سنن النسائی: ۱۳۰۶، السنن الکبری نسائی: ۳،۴۰، کنز العمال: ۳۶۱۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اللہ پر اس کے فیصلوں میں اعتراض کرتے ہیں وہ درحقیقت معرفت الہیہ سے دور ہیں، اگر اللہ کی معرفت ان کو نصیب ہوتی اور وہ اللہ کی اس صفت سے واقف ہوتے کہ وہ حکیم ہے تو اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اللہ بہترین مربی ہیں

جبکہ قرآن میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کاملہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ قرآن پاک کے شروع ہی میں ربوبیت کا ذکر ہے: ﴿ **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ**

رَبِّ الْعَالَمِیْن﴾ (تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جو تمام عالموں کا پروردگار ہے، رب ہے) رب کے کیا معنی آتے ہیں؟ تربیت کرنے والا، ماں تربیت کرتی ہے، باپ تربیت کرتا ہے، استاذ اور پیرو شیخ بھی تربیت کرتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تربیت بھی مجازی ہے اور ان کو مربی کہنا بھی مجازی اعتبار سے ہے ورنہ حقیقی مربی تو اللہ جل جلالہ وعم نوالہ ہیں، جو ساری کائنات کے ذرے ذرے کی تربیت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو کبھی مختلف قسم کی نعمتیں دے کر اور کبھی ان نعمتوں کو چھین کر اور کبھی بیماری دے کر اور کبھی اس کی جگہ شفا دے کر ان کی تربیت کرتا ہے، حوادثات، پریشانیاں، مصائب، اور مختلف قسم کے جھنجھوڑ کر رکھ دینے والے حالات و واقعات، یہ سب کچھ پیش آتے رہتے ہیں، یہ ساری کی ساری چیزیں دراصل اللہ کی ربوبیت و تربیت کے نتیجہ میں پیش آتی رہتی ہیں۔

بعض وقت بعض بیماریاں آجاتی ہیں تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ مریض کو کھانا بالکل نہ دیا جائے، تو کیا آپ یہ حکم لگا دیں گے کہ ڈاکٹر صاحب بڑے ظالم ہیں؟ ڈاکٹر کو ظالم کہتے ہیں یا رحیم کہتے ہیں؟ بلکہ سب رحیم ہی کہتے ہیں۔ بھائیو! کیوں؟ اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بات جو ڈاکٹر صاحب نے کہی یہ ان کے علم طب کا تقاضا ہے، اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کبھی ہمارا کھانا بند کر دیتا ہے، فقر و فاقہ میں مبتلا کر دیتا ہے، کبھی کسی اور بیماری و پریشانی میں مبتلا کر دیتا ہے تو ہم اللہ کو کیوں رحیم نہ کہیں۔

ہم نہیں جانتے کہ ہمارے لئے کس میں بھلائی ہے، مگر اللہ جانتے ہیں کہ ہمارے لئے کیا مفید ہے، کیا غیر مفید ہے، اللہ ہی مصلحتوں کو جاننے والے ہیں، وہ حکیم ہیں، ان کا ہر کام کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے، کبھی وہ ہمیں دنیوی پریشانی دیکر

ہماری آخرت بنانا چاہتے ہیں ۔جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا: "ما يصيبُ المسلمُ من نصب ولا وصب ولا هم ولا حزن ولا أذى ولا غم حتى الشوكة يشاكها إلا كفر الله بها من خطاياه"(مسلمان کوکوئی کانٹا لگے بیماری ہو جائے ، یا کوئی پریشانی پہنچے، یا کوئی غم ، یا کوئی تکلیف واذیت حتی کہ کوئی کانٹا چبھےتو اللہ اس سے اس کی خطاؤں کا کفارہ کر دیتے ہیں)

(صحیح بخاری:۵۳۱۸،صحیح ابن حبان:۲۹۰۵،الادب المفرد: حدیث:۴۹۲)

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اس سے ایک نیکی بھی لکھی جاتی ہے ۔(مسلم: ۶۷۳۲،مسند احمد:۱۶۶۰۹)

یعنی تمہیں ایک کانٹا چبھتا ہے تو تمہارا ایک گناہ مٹایا جاتا ہے اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے، ٹھوکر لگتی ہے، ایک گناہ مٹایا جاتا ہے اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے ۔غرض جوبھی تکلیف دہ بات پیش آئے ، اس پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے ،اور ایک ایک گناہ مٹایا جاتا ہے۔

ایک دوسری حدیث پاک میں آتا ہے، اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا کہ ایک رات کا بخار ایک سال کے گناہوں کو دھو دیتا ہے۔(مسند قضاعی:۶۱)

غور کریں کہ جسے ہم تکلیف سمجھتے ہیں، اس میں دراصل ہماری آخرت بن رہی ہے، کتنی بڑی نعمت ہے، اس لئے ہمیں چاہئے کہ اللہ کے ہر فیصلہ پر راضی رہیں، اسی کا نام رضا بالقضا ہے جو بہت بڑی دولت ہے ،جس پر حدیث میں بڑی فضیلت بھی آئی ہے۔چنانچہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشادفرمایا:

ذَاقَ طعْمَ الايْمان مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِياً وَرَسُوْلاً "(وہ آدمی ایمان کا مزا چکھ لیا جواللہ سے رب ہونے کی حیثیت سے

راضی ہوگیا، اور اسلام سے دین ہونے کی حیثیت سے راضی ہوگیا اور محمد ﷺ سے نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے راضی ہوگیا) (مسلم: ۱/۴۷)

معلوم ہوا کہ معرفت کا ایک اثر رضا بالقضاء بھی ہے۔ یہ سارے آثار جس بندے پر ظاہر ہوں سمجھا جائے گا کہ اس کو اللہ کی معرفت حاصل ہے۔

اب دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم تمام لوگوں کو اپنی معرفت کا ایک حصہ عطا فرمائیں اور اس کے ذریعہ محبت الٰہی اور خوف الٰہی وغیرہ آثار معرفت کی دولت سے بھی مالا مال فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

شیطانی حرب

باسمہ تعالیٰ

شیطانی حربے

أعوذ باللّٰه من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰه الرحمن الرحیم

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ، ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ (آل عمران:۱۴)

(خوشنما بنادی گئی ہے لوگوں کے لئے خواہشوں کی محبت یعنی عورتیں اور بیٹے، اور بڑے بھاری مال سونے کے اور چاندی کے، اور نشان لگائے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتیاں، یہ دنیا والی زندگی کا فائدہ اٹھانا ہے، اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانہ)

حضرات! ایک آیت آپ کے سامنے تلاوت کی گئی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حب الشہوات ''یعنی دنیا کی جولذتیں اور خواہشیں اور انسان کے دل کو اپیل کرنے والی چیزیں ہیں، یہ انسان کے لیے مزین کردی گئی ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ''حب الشہوات'' کی تفسیر بیان کی کہ حب الشہوات سے مراد یہ دنیا کی مختلف چیزیں یعنی بیویاں ہیں، بچے ہیں، مال ہے، دولت ہے، سونا ہے، چاندی ہے، پیسہ ہے، یہ ساری چیزیں دنیا کی چیزیں ہیں۔ اللہ نے ان کا لقب رکھا ہے: ''الشہوات''،

اور فرمایا کہ ان خواہشات کی محبت انسان کے لیے مزین کردی گئی ہے۔

لفظ ''زُيِّنَ'' استعمال کیوں فرمایا؟

یہاں ''زُيِّنَ'' کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ حقیقت میں دنیا کی یہ چیزیں ایسی نہیں ہے، جیسی نظر آتی ہیں، اگر حقیقت میں بھی ایسی ہوتیں تو پھر لفظ مزین لانے کی کوئی ضرورت ہی نہ ہوتی، کیونکہ جو چیز ہو کالی، اسے آپ کچھ رنگ روغن مسالہ لگا کر بنا دیں گوری، تب کہا جائے گا کہ مزین کردیا گیا ہے، آج کل لوگ ملمع سازی کرتے ہیں، کوٹنگ کرتے ہیں، بہت ساری چیزوں کی کوٹنگ ہوتی ہے، لوہے کی کوٹنگ کی اور سونے کا پانی اس پر چڑھا دیا، دیکھنے میں ایسا لگ رہا ہے، جیسا کہ سونا ہوتا ہے، آج کل عورتوں کے زیورات بھی ایسے آنے لگے ہیں۔ آپ دیکھیں تو ایسے معلوم ہوں جیسے کہ یہ واقعی سونا ہیں، لیکن حقیقت میں یہ سونا نہیں ہے، بلکہ سوجانا ہے، کوئی طاقت نہیں ہے اس کے اندر، لیکن دیکھنے میں بالکل ایسا ہی لگے گا جیسے کہ سونا ہو، اسی طرح مختلف چیزوں پر رنگ وروغن مسالہ لگا کر اس کو مزین کردیا جاتا ہے، ملمع سازی کرنے کے بعد دیکھنے میں چیزیں اچھی لگتی ہیں، حالانکہ حقیقت میں یہ چیزیں کچھ اور ہوتی ہیں۔

اسی طرح دنیا کی جو چیزیں آپ کو نظر آتی ہیں، چاہے وہ عورتیں ہوں، چاہے تمہاری اولاد ہو، چاہے مال ہو، دولت ہو، سونا ہو، چاندی ہو، یہ سب کی سب چیزیں جو تم کو بہت بھلی اور اچھی لگتی ہیں، پیاری لگتی ہیں، یہ دراصل سب کوٹنگ کی ہوئی چیزیں ہیں، مزین کردی گئی ہیں، ان کی اصلیت وہ نہیں ہے جو نظر آرہی ہے۔ اس جانب توجہ دلانے اور اشارہ کرنے کے لئے یہاں لفظ ''مزین'' لایا گیا۔

اگر ان چیزوں کی حقیقت انسان کے سامنے کھل جائے تو خدا کی قسم وہ اِن

چیزوں کو دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے۔وہ کہے گا کہ یہ چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں؟ دیکھنے کے بھی قابل نہیں ہیں،لیکن اس کے باوجود انسان چوں کہ مزین کردہ چیزوں سے متاثر ہوجاتا ہے، اس لیے ان چیزوں کے اوپر فریفتہ ہوتا رہتا ہے۔ سونا دیکھا منہ میں پانی آ گیا، چاندی دیکھا رال ٹپکنے لگی ،روپیہ اور پیسہ سامنے آیا، دل اس کے اوپر ریجھنے لگا ،اور مختلف قسم کی چیزیں دیکھیں ،دل ان کے اوپر آ گیا۔ لیکن حقیقت میں یہ چیزیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے دل لگایا جائے اور ان پر فریفتہ ہوا جائے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ دنیا کی چیزیں انسان کے لیے مزین کردی گئی ہیں۔آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے خود ہی فرمادیا ہے: ﴿ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ (یہ تو دنیا کی چیزیں ہیں، دنیا کا ساز وسامان ہے) اور اصل چیز وہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس میں رکھی ہوئی ہے جو حقیقت کے اعتبار سے بھی اچھی ہے اور بھلی ہے یہاں تو جو کچھ بھی نظر آتا ہے، یہ صرف دیکھنے میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے سامنے بھی دنیا کو مزین کر کے پیش کیا گیا تھا

حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب معراج تشریف لے گئے تو اس موقعہ پر ایک واقعہ پیش آیا کہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے ایک عورت آئی اور مزین تھی،اپنے آپ کو اس نے آراستہ پیراستہ کیا تھا،زیورات کے ساتھ اور مختلف زیب وزینت کی چیزوں کے ساتھ، نبی اکرم ﷺ کی طرف بڑھتی ہوئی آئی ،اللہ کے نبی علیہ السلام نے چہرہ پھیرلیا، پھر دوبارہ بھی آئی،اللہ کے نبی علیہ السلام نے پھر چہرہ پھیرلیا،تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا۔جبرئیل امین علیہ السلام نے آگے بڑھنے کے بعد نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا، یارسول اللہ! آپ نے پہچانا کہ یہ عورت کون تھی؟ آپ

نے فرمایا کہ نہیں میں نے نہیں پہچانا، کون تھی یہ عورت؟ جبرئیل امین علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ عورت نہیں بلکہ دراصل دنیا تھی، اور یہ بوڑھی ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو آراستہ پیراستہ، مزین کر کے آپ کو بہکانے کے لیے آئی تھی۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس کی طرف نظر بھی نہیں فرمائی، اگر آپ خدانخواستہ اس عورت کو دیکھ لیتے تو آپ کی پوری امت ہلاک ہو جاتی۔ (تفسیر ابن کثیر: ۵/۳)

اس ناپاک دنیا کو اللہ کے نبی علیہ السلام نے دیکھا نہیں اور امت کا یہ حال ہے کہ وہ اس میں ملوث ہے۔ اور اگر اللہ کے نبی دیکھ لیتے تو پھر کیا ہوتا؟ اس سے اندازہ کیجئے کہ آج ہم لوگوں کے اندر کتنا قصور اور فتور پیدا ہو گیا ہے اور ایمانی اعتبار سے کس قدر کمزوری آ گئی ہے کہ ہمارے نبی علیہ السلام نے جس کو دیکھا تک نہیں، آج ہم اسی کے اندر پوری طرح ملوث ہو گئے ہیں، اسی مال کے لیے، پیسے کے لیے، اسی دنیا کے لیے، زیب و زینت کی چیزوں کے لیے، انسان اپنا سب کچھ خرچ کر دیتا ہے، اپنی جوانی لگا دیتا ہے، اپنی ساری طاقت گنوا دیتا ہے، اپنی آنکھوں کی طاقت، کانوں کی طاقت، دل کی طاقت، دماغ کی طاقت، سب اسی کے پیچھے لگایا ہوا ہے، بس ہر وقت اسی فکر میں ہے کہ کس طرح کماؤں، کس طرح جمع کروں، کس طرح کھاؤں، کس طرح گنواؤں؟ پھر اسی اُدھیڑ بن میں پوری زندگی گزر جاتی ہے، جب کہ یہ دنیا اس قابل تھی کہ اللہ کے نبی علیہ السلام نے جس طرح اس کے ساتھ برتاؤ کیا ہمیں بھی اسی طرح برتاؤ کرنا چاہئے تھا کہ ہم اس کی طرف نہ دیکھتے، منہ پھیر لیتے، لیکن اس کے تزین و ملمع کاری نے ہم لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے، اس لیے انسان دنیا کی چیزوں کی طرف لپکتا چلا جاتا ہے۔

’’ زُیِّنَ ‘‘ صیغۂ مجہول لانے کی عجیب حکمت

یہاں ایک اور بات سنتے چلئے، وہ یہ کہ اس آیت کریمہ میں ’’زُیِّنَ‘‘ کا جولفظ آیا ہے، عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ مجہول کا صیغہ ہے، مجہول میں اصل فعل مجہول نہیں ہوتا، بلکہ فاعل مجہول یعنی نا معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر تو کہتے ہیں فعل مجہول، حقیقت میں وہ فاعل مجہول ہے۔ فعل تو نظر آرہا ہے، معلوم ہورہا ہے، وہ مجہول کہاں ہے؟ وہ فعل تو یہاں بھی معلوم ہوگیا کہ وہ ’’تزین وملمع کاری‘‘ ہے، تزئین ہے، زیب وزینت ہے۔ یہ تو خود ہی پتہ چل رہا ہے، جس چیز کا پتہ ہو وہ مجہول کہاں ہے وہ تو معروف ہے، ہاں یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ مزین کرنے والا کون ہے، اس کو مجہول رکھا گیا ہے۔ کیوں؟

اس کو سمجھنے سے پہلے ایک بات سمجھ لیں کہ قرآن کریم میں ’’تزئین کاری‘‘ کا ذکر اور جگہ بھی آیا ہے، اور بعض جگہ اس کا فاعل بھی بتایا گیا ہے، نیکی کے سلسلہ میں اللہ تبارک وتعالی کو فاعل بتایا ہے، جیسے فرمایا کہ: ﴿ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ﴾ (اور لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک محبوب بنایا اور اس کو تمہارے قلوب میں مزین کردیا) اور برائی کے موقعہ پر شیطان کو اس کا فاعل کہا ہے، جیسے فرمایا کہ: ’’وإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ ‘‘ (اور یاد کرو جبکہ شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کے لئے مزین کیا)

مگر یہاں اس آیت میں اللہ تعالی تزئین کاری کے فاعل کو مجہول کے صیغہ میں چھپا دیا، کیوں؟ اس کی وجہ بندے کے نزدیک یہ معلوم ہوتی ہے کہ دنیا اور دنیا کی چیزیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، یہ مطلقا نہ بری ہیں نہ مطلقا اچھی، بلکہ اگر ان کو خدا کے حکم ورسول کی تعلیم کے مطابق استعمال کیا جائے تو اچھی ہیں اور یہی چیزیں

آخرت کا وسیلہ بن جاتی ہیں، اور اگر ان چیزوں کا خدا کے حکم اور رسول کی تعلیم کے مطابق استعمال کیا جائے تو یہ بری اور وبال جان بن جاتی ہیں۔ لہذا ان چیزوں میں ایک پہلو بھلائی کا ہے، لہذا اس پہلو سے ان چیزوں کا مزین ہونا اللہ کی جانب منسوب ہوگا اور ایک پہلو ان میں برائی کا ہے، اور اس لحاظ سے ان کا مزین ہونا شیطان کی جانب منسوب ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالی نے اس کام کے فاعل کو مجہول کردیا، تاکہ دونوں پہلو کی جانب اشارہ ہوسکے۔

اس تقریر سے ایک بہت بڑی حقیقت سامنے آگئی، وہ یہ کہ دنیا فی نفسہ نہ اچھی ہے نہ بری، بلکہ اگر اللہ کے حکم کے مطابق استعمال ہو تو اچھی ہے ورنہ بری ہے۔ ہاں عام طور پر چونکہ اس کا استعمال لوگ غلط طور پر کرتے ہیں، اور اس کے ذریعہ شیطان بہکاتا ہے اس لئے اس کو برا کہا جاتا ہے۔

عورت شیطان کا ایک حربہ

بہرحال اب اس پر غور کیجئے کہ اللہ تعالی نے یہاں آیت کریمہ میں ''شہوات'' کی تفسیر میں جو چیزیں بیان کی ہیں ان میں سے ایک ''عورتیں'' ہیں، جن کو شیطان ملمع کاری کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ شیطان گمراہ کرنے کے لیے عورت کو اپنا ایجنٹ بناتا ہے۔ ایک بزرگ حسن بن صالح فرماتے ہیں کہ میں نے شیطان کو سنا کہ وہ عورت سے کہہ رہا تھا کہ:

'' أنتِ نصف جندي، أنتِ سهمي الذي أرمي به فلا أخطأ و أنتِ موضع سري ، و أنتِ رسولي في حاجتي'' (تو میری آدھی فوج ہے، اور تو میرا وہ تیر ہے جس سے میں شکار کرتا ہوں، میں خطا نہیں کرتا اور تو میری راز دار اور حاجت کے وقت میری قاصد ہے) (مکائد الشیطان، ابن ابی الدنیا: ۵۹)

اورحدیث میں بھی یہ مضمون موجود ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: النساء حبائل الشیطان"(عورتیں شیطان کا شکار کا آلہ ہیں)(جامع الاصول: حدیث:۸۴۸۰)

عورت کے ذریعہ شیطان انسان کو پھانسنے کی، گمراہی میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بہت حد تک کامیاب ہو جاتا ہے، بڑے بڑے لوگ پھنس جاتے ہیں، کبھی ایمان کھودیتے ہیں، صرف لذت کی وجہ سے، خواہش کی وجہ سے، اور یہ چیز انسان کو کبھی اندھا بنادیتی ہے، کبھی بہرہ بنادیتی ہے، کبھی گونگا بنادیتی ہے۔ جیسے حدیث میں ہے کہ: "حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِيْ وَيُصِمُّ "(کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا و بہرا بنادیتی ہے)(شعب الایمان:۳۶۸/۱)

اس لئے انسان بے سوچے سمجھے، اندھا بہرا ہو کر عورت پر فریفتہ ہو جاتا ہے، اس کو خود بھی اس کا عیب نظر نہیں آتا اور دوسرے اس کو سمجھائیں بتائیں تو وہ بہرا بن جاتا ہے۔

دنیا کی عورتوں اور جنت کی حوروں کا فرق

دنیا کی عورتوں کو شیطان ملمع کاری کے ذریعہ حسین دکھاتا ہے، جبکہ انسان کو غور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ دنیا کی عورت میں کس قدر کھوٹ وعیب ہے۔ قرآن کریم نے اسی لئے دنیا کی عورتوں کے مقابلہ میں جنت کی حوروں کا تذکرہ کرکے ان کے فرق کو بتایا ہے۔ تاکہ شیطان کی ملمع سازی اور تزیین کاری کو پہچانا جائے۔

اس سلسلہ میں غور وفکر کے لئے قرآن کریم میں بعض جگہ اشارات دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے بعض جگہ جنت کے ذکر میں فرمایا:

﴿لَهُمۡ فِيهَا أَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾[البقرۃ:۲۵،النساء:۵۷]

یعنی جنت میں جنتیوں کو جو بیویاں حوریں ملیں گی وہ مطہر یعنی پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ پاکیزہ بیویاں، جن کے اندر نجاست نہیں، گندگی کا نام ونشان نہیں، بالکل پاک وصاف۔

یہ طہارت دو قسم کی ہے۔ایک ظاہری طہارت اور ایک باطنی طہارت۔ظاہری طہارت کیا؟ پاخانہ نہیں ہوگا، پیشاب ان سے نہیں نکلے گا، پسینہ نہیں نکلے گا، اسی طرح اور جو مختلف قسم کے فضلات انسان کے جسم سے نکلتے ہیں جو کبھی نفرت کا باعث بنتے ہیں، ان ساری چیزوں سے جنت کی حوریں پاک ہوں گی اور باطنی اعتبار سے مطہرہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دل کے اعتبار سے بھی بہت پاکیزہ ہوں گی، اخلاق کے اعتبار سے بھی بہت پاکیزہ ہوں گی، ان کے اندر کوئی عیب نہ ہوگا۔ یہ اس کا مطلب ہے۔

سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اتنا بھی فرما دیے ہوتے: ﴿فِيهَا أَزۡوَاجٌ﴾ (جنت میں بیویاں ملیں گی) تو بات کافی ہوجاتی لیکن ''مطہرۃ'' کہہ کر بتانا یہ چاہتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے غور کرو کہ دنیا کی عورتوں کا کیا حال ہے؟ آدمی عورت کو بہت پسند کرتا ہے، حالانکہ اسے پاخانہ بھی لگتا ہے؟ اس سے پیشاب بھی نکلتا ہے، ماہواری خون بھی جاری ہوتا ہے، اور گندگیاں بھی ہوتی ہیں، اور غسل نہ کرے تو بدن کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے، منہ اگر نہ دھوئے تو منہ کے اندر بدبو پیدا ہوجاتی ہے، گویا ساری گندگیوں کا مرکز اور معدن بن جاتی ہے۔ یہ ہے دنیا کی عورت کا حال جس پر تم فریفتہ ہوتے ہو۔

اور رہی اخلاق اور کردار کے اعتبار سے تو وہ معلوم ہی ہے، اسے تو کہنے کی

ضرورت ہی نہیں ہے کہ یہاں کی عورتوں کا کیا حال ہوتا ہے، بداخلاقی ، بدزبانی ، ناشکری، ان کے اندر عیوب ہی عیوب ہوتے ہیں۔

تو دیکھئے بظاہر عورت دیکھنے میں اچھی لگتی ہے، انسان اس کی طرف مائل ہوجاتا ہے، لیکن یہ ملمع سازی ہے، تزئین کاری ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے عورت ساری گندگیوں کا مرکز اور معدن ہے۔

شیطان کا دوسرا حربہ اولاد

اس آیت میں دوسری چیز جو''شہوات'' کی تفسیر میں آئی ہے وہ ہے: ''البنین'' یعنی اولاد، جس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اولاد کو مزین کر کے ماں باپ کو دکھاتا ہے اور وہ ان کی محبت میں اس طرح گرفتار ہوجاتے ہیں کہ اندے بہرے بن جاتے ہیں۔اور کبھی حلال وحرام کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں اور کبھی احکام شریعت سے لاپرواہی برتتے ہیں ۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اولاد کی وجہ سے آدمی جہنم میں جا گرتا ہے۔اسی لئے قرآن نے اولاد کو بھی مال کی طرح ایک فتنہ قرار دیا ہے ۔فرمایا کہ: " **وَاعۡلَمُوۡا أَنَّمَا أَمۡوَالُكُمۡ وَأَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ** "[الانفال: ۲۸](جان لو کہ تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں)اور علامہ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ فتنہ کے اصل معنی تو امتحان وآزمائش کے ہیں، لیکن عرف میں امتحان کے برے نتیجہ کو فتنہ کہتے ہیں۔(الاکمال المعلم :۱/۲۹۸)

لہذا اولاد کے سلسلہ میں انسان اللہ کی آزمائش میں عموما برا نتیجہ لاتا ہے یعنی ناکام ہوجاتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:" **الۡوَلَدُ مَجۡبَنَةٌ مَبۡخَلَةٌ مَجۡهَلَةٌ**''(اولاد انسان کو بزدل، بخیل اور جاہل بناتی ہے)(اتحاف الخیرۃ:۶۷۶۳، مصنف عبدالرزاق:۲۰۱۴۳)

اور ایک روایت میں " مَحْزَنَةٌ "(غم میں ڈالنے والی) کا اضافہ ہے۔اس حدیث کی شرح میں علامہ مناوی نے لکھا ہے کہ: بخیل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی وجہ سے ماں باپ نیکی وقرب کے کاموں میں خرچ کرنے سے سے کنجوسی کرتے ہیں اور بزدل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی محبت میں باپ جہاد میں جانے اور اللہ کے لئے ہجرت کرنے سے باز رہتا ہے،اور جاہل بناتی ہے کیونکہ اولاد کی محبت اور اس کے لئے نان نفقہ کی فکر اس کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے سفر سے روکتی ہے،اور وہ جاہل ہی رہ جاتا ہے،اور غم میں ڈالنے والی ہے کیونکہ اولاد کبھی بیمار ہو یا کوئی اور چیز کا مطالبہ کرے جس کو والدین پورا نہ کرسکیں تو وہ اس کی وجہ سے غمگین ہوتے ہیں۔(التیسیر: ۶۱۵/۱،فیض القدیر:۲۶۲/۶)

بہ ہرحال یہ اولاد کا فتنہ بھی بڑا سخت وشدید فتنہ ہوتا ہے،مگر کب؟ اس وقت جب انسان اولاد کی محبت میں اندھا بہرا ہوجاتا ہے۔اس صورت میں یہ اولاد شیطان کا ایک حربہ ہے،جس سے وہ لوگوں کو مات دیتا ہے۔

دنیا کا ساز وسامان تیسرا شیطانی حربہ

اس آیت کریمہ میں تیسری چیز"شہوات" کی تفسیر میں دنیا کے مال ومتاع اور مختلف قسم کے ساز وسامان کو بیان کیا گیا ہے۔فرمایا کہ:

" وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ " (آل عمران)

یہ ساز وسامان،سونا چاندی،گھوڑے،چوپائے اور کھیتیاں بھی انسان کو مزین کرکے دکھایے جاتے ہیں،جس سے وہ دھوکہ میں مبتلا ہوجاتا ہے۔یہ سمجھتا ہے کہ یہ چیزیں بڑی لائق وفائق ہیں،بڑی بہترین وعمدہ ہیں حالانکہ ان کی برائی وقباحت اس

قدر ہے کہ وہ اپنانے کے قابل نہیں۔مگر شیطان ان کو اس طرح مزین کر دیتا ہے کہ انسان خوامخواہ ہی ان کی جانب میلان کرتا ہے۔میں کہا کرتا ہوں کہ یہ مال ومتاع در حقیقت ایسا ہے جیسے پیشاب کے ڈھیلے، کہ ضرورت پر ان کا استعمال لازم ہے مگر ان سے محبت کرنا، ان کو گلے سے لگانا، اور ہر وقت ان ہی کی فکر میں لگا رہنا بڑی کم عقلی و بے وقوفی کی بات ہے۔

متاع کی تفسیر اور صاحب بن عباد کا واقعہ

اسی لئے یہاں قرآن نے دنیا کے ساز وسامان کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ: ''**ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا**'' (یہ سب دینوی زندگی کا سامان ہے) یہاں سامان کے لئے'' متاع'' کا لفظ آیا ہے، اور متاع حقیر قسم کی چیز وسامان کو کہتے ہیں۔ صاحب بن عباد ایک بہت بڑے عالم و ادیب گزرے ہیں اپنے وقت میں مؤید الدولہ بن رکن الدولہ کے وزیر بھی تھے، بڑے لغوی اور عربی زبان کے ادیب تھے، ان کا واقعہ ہے کہ ایک بار ان کو اس لفظ کی تحقیق کی ضرورت پڑ گئی۔انھوں نے سوچا کہ عربی زبان کی اصل کو معلوم کرنے دیہاتوں میں جانا چاہئے، کیونکہ وہاں زبان اپنی اصلیت پر باقی رہتی ہے، برخلاف شہروں کے کہ وہاں مختلف علاقوں کے لوگوں سے میل جول کی وجہ سے عربی زبان اپنی اصلیت پر باقی نہیں ہے۔وہ کہتے ہیں کہ میں مختلف گاؤں دیہاتوں میں اس لفظ کے معنے جاننے کے لئے گھومتا رہا، ایک جگہ دیکھا کہ ایک دیہاتی عربی لڑکا بیٹھا ہے، میں اس کے پاس چلا گیا، اور اس کے بازو بیٹھ گیا، اور اس کے قریب ایک کپڑا پڑا ہوا تھا جو زمین وغیرہ پوچھنے اور صاف کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔کہتے ہیں کہ اتنے میں ایک کتا آیا اور وہ پوچھنے کا کپڑا

اٹھا کر لے گیا۔ کچھ دیر بعد اس لڑکے کی ماں آئی تو اس لڑکے نے ماں سے کہا کہ:
"جاء الرقيم و أخذ المتاع و تبارك الجبل" (کہ کتا آیا اور متاع اٹھایا اور پہاڑ پر چڑھ گیا) علامہ صاحب بن عباد کہتے ہیں کہ اس سے مجھے سمجھ میں آیا کہ متاع کی کیا حقیقت ہے؟ اس لڑکے نے پوچھنے کے کپڑے کے لئے جو ایک معمولی و حقیر چیز ہوتی ہے اور سجانے کے نہیں بلکہ چھپانے کے قابل ہوتی ہے اس کو متاع کہا۔ لہذا متاع کے معنے یہ ہوئے کہ جو چیز ضرورت کی ہو، مگر حقیر ہو، معمولی درجہ کی ہو، جیسے پوچھنے کا کپڑا، اس کو عربی میں متاع کہتے ہیں۔

اللہ اکبر! قرآن کریم میں دنیا کے ساز و سامان کے لئے یہ لفظ لا کر یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کا یہ مال و دولت اگر چہ کہ ایک ضرورت کے لئے ہے مگر وہ دل لگانے اور شوکیس میں سجانے اور لوگوں کو دکھانے کے قابل نہیں ہے۔ کیا کوئی پوچھنے کے کپڑے کو شوکیس میں سجاتا ہے؟ کیا کوئی اس کو دل سے لگاتا ہے، اس سے محبت کرتا ہے؟ نہیں، اسی طرح دنیا کو بھی سمجھنا چاہئے۔

الغرض یہ دنیا بھی مزین کر کے شیطان لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے اور اس کو اپنے ایک حربے کی طرح استعمال کرتا ہے۔

دنیا کے ذریعہ شیطان کس طرح بہکاتا ہے؟

اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک دفعہ ایک آدمی نے دیکھا کہ ایک جگہ درخت ہے اور لوگ اس درخت کی پوجا کر رہے ہیں، تو اس آدمی کے دل کے اندر ایک عزم ایک حوصلہ پیدا ہوا کہ اس درخت کو اکھاڑ دینا چاہئے، اس لیے کہ یہ درخت لوگوں کو، اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف آنے سے مانع بن رہا ہے اور اس کے بجائے شرک و گمراہی اور کفر میں پھنسنے کا ذریعہ بن رہا ہے۔

چنانچہ وہ شخص کچھ ہتھیار لے کر گیا اور درخت کو اکھاڑنا شروع کیا، شیطان آیا اور کہنے لگا کہ کیا کر رہے ہو؟ تو اس نے کہا کہ میں اس درخت کو اکھاڑنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ اس درخت کی وجہ سے بہت سے اللہ کے بندے کفر میں پھنس رہے ہیں، اور شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ شیطان نے کہا کہ نہیں نہیں، تم ایسا مت کرو، اس کو یہاں کے لوگوں نے اب تک پالا اور بڑھایا ہے، اور اس کے پیچھے ہم نے محنت کی ہے۔ مگر اس شخص نے کہا کہ نہیں نہیں، میں تو اللہ کے لیے آیا ہوں اور یہ کام میں کر کے رہوں گا۔ اس نے اپنا پورا عزم بتایا، پورا حوصلہ بتایا،۔ جب شیطان نے اس کا یہ عزم دیکھا تو اس کی ہمت اور طاقت کے مقابلہ میں شیطان مجبور ہو گیا، اس لیے کہ اخلاص کے ساتھ جب عمل ہوتا ہے تو اس کے اندر بڑی قوت ہوتی ہے اور شیطان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو شیطان عاجز آ گیا۔ پھر سوچنے لگا کہ کس طرح اس کو اس نیکی سے روکوں؟ اس کی سمجھ میں ایک بات آ گئی، شیطان نے اس سے عاجزی سے کہا کہ میری ایک درخواست ہے اس کو سن لیں۔

اس نے کہا کیا درخواست ہے؟ شیطان نے کہا کہ درخواست یہ ہے کہ تم اس کام کو چھوڑ دو تو میں روزانہ تمہیں دو درہم دے دیا کروں گا، دو درہم روزانہ بغیر کسی محنت مزدوری گھر بیٹھے مل جائیں گے۔

یہ سنا تو دل میں دنیا کی لالچ آ گئی، اس نے کہا کہ اچھا دو درہم مجھے روزانہ ملیں گے، کون اسکا ذمہ دار ہوگا؟ شیطان نے کہا میں ذمہ دار ہوں، میں تجھے پیش کروں گا اور پیش بھی اس طرح کروں گا کہ روزانہ فجر کی نماز پڑھ کر مصلے سے اٹھیں گے تو تمہارے مصلے کے نیچے مل جائیں گے۔

اس نے کہا ٹھیک ہے دیکھتے ہیں، اب جو عزم لے کر آیا تھا، مال پیسے کی وجہ

سے وہ ختم ہوگیا، اور واپس اپنے گھر چلا گیا، رات سو کر صبح اٹھا، فجر کی نماز پڑھی اور اس کے دل ودماغ میں وہی دو درہم تھے، مصلے کے پاس گیا اور دیکھا تو واقعی مصلے کے پاس دو درہم اس کو مل گئے، اٹھایا اور جیب میں ڈال لیا، اور اس کے بعد دن بھر اپنے کام میں مصروف رہا، پھر دوسرا دن ہوا، اسی طرح فجر کے بعد مصلے کے پاس دو درہم مل گئے۔

اب روزانہ یہی تماشا ہوتا ہے کہ فجر پڑھ کے وہاں جاتا ہے دو درہم مل جاتے ہیں، مہینہ دو مہینہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اس کے بعد شیطان نے درہم دینا بند کر دیا۔ اب جب دو درہم نہیں ملے تو یہ شخص پھر اپنے ہتھیار وغیرہ لے کر وہاں پہنچا کہ درخت کو اکھاڑ دوں گا، شیطان بھی وہاں موجود تھا، جب اس نے وہ درخت اکھاڑنا چاہا تو شیطان نے کہا: کیا کر رہے ہو؟ کہا: درخت اکھاڑوں گا، اس لئے کہ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ دو دو درہم دیا کروں گا، کئی دنوں سے تم نے دیا نہیں، اب میں پھر وہی کام کروں گا جو پہلے کرنے آیا تھا۔ شیطان نے کہا کہ کرلے جو کرنا ہے، لیکن تجھے اس پر کوئی قدرت نہ ہوگی۔ اس نے کہا کہ کیوں؟ کہا کہ تو پہلے آیا تھا اللہ کے لیے، اب آیا ہے پیسے کے لیے، وہاں اخلاص موجود تھا اور یہاں اخلاص موجود نہیں ہے، اب تو اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس کے بعد وہ آدمی اپنا منھ لیکر رہ گیا۔

بھائیو! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کس طرح اپنے پھندے میں پھانسنے کے لیے لوگوں کو مال سے، پیسے سے، اپنی طرف مائل کرتا ہے۔

ایک بڑا شیطانی حربہ جہالت ہے

شیطان کا ایک مکر اور سب سے بڑا حربہ جہالت کی راہ سے ہوتا ہے۔ جب شیطان آدمی کو دیکھتا ہے کہ جاہل ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کے پاس صحیح علم نہیں، اور

اسے معلوم نہیں کہ حقیقت کیا ہے؟ اللہ کے بارے میں صحیح نہیں جانتا، رسول کے بارے میں صحیح نہیں جانتا، آخرت کے بارے میں نہیں جانتا، فرشتوں کا علم نہیں ہے، اسی طرح دینی معلومات کے اندر اس کے پاس کمی موجود ہے تو شیطان اس جہالت سے بہت فائدہ اٹھاتا ہے، اور عام طور پر جاہلوں کو ان کی جہالت کی وجہ سے بڑی بڑی قبیح ترین اور انتہائی ناروا باتوں کے اندر پھانس دیتا ہے۔

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ مکر کے لیے اور فریب کے لیے سب سے بڑا راستہ جہالت ہوتا ہے، اور اگر آدمی کے اندر جہالت کے بجائے علم ہو تو علم کے ذریعے سے وہ شیطان کے مکر کو، کید کو سمجھنے لگتا ہے، اور شیطانی حربہ سے بچ جاتا ہے، اور کامیاب ہو جاتا ہے۔

اسی مضمون کی طرف ایک حدیث کے اندر اشارہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”**فقیہ واحد أشد علی الشیطان من ألف عابد**“ (ایک فقیہ و عالم شیطان پر ایک ہزار عابدوں سے بھاری ہے) (ابن ماجہ: ۲۰، ترمذی: ۲/۹۷)

ایک طرف ایک ہزار عابد ہوں، شیطان کہتا ہے کہ ان سب کو میں ایک داؤ میں نیچا دھکا دوں گا، اس لیے کہ یہ لوگ عبادت تو کر رہے ہیں، لیکن ان کے پاس علم نہیں ہے، ہاں عبادت ہے، ریاضت ہے، مجاہدہ ہے، سب کچھ ہے لیکن علم شریعت نہ ہونے کی وجہ سے ایک داؤ میں ان کو گرا دوں گا۔

لیکن اگر کوئی عالم ہوتا ہے تو وہ عالم سے ڈرتا ہے، لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ڈر کر وہ پیچھے رہ جاتا ہے، جی ڈرتا تو ہے لیکن ڈرنے کے ساتھ کوشش یہ کرتا ہے کہ کوئی بڑا مکر ان کے لیے لاؤں۔ دوسروں کو تو چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہلاک کرتا رہتا ہے، لیکن علماء کو بڑے بڑے مکر سے ہلاک کرتا ہے۔ تو اس لیے علماء بھی بے خبر نہیں رہ سکتے۔

جاہل پر شیطان کا داؤ۔ ایک قصہ

ایک بہت بڑے عالم گزرے ہیں، امام ابن عبد البر مالکی، انہوں نے اپنی کتاب ''جامع بیان العلم'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ شیطان کے چیلوں نے شیطان سے کہا کہ جب کسی عالم کا انتقال ہوتا ہے تو آپ بہت خوش ہوتے ہیں، کسی عابد و زاہد کی موت پر اتنا خوش نہیں ہوتے۔ کیا بات ہے؟

شیطان نے کہا کہ آؤ میں تم کو اس کی وجہ بتاتا ہوں۔ اس کے بعد شیطان اپنے چیلوں کو لیکر ایک عابد کے پاس گیا جو جاہل تھا، اور سلام کیا، خیر خیریت پوچھی، شیطان نے اس سے کہا کہ آپ بڑے اچھے آدمی لگتے ہیں، میرے دل میں ایک وسوسہ ہے، خیال ہے، سوال ہے، میں اس کے بارے میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ عابد نے کہا کہ پوچھئے، اگر مجھے معلوم ہوگا تو جواب دے دوں گا، اگر معلوم نہیں تو آپ کسی اور سے پوچھ لیجئے۔

شیطان نے کہا کہ میرے دل میں ایک سوال پیدا ہو رہا ہے، وہ یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک انڈے میں زمین کو، آسمان کو، چاند کو، سورج کو، پوری کائنات کو داخل کر دے؟ اس حالت میں کہ انڈا جتنا ہے اتنا ہی رہے، اس میں اضافہ نہ ہو اور یہ زمین و آسمان جتنی بڑی ہیں، اس میں کوئی کمی نہ ہو۔ یہ ذہن میں ایک سوال آ رہا ہے، اس کے بارے میں آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

بھائیو! ذرا اندازہ کیجئے سوال کا، وسوسے کا کہ کس قدر خطرناک ہے۔ اب وہ عابد تو جاہل و بے وقوف تھا ہی، صرف نماز روزے کی باتیں تو جانتا تھا، باقی اتنا بڑا علم تو تھا نہیں، تو اس نے کچھ دیر سوچا، اس کے بعد کہنے لگا کہ انڈا اتنا ہی رہے اور زمین بھی اتنی ہی رہے اور آسمان بھی اتنا رہے پھر انڈے میں یہ سب داخل ہو جائیں؟

کیسے ہوسکتا ہے؟ یعنی شک کے لہجے میں، تعجب کے انداز میں اس نے یہ سوال دہرایا، پھر کہنے لگا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔

شیطان کے چیلے وہیں موجود تھے، شیطان نے ان سے کہا کہ میں نے اس کے دل میں شک کا بیج داخل کر دیا ہے جو اسے کفر تک پہنچا دیگا۔ دیکھا کہ میں نے ایک منٹ میں اس عابد وزاہد کو کافر بنا دیا، یا کفر کی دہلیز پر بٹھا دیا۔ اس طرح کے لوگ زندہ رہیں یا مر جائیں، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس کے بعد شیطان ایک عالم سے ملا، اس سے بھی یہی سوال کیا، اور کہا کہ جناب آپ عالم ہیں، فاضل ہیں، میرے ذہن میں ایک سوال پیدا ہو گیا ہے، اس کا جواب دریافت کرنے آیا ہوں؟ انھوں نے کہا کہ کیا سوال؟ کہا کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک انڈے میں زمین وآسمان کو ڈالدیں؟ تو ان عالم نے کہا کہ اس میں کیا تعجب کی بات ہے کہ انڈا اپنی حالت پر اسی طرح ہو، زمین اور آسمان بھی اسی طرح ہوں، پھر اللہ تعالیٰ انڈے میں ان کو داخل کر دیں؟ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اللہ کی ذات تو وہ ہے کہ جب ارادہ کرتا ہے کسی چیز کا تو ''کُنْ'' فرماتا ہے اور وہ چیز ہو جاتی ہے۔ ﴿وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (اور جب وہ (اللہ) کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے ''کن'' (ہوجا) کہتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے) اس لئے مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے، اس میں کوئی بات شک وشبہ کی نہیں۔

شیطان نے اپنے چیلوں کو دیکھ کر کہا کہ دیکھو اس کا علم ایسا ہے کہ یہ ہمارے داؤ میں نہیں پھنس سکتا، اور اس کو بہکانا ہمارے لئے آسان نہیں، اس لئے ان لوگوں کے زندہ رہنے سے مجھے پریشانی ہوتی ہے اور یہ لوگ مرتے ہیں تو میں جشن مناتا ہوں، اور عابد کا حال ایسا کہ اسے جب چاہیں ہم ادھر سے ادھر کر سکتے ہیں، اور اس

کی جہالت کی وجہ سے جب چاہے اس کو صرف معصیت میں نہیں، کفر میں بھی مبتلا کر سکتے ہیں۔(جامع بیان العلم)

اس واقعہ سے اندازہ کیجئے کہ جب آدمی کے اندر جہالت ہوتی ہے، علمِ شرع سے ناواقف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے جاہ وجلال سے ناواقف ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں انسان کس طرح کفر کے دلدل میں پھنس جاتا ہے؟ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ جہالت سب سے بڑی بیماری ہے۔

سالک کا سب سے پہلا کام تحصیل علم ہے

یہیں سے میں سالکین سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ علم دین سے کبھی غافل نہ ہوں، کیونکہ سالکین طریقت کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ وہ علم دین حاصل کریں۔ اسی لئے امام مالک نے فرمایا کہ:

"من تصوف و لم يتفقه فقد تزندق ومن تفقه ولم يتصوف فقد تفسق ومن جمع بينهما فقد تحقق " (جس نے تصوف اختیار کیا اور علم نہیں حاصل کیا وہ زندیق ہوگیا اور جس نے علم سیکھا مگر تصوف اختیار نہیں کیا وہ فاسق ہوگیا اور جس نے دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہوگیا)(ایقاظ الهمم:۲)

حضرت سیدنا امام جنید بغدادیؒ جو ایک طرف حدیث کے امام بھی تھے تو ایک طرف تصوف کے بھی امام تھے، وہ فرماتے ہیں کہ تصوف کی راہ قرآن اور حدیث پر قائم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس راہِ تصوف وسلوک کے اندر سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ علم شرع سے واقفیت ہو، لیکن علم شرع کا مطلب یہ نہیں کہ آپ پورے عالم و فاضل ہوجائیں، یہ کوئی ضروری نہیں، لیکن اتنا علم آدمی کے پاس ہونا چاہئے جس

سے کہ وہ حق و باطل میں تمیز کر سکے، اچھے اور برے کی پہچان اس کے اندر آ جائے، کھوٹ کیا ہے اور اصل کیا ہے اسکو سمجھ میں آ جائے، اتنا علم اگر اس کے پاس موجود ہے تو اس علم کے ذریعے وہ راہ کو طے کر سکتا ہے۔

لہٰذا علماء کی خدمت میں جانا، شریعت سے واقف ہونا، ضروری امور سے واقف ہونا، عقائد سے واقف ہونا، انتہائی ضروری ہے، ان کے بغیر آدمی کا اس راہ میں چلنا دشوار ہے، ورنہ کہیں نہ کہیں آدمی کو شیطان دھوکہ دے دیتا ہے۔

ایک جاہل کی گمراہی کا قصہ

حضرت مولانا تھانویؒ نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ ان کے گاؤں میں ایک آدمی تھا، بڑا عابد تھا، لیکن علمِ دین سے واقف نہیں تھا۔ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہاں کے کچھ لڑکوں نے اس کا مذاق بنانا چاہا اور سوچا کہ اس آدمی کی بے وقوفی ظاہر کی جائے، ایک دن وہ اپنے گھر میں سو رہا تھا، رات کا وقت تھا تو محلے کے دو چار لڑکے اس کی چھت پر چڑھ گئے اور بناوٹی آواز میں اس کا نام لے کر ایک خاص لب و لہجہ میں اس کو پکارا۔ وہ چونکا، اور پوچھنے لگا کہ کون ہے؟ ایک لڑکے نے آواز بنائی اور کہا کہ میں تمہارا خدا بول رہا ہوں۔ یہ سنتے ہی وہ جاہل اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے بعد کہنے لگا کہ اے باری تعالیٰ! کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ تو اس نے کہا کہ تیری عبادت مجھے بہت پسند آ گئی، اس لیے آج سے ہم نے تیرے سے نماز معاف کر دی ہے۔ یہ کہہ کر وہ لڑکے تو غائب ہو گئے۔

اب یہ جاہل عابد سمجھا کہ واقعی یہ اللہ تعالیٰ ہی کی آواز ہے، اس لئے اس کو یقین آ گیا کہ نماز معاف ہو گئی۔ اب اس کے بعد جو تہجد تھی وہ بھی ختم، فرائض تھے وہ بھی ختم، نماز کے لئے مسجد کو آنا بند کر دیا۔ اس طرح دو چار دن ہو گئے اور وہ نماز کو نہیں

آیا تو محلے کے لوگوں نے سوچا کہ بیمار تو نہیں ہو گیا؟ چلو جا کر دریافت کریں، کچھ لوگ وفد کی شکل میں اس کے گھر پہنچے، خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھا کہ طبیعت تو اچھی ہے؟ کہا کہ ہاں الحمدللہ! بہت اچھا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کہ پھر نماز کو کیوں نہیں آ رہے ہو؟ بہت دن ہو گئے آپ نماز کو نہیں آئے، کیا بات ہے؟ تو کہنے لگا کہ آپ کو خبر ہوئی ہو گی کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سے خوش ہو کر میرے سے نماز معاف کر دی۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ!

دیکھئے شیطان جاہل لوگوں کو کس طرح بہکانے لگتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان جہالت سے لوگوں کے اوپر تسلط قائم کر لیتا ہے۔

اللہ نے مجھے بچایا ہے، شیخ عبدالقادر جیلانی کا قصہ

یہ تو جاہلانہ طبیعت کا اثر و نتیجہ ہے، اس کے برخلاف جب علم ہوتا ہے تو کیا حال ہوتا ہے انسان کا؟ اس کو ایک واقعہ سے سمجھئے، کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جیسا کہ ہم جانتے ہیں بہت بڑے عالم تھے، محدث بھی تھے، بہت بڑے صوفی اور بزرگ بھی تھے، ان کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کے سامنے ایک ابر چھا گیا اور اس میں سے چمک ظاہر ہوئی، انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے اندر سے ایک آواز آنے لگی، آواز کی طرف متوجہ ہوئے تو اس آواز میں ان سے کہا گیا کہ آپ کی عبادت آپ کا زہد، ریاضت، آپ کے مجاہدات سے ہم بہت خوش ہو گئے، اس لیے آپ سے نماز معاف کر دی جاتی ہے۔

انہوں نے یہ سنتے ہی سوچا کہ نماز اللہ کے نبی ﷺ سے معاف نہیں ہوئی جبکہ آپ ﷺ کی عبادت و ریاضت کا جو حال تھا وہ سب کو معلوم ہے تو میرے سے کیسے معاف ہو سکتی ہے؟ لہذا یہ دراصل شیطان کی آواز ہے، پھر " **لاحول ولا قوہ إلا**

باللّٰہ ''پڑھا۔ یہ پڑھنا تھا کہ وہ ابر جو نظر آرہا تھا اور اس کے اندر سے چمک ظاہر ہورہی تھی وہ دُھویں کی شکل میں تبدیل ہوکر غائب ہوگئے، حضرت سمجھ گئے کہ دراصل شیطان کی آواز تھی، پھر کچھ دیر بعد اسی طرح ہوا اور اس کے اندر کہا گیا کہ آپ کو آپ کے علم نے بچالیا۔ حضرت نے فوراً اس کے جواب میں فرمایا کہ میرے علم نے نہیں، میرے خدا نے مجھے بچالیا۔

دیکھا آپ نے کہ علم انسان کی رہنمائی کرتا ہے، لیکن بچانے والی ذات تو اللہ ہی کی ہوتی ہے، اگر خدا بچانا نہ چاہے تو وہ عالموں کو بھی گمراہ کردے، جیسے بہت سے ہوجاتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ساتھ ایک اور واقعہ بھی پیش آیا، کہ آپ ایک مرتبہ بڑی شدت سے پیاس محسوس کررہے تھے، حضرتؒ نے جنگلات میں کئی سالوں تک زندگی گزاری ہے، ریاضت کے لیے، مجاہدات کے لیے، تو اس زمانہ میں پانی ایک دفعہ نہیں ملا، بڑی شدت کی پیاس لگ رہی تھی، دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ اسی وقت ایک ہاتھ ظاہر ہوا اور اس ہاتھ میں ایک گلاس تھا جو سونے یا چاندی کا تھا اور اس کے اندر پانی بھی تھا اور آواز آرہی تھی کہ آپ کے لیے یہ جنت سے بھیجا جارہا ہے، آپ اس کو لیجئے استعمال کیجئے۔ حضرت نے سمجھ لیا کہ یہ شیطان کی مکاری ہے، لہٰذا'' **لاحول ولا قوّۃ الا باللّٰہ** ''پڑھا، حضرت کو یہ بات کیسے سمجھ میں آئی کہ یہ شیطان کی مکاری وعیاری ہے؟ یہ بات سمجھ میں آئی شریعت کے علم سے، کیونکہ یہ سونے اور چاندی کا گلاس تھا اور سونے اور چاندی کا استعمال اللہ کے نبی علیہ السلام کی شریعت میں ممنوع ہے، حرام ہے، ناجائز ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے جنت سے وہ چیز دی جائے جو خود شریعت کے اندر حرام ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

شیطان نے بہکانے کی کوشش کی ،لیکن حضرت سمجھ گئے ،لاحول ولاقوۃ پڑھا تو شیطان کہنے لگا آپ کے علم نے آپ کو بچالیا۔حضرت نے فرمایا کہ علم نے نہیں بلکہ میرے خدانے مجھ کو بچالیا۔تواس طرح علم رہنمائی کرتاہے جس کی وجہ سے شیطان کے مکر کوسمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

شیطان کی حضرت عیسی علیہ السلام کو بہکانے کی کوشش

یادرکھو کہ شیطان کی عیاری ومکاری بڑی خطرناک ہوتی ہے،وہ کسی کوبھی نہیں چھوڑتا،حتی کہ حضرات انبیاءعلیہم السلام کوبھی نہیں چھوڑتا۔

ایک دفعہ شیطان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آیااورآ کر کہنے لگا: آپ تو وہ ہیں کہ اپنی ربوبیت سے شیرخوارگی میں آپ نے کلام کیا ، جبکہ کوئی اور ایسانہیں کرسکتا۔حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا کہ ربوبیت والوہیت تواس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھےقوت گویائی دی۔

پھر وہ کہنے لگا کہ اے وہ ذات کہ جس نے اپنی الوہیت سے مردوں کوزندہ کیاہے،اے وہ ذات جس نے اپنی الوہیت سے مختلف پرندوں کو بنا کرزندہ چھوڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہنے لگے ”لاحول و لاقوۃالاباللّٰہ“میں کہاں کا خدا، میرے اندرکہاں الوہیت؟الوہیت تواس اللہ کے اندر ہے جو مجھے بھی زندگی اورموت دیتاہے۔(مکائدالشیطان ابن ابی الدنیا:٦٧)

دراصل شیطان ان باتوں سےان کوبہکانے کے لیے آیا تھا تا کہ ان کے ذہن میں یہ ڈال دے کہ جیسے لوگ سمجھتے ہیں ،اسی طرح یہ الوہیت کے حامل ہیں ۔یعنی خدائی صفات ان کےاندرہیں،تو خدائی صفات کا حامل بتایااوران کے ذہن میں یہ بات ڈالنی چاہی تا کہ نعوذ باللہ حضرت عیسی گمراہ ہوجائیں،لیکن اللہ توانبیاءکرام علیہم

الصلوۃ والسلام کی حفاظت کرتا ہے، اور اپنی عصمت سے ان کو نوازتا ہے، اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فوراً یہ جواب دیا۔

معلوم ہوا کہ شیطان بڑا مکار ہے، عیار ہے، اور اسی لیے وہ چیزوں کو مزین کرتا ہے اور باتوں کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ انسان بہک جاتا ہے۔

حضرت جنید بغدادی سے شیطان کا عجیب سوال

حضرت جنید بغدادیؒ کا نام کون نہیں جانتا! آپ کا واقعہ ہے کہ حضرت جنیدؒ بغدادیؒ نے ایک مرتبہ دل میں خیال کیا کہ اگر شیطان سے ملاقات ہو جائے تو ایک سوال کروں گا، اور انہوں نے ایک دن اللہ سے دعاء بھی کر دی کہ اے اللہ! کبھی شیطان سے ملاقات کرادے تاکہ اس سے سوال کرلوں۔ ایک دن نماز پڑھ کر مسجد کے باہر نکلے تو ایک بوڑھا آدمی جھک کر سلام کرنے لگا۔ حضرت جنیدؒ نے اس کو دیکھ کر کہا کہ کون ہو تم؟ کہنے لگا کہ میں وہی ہوں جس سے ملنے کی آپ کو آرزو اور تمنا تھی۔

حضرت سمجھ گئے کہ یہ اصل میں شیطان ہے۔ شیطان نے کہا کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟ حضرت جنیدؒ نے کہا کہ میرے ذہن میں تیرے متعلق ایک سوال ہے، سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تجھے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تجھے کس چیز نے اللہ کے حکم کی تعمیل سے منع کیا؟ کیوں تو نے سجدہ نہیں کیا، کیا اللہ کی عظمت کو نہیں جانتا تھا؟ ارے تجھے اللہ کی معرفت حاصل تھی، اللہ تعالیٰ کی عظمتوں اور جلالتوں سے تو واقف تھا، اس قدر اللہ کی قربت رکھنے کے باوجود جب اللہ نے تجھے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کر۔ تو تو نے آخر کیوں سجدہ نہیں کیا؟

اس پر شیطان کا جواب کیا تھا، وہ سننے کے قابل ہے، اس کے جواب نے کچھ دیر کے لئے حضرت جنید کے ہوش اُڑا دیے۔ اس نے کہا کہ جنید! آپ جیسا توحید پرست آدمی اور یہ مشرکانہ سوال؟ آپ جیسا توحید پرست ایک اللہ کو ماننے والا، ایک اللہ کی پوجا کرنے والا اور آپ کے ذہن میں سوال آرہا ہے مشرکانہ سوال کہ میں نے غیر اللہ کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ کہنے لگا کہ آدم تو غیر خدا تھے، خدا تو نہیں تھے، میں غیر اللہ کو کیوں سجدہ کر لیتا۔ آپ جیسا توحید پرست آدمی ایسا مشرکانہ سوال میرے سے کر رہا ہے، بڑے افسوس کی بات ہے۔

حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ جب اس نے یہ بات میرے سے کہی تو مجھے لگا کہ ہاں! یہ تو ٹھیک کہہ رہا ہے، اور پھر تھوڑی دیر کے لیے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا ایمان سلب ہو رہا ہے، اس لیے میں سناٹے میں پڑ گیا، ہوش وحواس باقی نہ رہے، میں سوچنے لگا کہ اس کو کیا جواب دے سکتا ہوں۔ اس لیے کہ جب وہ کہہ رہا ہے کہ تم ایک اللہ کو ماننے والے ہو اور مجھے پوچھتے ہو کہ آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ حضرت جنید کہتے ہیں کہ میرے ذہن میں جواب نہیں آیا۔ فوراً اللہ کی طرف سے الہام ہوا اور مجھ سے کہا گیا کہ اس سے یہ پوچھو کہ حکم دینے والا کون تھا؟ حکم دینے والا جب خود کہہ رہا ہے کہ فلاں چیز کو سجدہ کرو تو توحید اسی کا نام ہے کہ اس کی بات کو مان لیا جائے۔ حضرت جنید کہتے ہیں کہ اس الہام کے بعد میرا ایمان برقرار ہوا اور نہ تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے ایمان میں تزلزل پیدا ہو گیا ہے۔

بھائیو! یہ ہے شیطان کی مکاری اور عیاری، نہ ولیوں کو چھوڑا، نہ غوث وقطب وابدال کو چھوڑا، نہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو چھوڑا۔ غور کرو کہ شیطان باتوں کو اور چیزوں کو کس طرح مزین کرتا ہے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کا ذرا اندازہ اس واقعہ سے آپ کر لیجئے، اس لیے کبھی بھی شیطان سے بے فکر نہیں ہونا چاہئے، شیطان کی عیاری اور مکاری سے بسا اوقات انسان بے ایمان بھی ہو جاتا ہے، لیکن اسے خبر نہیں رہتی کہ میں بے ایمان ہو گیا ہوں۔ شیطان کفر کو مزین کر دیتا ہے۔

مجھ سے کونسا گناہ ہو گیا؟

بعض لوگوں کی زبان پر کبھی کبھی ایسے الفاظ سنے جاتے ہیں جیسے مثلاً کبھی کوئی مصیبت آ گئی، پریشانی آ گئی، اللہ کی طرف سے بیماری میں مبتلا کر دیا گیا یا کھانے کی پینے کی اور کسی قسم کی پریشانی پیش آ گئی تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے سے کیا گناہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ مصیبت دے رہا ہے۔ اس جملہ پر غور کیجئے! نفسانی کید اور شیطانی مکر پر غور کیجئے کہ اس جملے کے اندر کس قدر نفسانی کید اور شیطانی مکر پوشیدہ ہے، گویا کہ اس جملے میں وہ دعوی کر رہا ہے کہ میں گناہ نہیں کرتا، میں گناہوں سے بالکل معصوم اور پاک ہوں، اس لئے کہتا ہے کہ مجھ سے کون سا گناہ ہو گیا؟ یعنی بالکل نہیں ہوا، قطعاً نہیں ہوا، پھر اللہ تعالیٰ مصیبت میں مجھے کیوں ڈال رہا ہے؟ اس میں دعویٰ ہو گیا اپنے آپ کے پاکباز ہونے کا، جس کا دعویٰ انبیاء کرام علیہ الصلوۃ والسلام نے بھی کبھی نہیں کیا تھا، لیکن یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میرے سے کوئی گناہ نہیں ہوا، اور جب گناہ ہی نہ ہونے کا یہ دعویدار ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہو گیا کہ نعوذ باللہ یہ انبیاء جیسا معصوم ہو گیا۔

اب بتاؤ کہ اس جملے میں شیطانی مکر پوشیدہ ہے کہ نہیں ہے؟ نفسانی کید پوشیدہ ہے کہ نہیں ہے؟ لیکن یہ جملہ کتنی آسانی وسادگی کے ساتھ زبان سے نکل جاتا ہے، اور کس قدر لوگ اس کے اندر ملوث ہیں، لیکن کبھی ان کو دھیان تک نہیں جاتا کہ ہم

نے اس جملہ کے اندر کتنا بڑا دعوی کیا ہے، اس دعویٰ کی وجہ سے ان کی ساری عبادت بھی رائیگاں چلی جاتی ہے۔

حضرت آدم اور شیطان کی خطاؤں میں فرق

یہاں ایک نکتہ عرض کرتا ہوں، وہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے بھی خطا ہوئی اور شیطان نے بھی خدا کی نافرمانی کی، مگر ان دونوں کی نافرمانیوں میں ایک زبردست اور بڑا عظیم فرق ہے، وہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جب ایک خطا کا صدور ہوا تو فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے انہوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیا، اور شیطان سے جب گناہ ہوا تو وہ اڑ گیا کہ مجھ سے گناہ نہیں ہوا ہے، بلکہ میں نے تو آدم کو سجدہ نہ کر کے توحید کا مظاہرہ کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ بندہ کا اللہ کی جناب میں عجز و نیاز اور اپنی خطاؤں و گناہوں کا اعتراف ہی اس کو اللہ کے یہاں مقام دلاتا ہے۔

اس لئے یوں کہنا کہ میں نے کونسا گناہ کیا یہ بہت نازیبا بات ہے اور اس میں دعوی ہے۔ لہذا ایسے قبیح جملوں کے استعمال کرنے سے بچنا چاہئے، شیطان ایسے جملے ہماری زبانوں سے نکلوا کر ہمارا ایمان برباد کرنا چاہتا ہے۔

عبادات پر ناز - ایک عظیم شیطانی حربہ

شیطانی حربوں کا ذکر چل رہا ہے تو ایک اور اہم بات کی طرف توجہ کیجئے، خاص طور پر میں سالکین کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ شیطان انسانوں کو گمراہ کرنے ایک حربہ یہ بھی استعمال کرتا ہے جو زیادہ خطرناک اور قابل توجہ ہے، وہ کیا؟ وہ یہ کہ بسا اوقات شیطان عبادات و ریاضات کے ذریعہ، نماز روزہ کے ذریعہ، وظائف کے ذریعہ انسان کو بہکاتا ہے، اور دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ تو

بڑا عابد و بزرگ ہو گیا ہے، تیرا بہت اونچا مقام ہے، اس طرح عبادات پر ناز و فخر میں مبتلا کر کے انسان کو خدا کی نظروں سے گرا دیتا ہے۔

بعض لوگ ہوتے ہیں کہ دو چار رکعات پڑھ کر ڈینگیں مارنے لگتے ہیں، اور خود کو سب سے افضل اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ عبادات و ریاضات پر ناز و فخر دل کی نجاستوں و گندگیوں میں سے ایک ہے۔ معلوم نہیں کتنی گندگیاں ایسی ہمارے اندر ہیں، کتنی خباثتیں اور رذائل ہمارے اندر جمی ہوئی ہیں اور ہم اس کے باوجود بڑے مطمئن ہیں کہ ہم تو ماشاء اللہ ذاکر ہیں، شاکر ہیں، سالک ہیں اور فلاں اور فلاں قسم کی عبادتوں میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ یہ عبادت نہیں، بلکہ عبادت کے لباس میں گناہ ہیں جن کو شیطان نے اس طرح مزین کر دیا ہے اور نیکی کا پردہ ڈال دیا ہے کہ اس کے اصلی چہرہ کو دیکھنے اور اس کی اصلیت کو پہچاننے سے ہماری آنکھیں قاصر ہیں۔

اسی لئے شیخ کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ شیطان کے مکر و فریب سے واقف ہوتا ہے، نیکی اور بدی کی پہچان رکھتا ہے، وہ شیطان کی چالوں کو سمجھتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ شیطان کہاں چکما دے رہا ہے، کس طرح گمراہ کر رہا ہے، اسی لئے ہمارے بزرگان دین فرماتے ہیں کہ کسی اللہ والے سے تعلق رکھنا اور اس کی رہبری میں دین پر چلنا ضروری ہے ورنہ شیطان ایسا مکار اور چالباز ہے کہ اس نے نہ ولیوں کا چھوڑا، نہ غوث و قطب کو چھوڑا، نہ انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام کو چھوڑا، نہ کسی اور کو چھوڑا تو ہمارے اور آپ کے ساتھ اس کا کیا معاملہ ہوتا ہوگا؟

شیطان کا اللہ کے سامنے دعوی

بھائیو! ہم سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے،

قرآن کریم میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے: ﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ﴾ (بے شک شیطان کھلا دشمن ہے) (القصص:۱۵)

اور ایک جگہ قرآنِ کریم کے اندر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ شیطان نے اللہ کے سامنے اس بات کا دعوی کیا کہ وہ انسانوں کو ہر طریقہ سے اور ہر طرف سے گمراہ کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ تعالی شیطان کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ:

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ﴾ (الأعراف:۱۶)

(اے اللہ! آپ نے چونکہ مجھے گمراہ کیا؛ اس لئے میں لوگوں کو بہکانے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا پھر میں ان کے سامنے سے، پیچھے سے، ان کے داہنی طرف سے اور بائیں طرف سے بہکانے آؤں گا، پھر آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے)

ان آیتوں میں شیطان کے اسی دعوی کا ذکر کیا گیا ہے، شیطان کے یہ الفاظ قابل غور ہیں، اور یہ بات بھی کہ اس نے اتنا بڑا یہ دعوی خود اللہ تعالی کے سامنے کھڑے ہو کر کیا تھا۔ شیطان کہتا ہے کہ اے اللہ! چوں کہ آپ نے مجھے گمراہ قرار دیا ہے، اس لیے میں صراط مستقیم پر آ کر میں بیٹھوں گا تا کہ میں ان کو گمراہ کرتا رہوں، دائیں سے بائیں سے، آگے سے پیچھے سے چہار طرف سے آ کر ان کو بہکانے کی کوشش کروں گا۔ تو وہ اپنے اس دعوی کو حقیقت بنانے کیا کچھ نہ کرتا ہوگا اور اس کے لئے کس قدر قوت وطاقت سے، اور اپنی عقل و تجربے سے کام لیتا ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں۔

شیطان صرف چار طرفوں سے بہکاتا ہے، کیوں؟

یہاں اس آیت میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ شیطان نے بہکانے کے لئے صرف چار طرفوں کا ذکر کیا ہے: آگے، پیچھے، داہنے اور بائیں کا، جبکہ جہات چھ ہیں، ان میں اوپر اور نیچے کا ذکر شیطان نے نہیں کیا، کیوں؟

اس کی وجہ علماء لکھتے ہیں کہ شیطان نے نیچے کی جہت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ نیچے سے آنا نہیں چاہتا، کیونکہ اس کے اندر کا تکبر اسے نیچے سے آنے میں مانع بنتا ہے، اس لیے کہ نیچے سے آنے میں جھکنا پڑتا ہے، اور جس میں تکبر ہوتا ہے وہ کبھی جھکنے کو گوارہ نہیں کرتا، اور اس نے اوپر کی جہت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ شیطان کو اوپر سے آنے کی اللہ نے قدرت نہیں دی ہے، اس لیے کہ اوپر سے فرشتوں کے آنے کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس راہ کو شیطان کے لیے مسدود کر دیا ہے۔

شیطان صراطِ مستقیم پر؟ ایک عجیب نکتہ

اب اس آیت کے مضمون پر غور کرو کہ شیطان نے یہ کہا کہ میں صراطِ مستقیم پر بیٹھوں گا، ''لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ''

سوال یہ ہے کہ کیا شیطان بھی صراطِ مستقیم پر بیٹھتا ہے؟ جی ہاں! بیٹھتا ہے، مگر ایک ہے صراطِ مستقیم پر قائم ہونا کھڑا ہونا اور ایک ہے صراطِ مستقیم پر بیٹھنا، دونوں میں بڑا فرق ہے، ہر مسلمان، نیک آدمی، اللہ والا صراطِ مستقیم پر کھڑا ہوتا ہے، اور محاورے میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی غرض سے وہ اس پر کھڑا ہے اور چل رہا ہے، لیکن صراطِ مستقیم پر بیٹھنا الگ چیز ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چلنے کے لئے نہیں، اس کو پار کرنے کے لئے نہیں، بلکہ کسی بری غرض و نیت سے اس پر ہی

بیٹھ گیا ہے۔جیسے ڈاکو لوگ شاہ راہوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور گزرنے والے قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں بالکل شیطان کا صراط مستقیم پر بیٹھنا بھی اسی طرح کا بیٹھنا ہے کہ وہ اس پر بیٹھ کر لوگوں کے ایمانوں اور نیکیوں کو لوٹ لینا چاہتا ہے۔

یہیں سے ایک نکتہ کی بات بھی سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ کہ شیطان لوگوں کو بہکانے کے لئے صراط مستقیم پر آتا ہے، یعنی ان لوگوں کے پاس آتا ہے جو صراط مستقیم پر چل رہے ہیں، اسے تو انہی کو بہکانا ہے اور وہ لوگ جو پہلے ہی سے بہکے ہوئے اور گمراہ ہیں ان کو بہکانے کی اسے ضرورت کیا ہے؟ وہ تو بہکے ہوئے ہیں، لہذا صراط مستقیم پر آکر بہکانے کا حاصل یہ ہوا کہ وہ صراط مستقیم پر چلنے والوں کی تلاش وجستجو میں وہاں آتا اور وہاں بیٹھ کر ان کو بہکاتا ہے۔اور یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ کفر و معصیت اور جہالت و بغاوت کے راستے پر جا کر بیٹھے گا تو اس کو بہکانے کے لئے کون ملے گا؟ وہاں تو کافر ہوں گے، شرابی ہوں گے، زانی ہوں گے، لٹیرے ہوں گے، یہ سب لوگ پہلے سے بھٹکے و بہکے ہوئے ہیں، شیطان اتنا بے وقوف نہیں کہ وہ اپنی محنت ان کے پیچھے ضائع کردے، لہذا وہ صراط مستقیم پر آتا ہے کہ یہیں اس کو مومنین ملتے ہیں، مسلمین ملتے ہیں، ذاکرین ملتے ہیں، نمازی ملتے ہیں، حاجی ملتے ہیں، اللہ والے ملتے ہیں۔

ایک عالم کا قصہ

مجھے ایک عالم کا قصہ یاد آیا کہ ان سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت! ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ اہل سنت میں سے ہوتے ہیں، اور وہ بہک جاتے اور شیعہ فرقے میں داخل ہوجاتے ہیں، کوئی قادیانی بن جاتا ہے، کوئی اور کسی گمراہ فرقوں ولوگوں میں داخل وشامل جاتا ہے، مگر ہم نے کبھی نہیں سنا کہ ان گمراہ فرقوں کے لوگ مسلمان

ہو گئے اور اہل سنت میں داخل ہو گئے ،اس کی کیا وجہ ہے؟ تو ان عالم نے بڑا عمدہ جواب دیا ،انھوں نے کہا کہ دیکھو! شیطان انہی لوگوں کو بہکا تا ہے اور ان ہی کے دلوں میں وسوسہ وشبہات ڈالتا ہے جوحق پر ہوتے ہیں ،اور جو پہلے ہی سے بہکے ہوئے ہوں ان کو شیطان ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے ۔لہذا بہکاوا اگر ہوگا تو اہل سنت ہی کو ہوگا ، نہ کہ اہل باطل کو۔اس لئے شیطان اہل حق کو بہکا تا ہے اور انہی میں سے کچھ لوگ بہک جاتے ہیں۔

سالکین کوشیطان کس طرح بہکا تا ہے؟

اب آیئے اصل بات کی طرف ،علماء نے بیان کیا ہے کہ صراط مستقیم پر بیٹھنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ شیطان نیکیوں کے ذریعہ بھی انسانوں کو تباہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس طرح پر کہ جب نیک لوگ نیکی کرتے ہیں تو ان کے دل ودماغ کے اندران کی بڑائی کا تصور ڈالدیتا ہے،اور وہ نیکی کے کام کر کے اپنے کو بڑا سمجھتے اور ناز وفخر میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔

ایک دفعہ حضرت سیدنا موسی علیہ السلام کے پاس شیطان پہنچا ،حضرت موسی علیہ السلام نے اسے دیکھا تو فرمایا کیا تو شیطان نہیں ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں میں شیطان ہوں۔حضرت موسی علیہ السلام نے کہا کہ مجھے یہ بتا کہ تو اب تک لوگوں کو گمراہ کرتا آیا ہے، گمراہ کرنے کے لیے سب سے بڑا کونسا حربہ اختیار کرتا ہے؟

اس نے کہا کہ میں اس طرح گمراہ کرتا ہوں کہ انسان کو اس کی نیکیوں پر تفاخر میں مبتلا کر دیتا ہوں۔نیکی کرتا ہے تو سمجھتا ہے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوگیا ہوں، میں نے تو بہت کچھ کر دیا ہے، اپنی نیکیوں کو اچھا سمجھنا، اپنے آپ کو اچھا سمجھنا، اپنی عبادت ریاضت ومجاہدہ کو قابل فخر چیز سمجھنا، اپنے آپ کو اونچا اور سب سے اعلی سمجھنا، یہ عجب

وتکبر ہے۔اس عجب وتکبر کے راستے سے میں ان کو بہکایا کرتا ہوں۔(تنبیہ الغافلین)

معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک حربہ ہے شیطان کا،اور بہت بڑا حربہ ہے۔چنانچہ بہت سارے لوگ عبادت کرتے ہیں،ریاضت کرتے ہیں،مجاہدات کرتے ہیں،علم کے میدان میں آگے بڑھتے ہیں اور مختلف قسم کی خدمات کرتے رہتے ہیں،اللہ کے دین کی اشاعت میں،اللہ کے دین کی دعوت میں،اللہ کے دین کو پھیلانے میں لگتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس تکبر غرور اور فخر میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ ''ہم چوں ماڈنگرے نیست''،ہم تو بہت آگے بڑھ گئے ہیں،اب ہمارا کوئی مقابل نہیں،اور اسی کے ساتھ ساتھ پھر دوسروں کی توہین اور تضلیل اور دوسروں کے بارے میں بدگمانی،دوسروں کے بارے میں ایک قسم کے برے خیالات بھی دل میں جمالیتے ہیں،جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا عبادت کرتا ہے اتنا نیچے آجاتا ہے،اس سے اللہ کی نظر میں وہ انتہائی ناقص ہوجاتا ہے اور آخری منزل میں اس کو گرا کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ایک بزرگ کی قیمتی نصیحت

اس لئے سالک کو ہمیشہ اپنے آپ کو حقیر سمجھنا چاہئے،اسی عاجزی وانکساری سے ترقی ہوتی ہے۔ایک بزرگ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ حضرت کوئی نصیحت فرمایئے!انہوں نے ایک دومنٹ سوچنے کے بعد کہا کہ بھائی!کبھی پہاڑ پر چڑھے ہو،اس نے سوچا،اس کے بعد کہا کہ ہاں چڑھا ہوں،فرمایا کہ جب پہاڑ پر چڑھے تھے تو کس طرح چڑھے تھے؟جھک کر چڑھے تھے یا اکڑ کے،اس نے کہا کہ جب چڑھنے کا موقع آیا تو جھک کے چڑھا تھا۔

آپ بھی سوچ کر دیکھ لیجئے کہ جب پہاڑ یا کسی بھی بلندی پر چڑھنے کا موقع آتا ہے تو انسان کیسا چڑھتا ہے؟جھک جاتا ہے،جھک کر اوپر چڑھتا ہے۔اس نے

کہا کہ حضرت چڑھنے کے لیے جھک کر چڑھتا رہا، فرمایا کہ اچھا، جب چڑھے تھے تو اترے بھی ہوں گے، اترے تو کس طرح اُترے تھے؟ جھک کر یا اکڑ کر؟ اس نے کہا کہ اکڑ کے اترا تھا۔

اس لیے کہ اگر جھک کے اتریں گے تو لڑھک کر نیچے آ جائیں گے، اوپر سے نیچے کی طرف آتے وقت جھکنا نہیں چاہئے، بلکہ اکڑ کے آنا چاہئے، اس نے کہا کہ حضرت اکڑ کے آیا تھا۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ اس کے اندر بڑی عبرت ہے، وہ یہ کہ جو جھکتا ہے، اللہ اسے بلندی پر لے جاتا ہے، جو اکڑتا ہے، اسے اوپر سے نیچے لاتا ہے۔

کیسی اچھی مثال دی ہے، کیا بہترین نصیحت فرمائی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جھکنا اللہ کو پسند ہے، اگر ظاہری طور پر بھی آپ کسی بلندی پر پہنچنا چاہتے ہیں، حسی طور پر بھی کسی بلندی پر پہنچنا چاہتے ہیں تو وہاں بھی جھکنا ضروری ہو جاتا ہے اور جب آدمی اکڑتا ہے تو اوپر سے نیچے کی طرف آ جاتا ہے۔

اسی طریقے پر روحانی و باطنی طور پر جو بلندیوں پر پہنچنا چاہتا ہے تو اسے بھی جھکنا پڑتا ہے، جھکے گا، چڑھے گا، اکڑے گا تو نیچے آ کر مرے گا، یا نہیں تو کم از کم گرے گا؛ اس لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ شیطان کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ عبادت، ریاضت، مجاہدہ، نیکی، دینی خدمات یہ سب کچھ کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو اس طرح کے خیالات میں مبتلا کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اللہ کی نگاہ میں گر جاتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا شیطان سے ایک سوال

بہ ہر حال شیطان کے مختلف حربے ہیں جن سے وہ بہکاتا ہے، یہاں یاد آیا کہ

حضرت سیدنا نوح علیہ السلام طوفان کے موقعہ پر جب سفینہ میں سوار تھے تو وہاں پر اچانک ان کو شیطان نظر آیا، انہوں نے کہا کہ تو یہاں بھی پہنچ گیا؟ اب میں تجھے نہیں چھوڑوں گا، جب تک کہ تیرا راز نہ معلوم کرلوں۔ اس کو حضرت نوح علیہ السلام نے پکڑ لیا اور فرمایا کہ تیرا راز مجھ کو بتا کہ تو گمراہ جو کرتا ہے وہ کس راستے سے کرتا ہے؟

تو اس نے کہا کہ پانچ باتیں ہیں، لیکن پانچ میں سے میں آپ کو تین بتاتا ہوں، دو نہیں بتاتا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے وحی آئی کہ اس مردود سے کہو کہ ہمیں ان تین کی ضرورت نہیں ہے، وہ دو ہی ہم کو بتادے؛ اس لیے کہ اصل تو وہی ہے راز۔ تو حضرت سیدنا نوح علیہ السلام نے کہا کہ مجھے ان تین حربوں کی ضرورت نہیں ہے، وہ دو بتا جو تو نہیں بتانا چاہتا۔ تو اب مجبور ہوگیا اور کہنے لگا کہ وہ دو باتیں جس سے میں لوگوں کو گمراہ کرتا ہوں، اور آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا وہ آپ سن لیجئے! ایک حسد اور ایک حرص۔ پھر شیطان کہنے لگا کہ حسد سے میں گرا اور حرص سے حضرت آدم گر گئے۔

اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا اور ان کو علم عطا فرمایا اور ان کی شان وشوکت کو فرشتوں کے سامنے ظاہر فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ تو فرشتے تو سجدے میں گر گئے، ابلیس کو تکبر نے روکا، تکبر کے بعد حسد پیدا ہوا، حسد اس لیے پیدا ہوا کہ ان کی وجہ سے میں اللہ کی نگاہ میں گر گیا ہوں، اب کسی نہ کسی طرح ان کو بھی گرانا ہے، یہ ہے حسد۔ جب کسی کے پاس کوئی کمال دیکھے، جب کسی کے پاس حسن وجمال دیکھے، جب کسی کا عطا ونوال دیکھے، جب کسی کے اندر بڑائی دیکھے، جب کسی کے اندر علم دیکھے، جب کسی کے اندر مال ودولت کی فراوانی دیکھے، اس وقت دل کے اندر یہ خواہش کا ہونا کہ اس سے ساری

چیزیں چھن جائیں، چاہے مجھے ملیں کہ نہ ملیں، اس کے پاس بھی نہ رہیں، یہ ہے حسد کی بیماری، یہ حسد اللہ کی نگاہ میں بہت بری چیز ہے۔

شیطان نے سوچا کہ اللہ نے اُن کو اتنا اونچا بنایا ہے، ان کو بھی گراؤں گا، میں جیسے گر گیا ان کو بھی گراؤں گا، اس کے بعد اس حسد میں مبتلا ہو کر وہ فکر میں رہا کہ کس طرح ان کو میں ذلیل وخوار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں؟ یہ ہے حسد جس کی وجہ سے شیطان گمراہ ہوا۔

اور حضرت آدم کو جس درخت سے منع کیا گیا تھا، جا کر اس کو کھالیا تھا، اس لئے کہ شیطان نے قسم کھا کھا کر ان سے کہا تھا کہ میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ اس درخت کو کھانے کا اتنا بڑا فائدہ ہے، اور فائدہ یہ ہے کہ آپ اس کو کھالیں گے تو کبھی نہیں مریں گے، ہمیشہ زندہ رہیں گے، انہوں نے کہا کہ بہت اچھا، کھالیں گے تو حرص میں آ کر کھا گئے، اس کو شیطان نے کہا کہ حسد نے مجھے تباہ کیا اور حرص کی بیماری نے حضرت آدم علیہ السلام کو گرا کر رکھ دیا۔

عبرت وموعظت

میرے بھائیو اور دوستو! شیطان کے یہ سارے راز ہم کو اللہ کے کلام کے ذریعے ملے، انبیاء کرام سے ملے، بزرگوں کے کلام کے ذریعے ہم کو ملے، ان ساری چیزوں سے ہم کو معلوم ہوا کہ شیطان کس کس طریقے پر انسان کو بہکاتا ہے، اور ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور پھر اللہ سے دوری میں مبتلا کرتا ہے، جب ہمیں یہ سب چیزیں معلوم ہو گئیں تو اب ہم ان ساری چیزوں سے بچنے کے لیے اپنے آپ کو چوکنا رکھیں۔

قرآن کریم نے ہم کو بتا دیا ہے ﴿اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِیْنٌ﴾ (شیطان

کھلا ہوا دشمن ہے)(القصص:۱۵)

اگر کوئی آپ کا باپ یا استاذ، یا آپ کا دوست، آپ کو بتا دے کہ فلاں آدمی سے چوکنا رہو، اس لیے کہ وہ تمہارا دشمن ہے، تو آپ کو یقین آتا ہے اور آپ بچتے ہیں کہ نہیں بچتے؟ باپ کی بات پر یقین، استاذ کی بات پر یقین، شیخ کی بات پر یقین، دوست کی بات پر یقین، لیکن اللہ کہہ رہا ہے کہ شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے، مگر افسوس کہ اس پر یقین نہیں۔ اور وہ چیزیں جو شیطان ہم کو گمراہی میں پھنسانے کے لیے اختیار کرتا ہے، ان چیزوں کو بڑی آسانی سے ہم اختیار کرتے چلے جاتے ہیں، بہت بڑی ہمارے لیے عبرت کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مکائد شیطان کو سمجھنے کی ہمیں توفیق دے، اور اس سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہمیں بھرپور توفیق وہمت عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰه رب العالمين

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنائیے

باسمہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ ہی کو مقصود بنائیے

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ﴾ (الانشراح:۷-۸)

حضرات!

آپ کے سامنے قرآن کریم کی ایک مشہور سورت کی آخری آیتیں تلاوت کی گئی ہیں، جس کو ''سورۂ الم نشرح'' یا ''سورۂ انشراح'' کہا جاتا ہے، اور ان آیات میں ایک نہایت اہم مضمون ارشاد فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ﴾

(اے ہمارے نبی! جب آپ فارغ ہوجائیں تو محنت کیجئے اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کیجئے)

اس میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کرکے فرمایا گیا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ فارغ ہوجائیں، کس کام سے؟ اپنے دعوتی اور تبلیغی اور علمی و اصلاحی، جہادی اور مختلف قسم کے جو کام آپ کے سپرد ہیں، ان سے فارغ ہوجائیں تو پھر عبادت کے لیے تیار ہوجائیے اور اس میں خوب محنت کیجئے اور پھر اپنے ہی رب کی طرف پورے پورے طور پر متوجہ ہوجائیے۔

یہ آیتیں بڑی قابل غور آیتیں ہیں، اگرچہ خطاب ہے نبی اکرم ﷺ کو، لیکن

آپ کے واسطے سے تمام لوگوں کو ہے اور بالخصوص امتیوں کو، اور پھر بالاخص سالکین کو جو اللہ کے راستے میں چلنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

آیت زیر بحث کی تفسیر

اب آیئے ان آیات کے معنی پر غور کریں۔ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَ اِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ﴾ (اے ہمارے نبی! جب آپ فارغ ہو جائیں تو محنت کیجئے اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کیجئے)

اس میں جو یہ فرمایا کہ ''جب آپ فارغ ہو جائیں'' اس سے مراد یہ ہے کہ جب آپ اپنے دنیوی امور سے اور اپنی دینی و نبوی ذمہ داریوں سے فارغ ہو جائیں، ''فَانْصَبْ'' تو آپ عبادت میں اپنے کو لگا دیجئے۔ چنانچہ مفسرین کرام نے فارغ ہونے کے معنی میں دنیوی امور و دینی امور دونوں کو مراد لیا ہے۔ اسی لئے بعض نے فرمایا کہ ''جب آپ دنیوی کاموں سے فارغ ہو جائیں''، بعض نے کہا کہ ''جب آپ جہاد سے فارغ ہو جائیں'' اور بعض نے کہا کہ ''جب آپ تبلیغ وحی سے فارغ ہو جائیں''۔ (دیکھو تفسیر ابن کثیر و روح المعانی)

لہذا مطلب یہ ہوا کہ آپ جب اپنے دنیوی و دینی کاموں و ذمہ داریوں سے فارغ ہو جائیں تو اب آپ خالص اللہ کی عبادت میں اپنے کو لگا دیجئے، اب کوئی اور مشغولیت نہ ہو، کسی کی جانب دھیان نہ ہو، بلکہ صرف اور صرف عبادت الٰہی میں مصروف ہو جائیں۔ اور ''وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَب'' (اپنے رب ہی کی جانب رغبت کیجئے) کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ اب آپ کو کسی اور کام سے کوئی مطلب نہ ہو، حتیٰ کہ دعوت و تبلیغ، تعلیم و تفہیم وغیرہ سے بھی کوئی مطلب نہ ہو، بلکہ صرف اپنے رب کی جانب توجہ و رغبت کیجئے۔

بلاغت کا ایک قاعدہ

اس آیت میں ایک بات طالب علموں کو سمجھنے کی ہے، یہاں طلبہ بھی موجود ہیں وہ غور کریں، وہ یہ کہ عربی میں اصل یہ ہے کہ پہلے فعل آتا ہے پھر فاعل ومفعول آتے ہیں، پھر اس فعل کے متعلقات آتے ہیں، جیسے ہم کہتے ہیں: " **تَکَلَّمَ زَیْدٌ خَالِداً فِيْ التَّارِیْخِ** "(زید نے خالد سے تاریخ کے بارے میں گفتگو کی) اس میں دیکھو پہلے" **تکلم** " ہے جو کہ فعل ہے، پھر" زید" جو کہ فاعل ہے، اس کے بعد" خالد" آیا ہے، وہ مفعول ہے، اس کے بعد" **في التاريخ**" ہے جو اس فعل کا متعلق ہے۔ لیکن کبھی کسی مصلحت سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ متعلقات فعل کو پہلے اور فعل کو بعد میں لاتے ہیں، جیسا کہ اس آیت میں ہے:" **وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ** " اس میں" فارغب" فعل ہے اور" اِلی ربک" اس فعل کا متعلق ہے، اس لئے اصل تو یوں کہا جاتا کہ: " فارغب اِلی ربک"، لیکن اس میں فعل کو بعد میں اور اس کے متعلق کو پہلے لائے، اس میں ایک مصلحت ہے، وہ یہ ہے کہ اس سے کلام میں حصر پیدا کرنا مقصود ہے۔ لہذا اس آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ": آپ اپنے رب ہی کی جانب رغبت کیجئے، اور کسی دوسری طرف رغبت نہ کیجئے"۔ اس بات کے پیدا کرنے کے لئے یہ تقدیم و تاخیر کی گئی۔ یہ بھی ایک قاعدہ ہے عربی زبان کا، بلاغت کا، جس کو علماء عربیت و بلاغت یوں تعبیر کرتے ہیں: " تقديم ما حقه التأخير يفيد الحصر"(اس چیز کو مقدم کرنا جس کا حق مؤخر ہونے کا ہے یہ حصر کا فائدہ دیتا ہے) لہذا اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام دنیوی و دینی کاموں سے جلد سے جلد فارغ ہو اور صرف وصرف اللہ کی جانب متوجہ ہو، اسی کی عبادت میں لگ جائے، اور اس وقت کسی اور چیز کی جانب اس کی توجہ ورغبت نہ ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کو واضح فرما دیا ہے کہ مسلمان کی شان کیا ہونی چاہئے، دعوت وتبلیغ والوں کی شان کیا ہونی چاہئے، درس وتدریس والوں کی شان کیا ہونی چاہئے، محققین اور فقہاء کی شان کیا ہونی چاہئے اور مجتہدین کی شان کیا ہونی چاہئے۔

ایک علمی نکتہ

اس آیت میں غور کرنے سے ایک نکتہ یہ بھی سمجھ میں آئے گا کہ آپ ﷺ کا کوئی کام دنیوی نہیں ہوتا تھا، آپ کی ساری مصروفیات دینی ہوتی تھیں، آپ کی صبح بھی دینی، شام بھی دینی، چلنا پھرنا، کہیں آنا جانا، سفر کرنا سب دینی کاموں کے لئے ہوتا تھا، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے محمد الرسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا کہ آپ اپنے ان دینی کاموں سے جو کہ عبادت غیر مقصودہ کی قبیل سے ہیں، جلدی فارغ ہو کر اللہ ہی کی طرف رغبت کیجئے اور عبادت مقصودہ یعنی نماز، ذکر وغیرہ میں لگ جایئے۔

جب دینی کاموں ہی سے جلدی فارغ ہو کر عبادت مقصودہ میں لگنے کا حکم ہے تو آپ اندازہ کر لیجئے کہ جو لوگ دنیوی کاموں میں لگے ہوئے ہیں تو ان کے بارے میں کیا حکم ہوگا۔ ارے بھائی! جو دینی چیزیں ہیں انہی میں نہیں، جیسے تدریس ہے، تالیف ہے، تصنیف ہے، تحقیق ہے، مطالعہ ہے،، دعوت ہے، تبلیغ ہے، جب انہیں چیزوں میں مگن نہیں رہنا ہے تو اب سوچ لیجئے جو دین سے تعلق رکھنے والی ہی نہیں ہیں، وہ محض دنیا ہے، ان کے اندر کیسے دماغ لگایا جا سکتا ہے۔

دنیوی چیزیں تین قسم کی ہیں

اب یہ سمجھئے کہ اس کے اندر جو مضمون آیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کو مقصود بنا کر زندگی

گزاری جائے ، دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں، بہت سے حالات ہیں، بہت سے مسائل ہیں، بہت سی ضرورتیں ہیں، بہت سی حاجتیں ہیں، لیکن ان سب میں مقصودِ اعظم انسان کے لیے اللہ کی ذات ہے، باقی سب چیزیں ضمنی ہیں۔ یاد رکھئے کہ دنیا میں چیزیں تین قسم کی ہوتی ہیں: ایک وہ چیزیں جو اللہ کو پانے کے راستے میں کام آنے والی اور مفید و معین ہیں، جیسے تعلیم ہے، تعلم ہے، پھر اس سے آگے بڑھیں تو تدریس اور وعظ ہے، نصیحت ہے، دعوت و تبلیغ ہے۔ دوسرے وہ چیزیں جو اللہ کے راستے میں حارج اور مانع بننے والی اور اس کے لے مضر و نقصان دہ ہیں، جیسے گناہ کے کام، اور تیسری وہ چیز ہیں جو اس میں نہ مفید و معین ہیں اور نہ مانع و حارج، جیسے انسان بہت سارے کام کرتا ہے اور اسے کرنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے، کھانے کی ضرورت ہے، پینے کی ضرورت ہے، کمانے کی ضرورت ہے اور بیوی بچوں کے ساتھ رہنے کی ضرورت ہے اور مختلف لوگوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے، تعلقات وابستہ کرنا پڑتا ہے، اور رشتہ داریوں کو نباہنا پڑتا ہے، دوستوں کے ساتھ بھی اٹھنا اور بیٹھنا پڑتا ہے۔

تو ان میں سے جو چیزیں کہ اس راستے میں مانع بننے والی ہیں، حارج بننے والی ہیں، ان سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ ان کاموں سے اللہ نہیں ملے گا اور جو چیزیں ایسی ہیں کہ مانع بھی نہیں اور حارج بھی نہیں وہ فضول اور بیکار ہیں، ان کو اپنی دنیوی ضرورت کے لئے اختیار کرے تو ٹھیک ہے، اور جو چیزیں اللہ کے راستے میں مفید ہیں، معین ہیں، مددگار ہیں، ان کو اختیار کرنے کا حکم ہے۔

لیکن ان میں بھی اس بات کا خیال و دھیان چاہئے کہ اصل مقصود اللہ کی ذات ہے، اور یہ دیگر چیزیں اگر چہ کہ اللہ کے راستے میں مفید و معین ہیں مگر ان کا درجہ ثانوی درجہ ہے، ان کو اولین درجہ دینا صحیح نہیں ہے۔

حضرت نبی ﷺ کی ذمہ داریاں

دیکھئے ،حضرت نبی اکرم ﷺ پر بہت ساری دینی و نبوی ذمہ داریاں تھیں: دعوت الی اللہ کی ذمہ داری،تبلیغ احکام کی ذمہ داری،لوگوں کو سمجھانے وافہام وتفہیم کی ذمہ داری ،قرآن پڑھانے کی ذمہ داری ، جہاد کی ذمہ داری ،تعلیم کی ذمہ داری ، اصلاح احوال کی ذمہ داری ،وغیرہ۔ان میں بھی سب سے اہم ذمہ داری جس کے لیے نبوت دے کر نبی کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے،وہ ہے دعوت الی اللہ ،لوگوں کو اللہ کا پیغام کو پہنچانا۔یہ سب سے اہم ذمہ داری ہوتی ہے نبی کی اور یہ بالکل واضح وظاہر ہے کہ یہ سب اعمال دراصل اللہ کی جانب سے آپ پر عائد تھیں اوران کو ادا کرنے پر ضرور بالضرور قرب خداوندی بھی نصیب ہوتا ہے ،مگر ان تمام ذمہ داریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آپ سے کہا ہے کہ اے نبی! جب آپ ان کاموں سے،ان ذمہ داریوں سے فارغ ہوجائیں تو پھر عبادت کے لیے تیار ہوجایئے اور پھر اپنے ہی رب کو دیکھئے ،کسی اور کو نہ دیکھئے ،اپنے رب ہی کی طرف توجہ کیجئے ،کسی اور کو دھیان میں نہ لایئے ،اپنے پروردگار ہی کی جانب رغبت کیجئے ،کسی اور طرف رغبت والتفات ہی نہ کیجئے ۔تو اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سبجیکٹ {Subject} کیا ہے؟اس آیت کا،اس آیت کی تھیم {Theme} کیا ہے؟اس آیت کا مقصود اعظم کیا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود اس کا یہی ہے کہ اللہ کی ذات کو مقصود بنایا جائے اور دیگر چیزوں کو ثانوی درجہ دیا جائے۔

دینی اعمال کی دو قسمیں

دنیا کے کام تو بہ ہر حال دنیا کے کام ہیں،ان کا تو کیا ذکر! میں کہتا ہوں کہ جو دینی کام واعمال ہیں،ان کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں:ایک دینی عمل وہ ہے جو مقصود

بالذات ہوتا ہے، دوسرا وہ دینی عمل ہے جو مقصود بالعرض ہوتا ہے، یعنی خود مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ جیسے علماء نے عبادت کی دو قسمیں بتائی ہیں: ایک عبادت مقصودہ، جیسے نماز، روزہ، حج وزکاۃ، اور دوسری عبادت غیر مقصودہ، جیسے وضو، غسل، مسجد میں داخل ہونا، قرآن پاک کو چھونا، وغیرہ، یہ دونوں قسم کے اعمال عبادتیں تو ہیں، لیکن ان کے اندر ایک بڑا فرق ہے کہ ان میں سے ایک عبادتِ مقصودہ ہے، اور دوسری عبادتِ غیر مقصودہ ہے۔

مقصودہ عبادات کی مثال جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ، قربانی، تلاوت، ذکر، یہ سب عبادتیں وہ ہیں جو شریعت میں مقصود بالذات ہیں یعنی بذات خود وہی مقصود ہیں اور کچھ عبادتیں ایسی ہوتی ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہوتیں، بلکہ وہ کسی عبادت مقصودہ کا ذریعہ یا وسیلہ ہونے کی وجہ سے مقصود ہوتی ہیں۔

جیسے مثال کے طور پر وضو عبادت ہے، بہت بڑی عبادت ہے، بہت بڑا ثواب ہے اس کا، لیکن اس کے باوجود علماء نے لکھا ہے کہ یہ عبادت غیر مقصود عبادت ہے، یعنی خود وضو کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ وضو کا مقصود یہ ہے کہ وضو کرنے کے بعد نماز پڑھ لیں، وضو کرنے کے بعد ذکر کر لیں، وضو کرنے کے بعد تلاوت کر لیں، وضو کرنے کے بعد کوئی اور عبادت کر لیں۔ دیگر عبادات مقصودہ کے لیے اس کو وسیلہ اور ذریعہ قرار دیا گیا ہے، وضو بالذات کوئی عبادت نہیں ہے، بلکہ بالتبع وبالعرض عبادت ہے۔

اسی طریقے سے ہمارے اعمال کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک اعمال مقصودہ، ایک اعمال غیر مقصودہ۔ اعمال مقصودہ میں عبادات نماز روزہ، زکاۃ وحج، اوراذ کار وغیرہ ہیں، یہ سب اعمال اسلام میں بذات خود مقصود ہیں۔

اور کچھ اعمال ایسے ہیں جو بذات خود مقصود نہیں ہیں، جیسے درس وتدریس خود مقصود نہیں ہے، تصنیف وتالیف خود مقصود نہیں ہے، دعوت وتبلیغ خود مقصود نہیں ہے،

بلکہ یہ سب ایک مقصود کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، مقصود کیا ہے؟ دین وعلم دین کی حفاظت اور دوسرے لوگوں کو دین پر جما دینا وغیرہ ہے، اس کے لیے یہ درس وتدریس ووعظ و نصیحت، تقریر وتحریر، تصنیف وتالیف وغیرہ واسطہ ہیں، ذریعہ ہیں، وسیلہ ہیں۔

غیر مقصود کو مقصود کا درجہ دینا بدعت ہے

بھائیو! جب آپ نے اعمال مقصودہ اور غیر مقصودہ کو سمجھ لیا تو اب ان کے بارے میں ایک اصول سمجھ لیجئے۔ وہ یہ کہ غیر مقصود عبادت کو مقصود عبادت کا درجہ دے دینا بدعت اور مکروہ ہے۔ آپ کہیں گے دلیل کیا ہے؟ ہمارے لیے بہت بڑی دلیل حضرات فقہاء کا کلام ہے، اس لیے کہ حضرات فقہاء دین کو زیادہ سمجھتے ہیں، حضرات فقہاء کو اللہ تعالیٰ تفقہ فی الدین سے نوازتا ہے، اس وجہ سے ان کی بات ہمارے لیے کافی ہے۔

چنانچہ فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ وضو کرنے کے بعد کسی عبادت مقصودہ کے انجام دیئے بغیر دوبارہ وضو کرنا بدعت اور مکروہ ہے۔ آپ وضو کر کے آئے، نماز نہیں پڑھی، ذکر بھی نہیں کیا، تلاوت بھی نہیں کیا، کوئی عبادت نہیں کی، پھر چلے گئے وضو کرنے کے لیے، پھر جی چاہا کہ چلو ایک دفعہ اور وضو کریں، بہت بڑا ثواب ہے، اس سے گناہ بھی جھڑ جاتے ہیں، اس لیے ایک دفعہ اور کر لو تو فقہاء لکھتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے، بدعت ہے؛ کیوں؟ اس لیے کہ وضو مقصودہ عبادت نہیں ہے، اور غیر مقصود عبادت کو مقصود عبادت کا درجہ دے دینا بدعت ہے۔

حاشیہ: (قال الإمام البغوی ناقلا عن الإمام أحمد في شرح السنة : " و تجديد الوضو مستحب إذا كان قد صلى بالوضوء الأول صلاة و كرهه قوم إذا لم يكن قد صلى بالوضوء الأول صلاة فرضا أو نفلا " (شرح السنة: ٤٤٩/١، مرقاة المفاتيح: ٢٢٥/٢، رد المحتار شامی: ١/ ١٢٩)

اب یہاں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس طرح عبادت غیر مقصودہ کو عبادت مقصودہ کا درجہ دینا بدعت و مکروہ ہے، اسی طرح اعمال غیر مقصودہ کو اعمال مقصودہ کا درجہ دے دینا بھی بدعت ہے، اور اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اعمال غیر مقصودہ ہی کے پیچھے پڑ جائے کہ اسی کو بار بار کرنے لگے اور اعمال غیر مقصودہ میں اس قدر مصروف ہو جائے کہ اسے اعمال مقصودہ کو انجام دینے کا موقعہ ہی نہ ملتا ہو یا وہ خود ان کو اس اہتمام سے نہ ادا کرتا ہو، اور غیر مقصود اعمال کو ہی سب کچھ سمجھتا ہو تو یہ بھی ایک بدعت ہے، بلکہ شیطان کا بہت بڑا دھوکہ ہے کیونکہ شیطان یہ چاہتا ہے کہ آدمی اگر گناہ میں نہیں تو کم از کم اعمال غیر مقصودہ ہی میں لگا رہے، اور اعمال مقصودہ کو ادا نہ کر سکے۔

اس آدمی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی صرف وضو ہی کرتا رہے، اور نماز نہ پڑھتا ہو، ذکر نہ کرتا ہو، تلاوت نہ کرتا ہو۔ اسی طرح جو لوگ اعمال غیر مقصودہ جیسے درس و تدریس، وعظ و بیان، تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ میں لگے رہتے ہیں اور نماز و ذکر وغیرہ کی طرف دھیان نہیں دیتے یا ان کو اچھی طرح ادا نہیں کرتے وہ بھی یوں سمجھیں کہ صرف وضو پر وضو کر رہے ہیں، اور نماز ہی نہیں پڑھتے۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ اسی فرق کو اور اسی نکتہ کو بتانا چاہتے ہیں کہ اعمال غیر مقصودہ کو ان کے درجہ پر رکھا جائے اور اعمال مقصودہ کو ان کا درجہ دیا جائے۔

اعمال مقصودہ کا درجہ بدلنے کا انجام

آج افسوس ہے کہ امت کا ایک طبقہ جہالت کی وجہ سے اعمال مقصودہ اور غیر مقصودہ میں فرق نہیں کر پاتا، اور ایک دوسرا طبقہ ہے جو اس کو جاننے کے باوجود اس کی طرف توجہ نہیں کرتا اور شیطانی دھوکہ میں پھنس جاتا ہے۔

اس صورت حال کا انجام و نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال مقصودہ کو نہ صحیح طریقے پر ادا

کرتا ہے اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے؛ کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ جب آدمی کسی چیز کو مقصود بناتا و سمجھتا ہے تو اس کا ایک اثر ہوتا ہے دماغ پر، دل پر اور اسی کے ساتھ جذبات اور خیالات پر کہ آدمی اس کام کو عمدہ طریقہ پر، پوری دلجمعی کے ساتھ ادا کرتا ہے، اور اس کام کو ادا کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ دوسرے تمام کاموں سے جلدی جلدی فارغ ہو جائے اور پھر اس اصل و مقصود کام میں لگ جائے۔

اور اگر خدانخواستہ معاملہ الٹا ہو کہ مقصود کام کو غیر مقصود سمجھ لیا مثلاً مقصود ہے اللہ کو پانا، ایک آدمی نے اس کے خلاف درس و تدریس کو اپنی زندگی کا مقصود بنالیا، تو اب وہ کیا کرے گا؟ نماز جلدی جلدی سے پڑھے گا، اور درس و تدریس کے لیے تیاری کرے گا، ایک آدمی تصنیف و تالیف کو مقصود بنالیا کہ میری زندگی کا مقصود ہے تصنیف و تالیف، تو اب اسے نماز میں مزہ نہیں آئے گا، توجہ نہیں رہے گی، دل اس میں نہیں لگے گا، دل کہے گا جلدی جلدی نماز پڑھو، یہ کہاں کی مصیبت ہے، جلدی یہاں سے نمٹو اور جا کر اپنا وہ کام کرو، اور پھر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جائے گا، کیوں؟ یہ سب دراصل اسی خیال کا اثر ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل کو اصل اور غیر اصل کو غیر اصل سمجھنا چاہئے، اگر اس کا الٹا ہوا تو نتائج غلط سامنے آئیں گے۔

خواص بھی غلطی میں مبتلا

مگر افسوس کہ اس مسئلہ میں عوام تو عوام خواص بھی غلطی میں مبتلا ہیں، اور عام طور پر اس میں غلطی ہو رہی ہے اور مقصود کو غیر مقصود، غیر مقصود کو مقصود بنا لینے کی وجہ سے جو مقصود چیز ہے، اس کو تو جلدی جلدی نمٹاتے ہیں اور اپنے دوسرے کاموں کے اندر مشغول ہو جاتے ہیں۔ جو عوام ہیں وہ تو مقصود حیات نماز وغیرہ کو ٹال کر دنیا کے کاموں میں لگ جاتے ہیں، تجارت میں، بیوی بچوں میں وغیرہ، اور جو حضرات

خواص علماء وطلبہ ہیں وہ بھی مقصود عبادات کو جلدی جلدی ادا کر کے درس وتدریس و تقریر وتحریر، دعوت وتبلیغ وغیرہ میں لگ جاتے ہیں۔

چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:

مثلاً ایک صاحب کسی جامعہ ومدرسہ میں استاذ ومدرس ہیں، وہ سمجھ رہے ہیں کہ مجھے درس بڑا شاندار دینا ہے، اس کے لیے بہت مطالعہ کرنا ہے اور اس میں یہ رموز اور اسرار منکشف کرنا ہے، یا عجیب وغریب تحقیقات سامنے لانا ہے، محیر العقول باتیں پیش کرنا ہے اور یہی میری زندگی کا اصل کام ہے، مقصود حیات ہے۔ جب ان کے دماغ میں یہ سما گیا تو اب ان کو کہاں مزہ آئے گا نماز پڑھنے میں، ان کا دل کہے گا نماز جلدی سے پڑھو، الٹی سیدھی نمٹاؤ، سجدہ کرو جلدی سے، رکوع کرو جلدی سے، تلاوت کرو جلدی سے، تمام ارکان کو جلدی سے ادا کرو، اور پھر اپنے اصل کام ومقصود کام کے اندر لگ جاؤ۔ کیوں ایسا ہوا؟ اس لیے ہوا کہ انھوں نے اسکو مقصود سمجھا جس کو غیر مقصود سمجھنا چاہئے۔

دوسری مثال لیجئے کہ ایک طالب علم نماز کو جلدی جلدی نمٹاتا ہے، رکوع اور سجدے تو بس مرغی کی ٹھونگ کی طرح ادا ہو رہے ہیں؛ کیوں؟ اس لئے کہ اس کے دماغ میں سمایا ہے کہ اصل کام اس کا یہ ہے کہ اسے تکرار کرنا ہے، سبق یاد کرنا ہے، بڑا عالم بننا ہے، اور عربی ادب میں مہارت پیدا کرنا ہے، فقہ وحدیث کا ماہر بننا ہے، اور یہی زندگی کا مقصود ہے۔ اس خیال کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اس کو نماز میں ذکر میں ،تلاوت میں، کوئی لطف نہیں آتا، بلکہ وہ نماز کو بھی بس سر سے ٹلانے پڑھتا ہے، دل سے نہیں پڑھتا۔

حالانکہ غور کیجئے کہ مدرسہ اس لئے کھولا گیا تھا تاکہ طلبہ خشوع خضوع والی نماز سیکھیں، عالم اس لئے بنایا جارہا تھا کہ وہ ذاکر بنے، ورنہ تو لغت کا عالم بنانا مقصود

نہیں تھا، بالفاظ دیگر اسے عارف بنانا مقصود تھا، اس لئے عالم بنایا جارہا تھا، اور یہ طالب علم ہے کہ اسی علم میں اٹک کر رہ گیا، آگے جو مقصود تھا وہاں تک پہونچا ہی نہیں اس کی وجہ بھی وہی ہے کہ مقصود اور غیر مقصود کی تمیز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور مثال عوام کے اعتبار سے سن لیجئے کہ آج کل عموماً اور اہل بنگلور میں خصوصاً ایک بہت بڑی بیماری یہ چل رہی ہے کہ لوگ صرف بیانات سننے لگے ہیں، آج کسی کا بیان ہے تو کل کسی کا بیان ہے، صبح کسی کا بیان ہے تو شام میں کسی کا بیان ہے اور لوگوں کو بیان سننے کے علاوہ آگے کچھ عملی اقدام کرنا ہی نہیں ہے۔

اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ بیان جو کہ غیر مقصود عبادت ہے، اسے مقصودہ کا درجہ دے دیا گیا اور اس میں ایسا لگ گئے کہ مقصودہ اعمال فوت ہو رہے ہیں، رات دیر تک جلسوں میں مشغول ہو کر فجر کی نماز ترک ہو رہی ہے، مگر اس کا کوئی احساس بھی نہیں، بتاؤ کہ یہ شیطانی دھوکہ نہیں تو اور کیا ہے؟

الغرض اس طرح آپ غور کرتے چلے جائیں تو آپ کو ایسے بہت سے دیندار ملیں گے جو دین کے ان کاموں کو جن کا درجہ اعمال مقصودہ کا نہیں تھا ان میں ایسے منہمک ہو گئے ہیں کہ اعمال مقصودہ کو بھول گئے ہیں۔

یہ ایک عظیم غلطی ہے جو آج کے ماحول میں ہو رہی ہے۔ بڑوں سے، چھوٹوں سے اور علماء سے، مفتیوں سے، حدیث پڑھانے والوں سے۔ اللہ حفاظت فرمائے۔

امام اعظم ابوحنیفہ نے اللہ کو مقصود بنایا

ہمارے اکابرین ایسے تھے درس بھی، تدریس بھی، تبلیغ بھی، دعوت بھی، اور تصنیف بھی، تالیف بھی، تحقیق بھی، مطالعہ بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ اللہ کے لیے اتنا بڑا حصہ کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

امام اعظم ابوحنیفہ دن بھر درس وتدریس، مسائل کا استنباط اور استخراج، قرآن میں حدیث میں غور وفکر، تدبر وتفکر، فقہ کی ترتیب وغیرہ میں مصروف رہتے اور جب شام ہوتی، عشاء کا وقت ہوتا، لوگ عشاء پڑھ کر چلے جاتے تو امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نماز کے لئے رکعت باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور یہ رکعتوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، یہاں تک کہ فجر کا وقت ہو جاتا تھا۔

شروع شروع میں سو رکعت نماز پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن کہیں جا رہے تھے، راستہ میں ایک شخص نے ایک اپنے ساتھی سے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کو دکھا کر آہستہ سے کہا کہ یہ جو بزرگ جا رہے ہیں، یہ روزانہ پانچ سو رکعت پڑھا کرتے ہیں۔ وہ تو آہستہ سے کہہ رہا تھا لیکن امام صاحب کے کانوں میں اس کی آواز پہنچ گئی۔ امام صاحب نے کہا کہ اللہ اکبر! یہ میرے بارے میں یہ خیال رکھتا ہے کہ میں پانچ سو رکعت روزانہ پڑھتا ہوں جب کہ میں صرف سو ہی رکعت پڑھتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں قرآن کی اس آیت کا مصداق بن جاؤں: ﴿وَيُحِبُّوْنَ أَنْ يُحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا﴾ (اور وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسی بات پر جو انھوں نے نہیں کی)

اگر میں اس کا مصداق بن جاؤں تو کیا ہوگا؟ جہنم کی سزا ہوگی۔ امام صاحب نے کہا کہ لوگ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ میں پانچ سو رکعت پڑھا کرتا ہوں تو میں آج سے پانچ سو رکعت پڑھا کروں گا۔ اور اس کے بعد سے آپ کا یہی معمول ہو گیا۔

پھر اس کے بعد ایسا ہی واقعہ ہوا کہ ایک دفعہ جا رہے تھے تو کسی آدمی نے امام ابوحنیفہ کو دکھا کر کہا کہ یہ بزرگ روزانہ ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے ہیں، حالانکہ اس وقت پانچ سو رکعت پڑھتے تھے۔ امام صاحب نے اس کی یہ بات سن لی، اور کہا کہ

اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ہزار رکعات پڑھتا ہوں حالانکہ میں صرف پانچ سو پڑھتا ہوں تو مجھے اللہ کے سامنے جواب دینا ہوگا، اس لیے میں آج سے ہزار رکعت نماز پڑھوں گا۔اور زندگی بھر یہی معمول رہا، کتابوں کے اندر لکھا ہے کہ چالیس برس تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی ،آپ کی پوری پوری رات عبادت کے اندر گزر جاتی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کا عجیب حال تھا۔دیکھئے کس طرح اللہ کو مقصود بنا کر زندگی گذاری جاتی ہے۔لہذا پڑھو،لکھو، تحقیق کرو، مطالعہ کرو، اور لوگوں کے لیے نیک کام کرو، ہمدردی اور غمخواری کے کام بھی کرو، دعوت وتبلیغ کے کام بھی کرو، لوگوں کو نصیحت کرو، عبرت کی باتیں بتاؤ، اللہ کی طرف ان کو متوجہ کرو، لیکن ان ساری چیزوں کے ساتھ کبھی اس کو نہ بھولو کہ میں پیدا ہی ہوا ہوں اپنے رب کے لیے۔وہی مقصود ہے، وہی مطلوب۔

امام اوزاعی کی عبادت کا تذکرہ

حضرت امام اوزاعی بہت بڑے عالم تھے، مجتہد تھے اور ان کا بھی مسلک بہت زمانے تک دنیا میں چلتا رہا تھا، جیسے امام ابو حنیفہ کا، امام شافعی کا، امام مالک کا، امام احمد بن حنبل کا مسلک آج چل رہا ہے۔اسی طرح امام اوزاعی رحمۃ اللہ کا بھی مسلک چلتا تھا، لیکن جب ائمہ اربعہ کا مسلک بہت آگے بڑھ گیا، لوگوں کے اندر اس کو مقبولیت ہوگئی تو پھر دوسرے ائمہ کے ماننے والے ختم ہوگئے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی بہت بڑے مجتہد وامام تھے۔

ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ فجر کے بعد ان کے گھر پر پڑوس کی ایک

عورت آئی، امام اوزاعی گھر میں موجود نہیں تھے، چھوٹا سا گھر تھا، ایک طرف مصلی بچھا ہوا تھا، ایک طرف حضرت کی اہلیہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ عورت آ کر ان کے بازو بیٹھ گئی اور کچھ باتیں کرنے لگی، اتنے میں اس کی نظر مصلی پر پڑی تو وہ عورت حضرت کی اہلیہ سے کہنے لگی: اماں جان! یہ دیکھئے، مصلی بھیگا ہوا ہے، اس پر کسی بچے نے پیشاب کر دیا ہوگا۔

حضرت کی اہلیہ نے کہا کہ ہمارے یہاں تو کوئی بچہ ہے نہیں، ہم بوڑھا بوڑھی دو ہی آدمی یہاں رہتے ہیں، ہمارے یہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔ اس عورت نے کہا کہ: اگر بچہ نہیں ہے تو پھر پانی پڑ گیا ہوگا، یہ دیکھئے مصلی بھیگا ہوا ہے، تو حضرت کی اہلیہ نے مصلی پر اپنا ہاتھ پھیرا تو اس کے اوپر نمی تھی، یہ دیکھ کر کہا کہ یہ نہ پیشاب کی نمی ہے نہ ہی پانی کی نمی ہے، بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے حضرت پوری رات اس مصلی پر روتے رہتے ہیں، وہ تری ان کے آنسوؤں کی وجہ سے ہے جو تم کو نظر آ رہی ہے۔

حضرت مرۃ ہمدانی کی عبادت

اسی طرح حضرت مرہ بن شرحبیل ہمدانی بہت بڑے عالم گزرے ہیں، تابعی ہیں، قرآن کی تفسیر میں ان کا ذکر کثرت کے ساتھ آتا ہے، ان کی عبادت و ریاضت کے بارے میں بہت سے عجیب باتیں منقول ہیں، حضرت حارث الغنوی کہتے ہیں کہ انھوں نے ایسا سجدہ کیا کہ زمین کی مٹی ان کی پیشانی کو کھا گئی۔ روزانہ چھ سو یا ایک ہزار رکعات پڑھا کرتے تھے، حضرت علاء بن عبد الکریم کہتے ہیں کہ ہم ان کی خدمت میں آتے تو ان کے چہرے اور ہاتھ پیر پر سجدے کا اثر نظر آتا، وہ کچھ دیر ہمارے ساتھ بیٹھتے پھر کھڑے ہو جاتے اور بس نماز پڑھتے رہتے۔ (سیر اعلام النبلاء: ۴/۷۵، حلیۃ الاولیاء: ۴/۱۶۵)

محمد بن کعب قرظی کا ذکر خیر

ایک بزرگ محمد بن کعب القرظی کا ذکر بھی سنتے چلئے ، وہ بھی بہت بڑے عالم تھے، تابعی تھے، بہت سے صحابہ سے علم حاصل کیا تھا، بہت متقی واللہ والے تھے، انکی عبادت وآہ وبکا کا حال یہ تھا کہ رات بھر عبادت وریاضت کے ساتھ روتے رہتے تھے، بڑے بے چین ومضطرب نظر آتے تھے، ان کی والدہ نے ایک باران سے کہا کہ بیٹا! اگر میں نے بچپن سے اب تک تجھے نیک وپرہیزگار نہ دیکھتی تو تیرا یہ رونا دھونا دیکھ کر کہتی کہ کوئی بڑا گناہ تجھ سے ہوگیا ہے، اس لئے تو ایسا روتا ہے۔ اس پر حضرت محمد بن کعب نے کہا کہ اے اماں! ہوسکتا ہے کہ اللہ نے مجھے اس وقت دیکھ لیا ہو جبکہ میں کسی گناہ میں مبتلا تھا اور وہ مجھ سے یوں کہہ سکتا ہے کہ جا میں تیری مغفرت نہیں کروں گا۔ (صفة الصفوة:۱۳۲/۲، سیر اعلام النبلاء:۶۵/۵)

بھائیو! یہ تھے ہمارے اسلاف، جو ایک طرف علم کا پہاڑ وسمندر تھے اور علم کی نشر واشاعت ودعوت وتبلیغ، درس وتدریس میں لگے ہوئے تھے تو دوسری جانب ان کی راتیں ایسی ہوتی تھیں، عبادت وریاضت کا یہ حال تھا۔ اسی لئے امام شافعی کا قول کئی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ میں علماء کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ایک وقت اپنا محض اللہ کے لیے خاص کر کے رکھیں: ''والی ربك فارغب'' والا معاملہ ہے۔

عالم کا کردار حضرت ابن مسعودؓ کی نظر میں

اسی لیے حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعودؓ نے عالم کا کردار کیا ہونا چاہئے اس کے بارے میں فرمایا تھا:

'' ینبغي لقارئ القرآن أن یعرف بلیله إذا الناس نائمون ، وبنهاره إذاالناس مستیقظون ، وببکائه إذا الناس یضحکون ، وبصمته إذا الناس

یخوضون ، وبخضوعه إذا الناس یختالون ، وبحزنه إذا الناس یفرحون“
(قاری یعنی عالم قرآن کے لئے مناسب ہے کہ وہ اپنی رات سے پہچانا جائے جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں، اور اپنے دن سے پہچانا جائے جب کہ لوگ بیدار ہوں، اور اپنے رونے سے پہچانا جائے جب کہ لوگ ہنس رہے ہوں اور اپنی خاموشی سے پہچانا جائے جب کہ لوگ بحثا بحثی کررہے ہوں اور اپنی تواضع سے پہچانا جائے جب کہ لوگ ڈینگیں مار رہے ہوں اور اپنے غم سے پہچانا جائے جب کہ لوگ خوشیاں منا رہے ہوں)(مقدمہ تفسیر قرطبی)

اس میں حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ قاریٔ قرآن کے لیے، عالم دین کے لیے، دین کو سمجھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ رات اس طرح گزارے کہ رات سے اس کی پہچان ہو، جب ساری دنیا سورہی ہو تو یہ اٹھ کر پڑھ رہا ہو، بیدار رہ کر اللہ کو پکار رہا ہو، نماز پڑھ رہا ہو، دعا مانگ رہا ہو، اللہ کے سامنے گڑگڑا رہا ہو۔

یہ اس کی ادا ہونی چاہئے۔ آج لوگ اسکو بھول گئے ،اس سے بالکل غافل ہوگئے ،عوام بھی بھول گئے ،علماء بھی بھول گئے ،طلبہ بھی بھول گئے ، مدرسین بھی بھول گئے ، ان کو یاد ہی نہیں رہا کہ یہ بھی کوئی سبجکٹ Subject ہے ہماری زندگی کا، جو ہمارے لیے انتہائی ضروری ہے، بلکہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔

کوشش کر کے تو دیکھو

آج لوگ کہتے ہیں کہ بڑوں کی اتباع کرنا اور ان کے نقش قدم پر چلنا ،اللہ کو مقصود بنا کر زندگی گذارنا مشکل ہے، نماز کو پوری توجہ سے پڑھنا مشکل ہے۔

ہم صرف کہتے ہیں، کوشش نہیں کرتے ،کوشش کریں تو ضرور ہوسکتا ہے۔
دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ جو حضرت تھانویؒ کے

استاذ ہیں اوردارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے ناظم تعلیمات تھے،صدر المدرس بھی تھے۔وہ درس دے رہے تھے،دوران درس جب یہ حدیث آئی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:''**من توضأ وضوئي هذا ثم يصلي ركعتين لا يحدث فيهما بشيء إلا غفر له ما تقدم من ذنبه**''(جوآدمی میرے وضوکی طرح وضوکرے پھرایسی دورکعتیں پڑھے جس کے اندرکوئی وسوسہ،کوئی خیال نہ آئے تواس کے پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں)(بخاری:۱۹۳۴،مسلم:مشکاۃ:۲۸۷)

حضرت مولانا یعقوب صاحب نے اس کی تشریح فرماتے ہوئے کہا کہ ایسی نماز پڑھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔توایک طالب علم نے اٹھ کر پوچھا کہ حضرت!ایسا ہوبھی سکتا ہے کہ ہم بغیر وسوسے کے نماز پڑھیں؟تواس پرحضرت مولانا یعقوب صاحبؒ نے فرمایا کہ پوچھتے ہی رہوگے یاکبھی کروگے بھی۔

اس کے بعد کہا کہ کرکے دیکھو کیوں نہیں ہوتا،اگرنہ ہونے والی بات ہوتی تواللہ کے نبی ﷺ کیوں کہتے،کیااللہ کے نبی ﷺ نہ کی جانے والی بات بتانے کے لیےآئے تھے؟معلوم ہوا کہ انسان میں اسکی طاقت ہے،اسی لیےاللہ کے نبی نے فرمایا۔

لہذاکوشش کرنا ہمارے ذمہ ہے،محنت کرنا ہمارے ذمہ ہے،جب مجاہدہ کریں گےتواللہ تعالی راہیں کھولیں گے۔آج ہمارا حال یہ ہوگیا کہ ہم دنیا کے لئے تو بہت مجاہدہ کرتے ہیں،لیکن اللہ کومقصودزندگی بنانے کے لئے مجاہدہ نہیں کرتے۔

کیا دنیا مقصود زندگی ہے کہ جس کے لئے ہم مجاہدہ کریں،کیااللہ کی ذات غیرمقصود ہے؟کیا بیوی بچے مقصودِزندگی ہیں؟کیا کھانا پینا مقصودِزندگی ہے؟کیا تجارت اورمنڈیاں مقصودِزندگی ہیں؟کیادرس وتدریس مقصودِزندگی ہے؟تصنیف وتالیف مقصودزندگی ہے؟نہیں ہرگزنہیں،مومن کامقصودزندگی اللہ کی ذات ہے۔

یہی ہے آیت کا مقصود اور مطلوب جس کو میں سمجھانا چاہتا ہوں کہ اپنے تمام کاموں میں تفریق کریں، تقسیم کریں کہ کون سا کام محض دنیا کا ہے اور کون سا کام مقصود بالغیر ہے اور کونسا کام مقصود بالذات ہے، ان کے بارے میں اسی کے جیسا معاملہ کریں جیسے کہ ان کے ساتھ معاملہ ہونا چاہئے۔ اگر معاملہ ایسا نہیں ہو رہا ہے تو بھائی! ہم غلطی میں ہیں، اللہ کی اس آیت کی خلاف ورزی میں مبتلا ہیں۔

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالی ہم سب کو اللہ ہی کو مقصود زندگی بنا کر زندگی گذارنے کی توفیق عطاء فرمائے۔

نماز کو نماز کیسے بنائیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نماز کو نماز کیسے بنائیں

نشانِ سجود تیری جبیں پر ہوا تو کیا
کوئی ایسا سجدہ کر کہ زمیں پر نشاں رہے

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . أما بعد

فقد قال اللّٰہ تعالی فی القرآن الکریم

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾
(العنکبوت:۴۵)

محترم دینی بھائیو!

عبادتوں میں سب سے اہم ترین عبادت نماز ہے، مگر آج اس کے اندر بڑی کمی وکوتاہی آگئی ہے، حالانکہ نماز ہی کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں، اور ہم نماز کے علاوہ سارے کام کر رہے ہیں، تو اس کی مثال ایسی ہوئی کہ کسی آدمی کو ایک اسکول میں ٹیچر و استاذ کے عہدے پر مقرر کیا گیا لیکن وہ سارے اپنے دھندے کرتا ہے، سوائے ٹیچری کے۔ آپ بتائیے کہ اسے تنخواہ ملے گی؟ اور اسکو برداشت کیا جائے گا؟ اسی طرح ایک آدمی کو ایک فیکٹری میں اس لئے لیا گیا کہ فیکٹری میں کچھ چیزیں بنانے کی

ہوتی ہیں تو اس سلسلے میں کام کرے اور وہ آدمی ہے کہ سب کچھ کرتا ہے لیکن وہ کام نہیں کرتا جس کے لئے اسے مقرر کیا گیا ہے۔

آج ہم لوگوں کا ایسا ہی حال ہوگیا ہے کہ ہم پیدا ہی کئے گئے اس لئے کہ ہم اللہ کی عبادت کریں اور عبادت میں سب سے اہم ترین عبادت نماز ہے، لیکن ہم وہی عمل کرنا نہیں چاہتے۔ہم کھانا چاہتے ہیں، پینا چاہتے ہیں، رہنا چاہتے ہیں، آرام وآسائش چاہتے ہیں، دنیا کی سب چیزیں کرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن جس کے لئے پیدا کئے گئے اسی کے لئے تیار نہیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ہم سب بڑی غفلت میں مبتلا ہیں۔

بدترین چور

نماز کے بارے میں ایک تو وہ لوگ ہیں جو نماز ہی نہیں پڑھتے۔دوسرے وہ جو نماز تو پڑھتے ہیں لیکن نماز کو نماز کے جیسا نہیں پڑھتے، حالانکہ نماز کو نماز کے جیسا پڑھنا چاہئے۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:" أسرق الناس سرقاً الذی یسرق من صلاته " (لوگوں میں بدترین قسم کا چور وہ ہے جو نماز میں چوری کرتا ہے) صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ نماز میں چوری کیسے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ نماز میں چوری یہ ہے کہ اس کا رکوع وسجدہ ٹھیک نہ ہو۔(المعجم الکبیر للطبرانی :۳۵۲۳، مجمع الزوائد :۲۷۲۲)

ایک حدیث میں فرمایا مرغی جیسا ٹھونگ مارتی ہے ایسا سجدہ نہ کرو یہ اللہ کو اور اللہ کے نبی ﷺ کو سخت ناپسند ہے۔(معجم الأوسط للطبرانی:٦١٦٠)

ایک آدمی ایک کام کرے لیکن اس طرح نہ کرے جیسے کہ کرنا چاہئے تو اس کام کا

کوئی اعتبار نہیں ہوا کرتا، دنیا کا کوئی بھی کام ہو جب اس کے اصول وقوانین، اس کے قواعد وضوابط اور اس کے لوازمات اور اسکے طور وطریقے اور مالہ وماعلیہ کے ساتھ اس کام کو کیا جاتا ہے تو تب سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام ادا ہو گیا اور اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو سمجھا جاتا ہے کہ وہ کام نہیں ہوا۔

اسی سے آپ سمجھ لیجئے کہ نماز کو نماز کے اصول وقوانین کے مطابق نہ پڑھے تو وہ نماز نماز نہیں ہے۔ قرآن کریم کے اندر اللہ تعالی نے نماز کے کچھ آثار اور نماز پر مرتب ہونے والے ثمرات کو بیان کیا ہے، اسی طرح قرآن وحدیث میں غور کرنے سے ہمیں نماز کو نماز بنانے اور نماز میں خشوع خضوع پیدا کرنے کے طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے میں نے ارداہ کیا کہ آپ کے سامنے نماز کے بارے میں کچھ اہم اہم چیزیں بیان کی جائیں جس سے کہ ہم اپنی نماز کو نماز بنانے میں کامیاب ہو سکیں اور اگر کامیاب نہ بھی ہوئے تو کوشش ضرور کریں اور کوشش کرنا ہی دراصل کامیابی ہے۔

لیکن اس وقت میرا مقصود نماز کے فقہی مسائل اور نماز کے سنن ومستحبات اور فرائض وواجبات کو ذکر کرنا نہیں ہے، بلکہ نماز کی کیفیات اور احوال کو بیان کرنا ہے۔

معروف اور منکر کے معنی

میں نے آپ کے سامنے یہ آیت پڑھی ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡھٰی عَنِ الۡفَحۡشَاۗءِ وَالۡمُنۡکَرِ وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَر﴾ (بلاشبہ نماز روکتی ہے، فحش وبے حیائی کے کاموں سے اور منکر یعنی غلط چیز سے)

شریعت میں منکر ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو غلط ہو اور شریعت کے اندر اس کا کوئی جواز نہ ہو، ایسی چیز کا نام شریعت میں منکر ہے اور جو چیز شریعت میں جائز ہے اور

شریعت نے اس کو مشروع کیا ہے، اس کا نام شریعت میں معروف ہے۔

منکر اور معروف کے لغوی معنی دیکھنے کے بعد پھر قرآن میں اسے جس معنی کے لئے استعمال کیا ہے، اس پر غور کرینگے تو واقعی قرآن کریم کی بلاغت کا اندازہ ہوگا۔

عربی زبان میں معروف کے معنی آتے ہیں مشہور کے، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں صاحب بڑے معروف ہیں، تو جو جانا جائے، پہچانا جائے، سب لوگ جانتے ہوں، اس کو کہتے ہیں معروف۔ تو شریعت نے نیکی کا نام معروف رکھ کر یہ بتایا ہے کہ اسلامی معاشرے کے اندر نیکی جانی و پہچانی چیز ہوا کرتی ہے، انجانی کوئی چیز نہیں ہوا کرتی۔ اسی لئے اسلامی معاشرے میں نیکی معروف ہوتی ہے، مشہور ہوتی ہے۔

لیکن آج ہمارے معاشرے میں نیکی، معروف اور جانی پہچانی چیز ہونے کے بجائے انجانی چیز ہوگئی ہے، کہیں کوئی نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے تو لوگ اس کو عجیب نظر سے دیکھیں گے، گویا کہ نہ کرنے کی کوئی چیز کر رہا ہو، اور اگر سگریٹ پھونک رہا ہے تو کوئی نہیں دیکھے گا، ننگا پھر رہا ہے، اسے کوئی نہیں دیکھے گا، اس لئے کہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کوئی اسے معیوب نہیں سمجھے گا۔

لیکن اگر آپ اسٹیشن میں نماز پڑھنے لگیں تو غیر تو غیر اپنے بھی کچھ انجانی نگاہوں سے دیکھیں گے، کیا مطلب ہوا؟ آج ہمارے معاشرے کے اندر معروف چیز معروف نہ رہی حالانکہ وہ تو جانی و پہچانی چیز ہے۔

اور منکر کے معنی آتے ہیں انجانی، جس کو پہچانا نہ جاتا ہو، پتہ نہ ہو کہ کیا چیز ہے؟ اسکا نام ہے اصطلاح شریعت میں منکر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برائی مسلمان معاشرے میں ایک انجانی چیز ہوتی ہے، اس کو کوئی پہچانتا نہیں کہ کیا ہے؟ شراب کو مسلمان نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے؟ جھوٹ وغیبت کو مسلمان سمجھتا ہی نہیں کہ یہ کیا ہے؟

اس لئے کہ اسلامی معاشرے میں اس کا رواج نہیں ہوتا۔

اس میں اللہ نے بتا دیا ہے کہ اسلامی معاشرے میں نیکی تو معروف ہوتی ہے اس لئے اس کا چلن اسلامی معاشرے میں ضرور ہونا چاہئے اور جو چیز غلط وحرام و ناجائز ہے وہ منکر ہے اس لئے اسلامی معاشرے میں یہ انجانی ہونی چاہئے اور لازمی طور پر اس کا چلن بھی معاشرے میں نہ ہونا چاہئے۔

نماز ہمیں برائیوں سے کیوں نہیں روکتی ؟

مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ﴾ (بلاشبہ نماز روکتی ہے، فحش و بے حیائی کے کاموں سے اور منکر یعنی غلط چیز سے) اس سے معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے کے بعد نماز کا یہ اثر مرتب ہونا چاہئے کہ نماز نمازی کو برائیوں سے روکے، ورنہ وہ نماز جب بے حیائی و منکر سے نہیں روکتی تو اللہ تعالی نے یہ کیسے فرما دیا کہ نماز ان سے روکتی ہے؟

یہاں پر ایک سوال علماء نے کھڑا کیا ہے کہ جب نماز ہر فحش و برائی سے روکتی ہے، زنا سے، چوری سے، ڈکیتی سے، جھوٹ سے، دھوکہ بازی سے، غیبت سے، چغلی سے، ظلم زبردستی سے، تو اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ نماز پڑھ رہے ہیں، لیکن جھوٹ بھی بول رہے ہیں، غیبت بھی ان سے جاری ہے، دوسروں کا مال بھی لوٹ رہے ہیں، غصب بھی کر رہے ہیں، حرام کاموں میں بھی مبتلا ہیں، یہ سب ناجائز کام کر رہے ہیں، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب بعض حضرات نے یہ دیا ہے کہ نماز روکتی تو ہے، لیکن لوگ رکتے نہیں، تو اس سے آیت پر کیا اشکال؟ اللہ نے یہ تو نہیں کہا کہ تم رک بھی جاؤ گے۔ نماز ایسی چیز ہے جو روکتی ہے، جیسے مولانا حضرات بہت سے برے کاموں سے روکتے

ہیں، کہ برائی نہ کرو، حرام نہ کرو، لیکن لوگ سن کر نہ مانیں اور الٹا سیدھا کرتے رہیں تو مولانا پر کیا اشکال واعتراض؟

دوسرا جواب جو بہت عمدہ وحقیقت کشا ہے، یہ ہے کہ آیت کا منشأ یہ بتانا ہے کہ نماز اگر واقعی نماز ہو تو بیشک اس کا اثر یہ مرتب ہوگا کہ آدمی واقعی گناہ سے بچنا شروع کر دے گا، لیکن نماز کو پہلے نماز تو بنانا چاہئے، نماز حقیقت میں نماز ہو، اس کے اندر وہ کمال، وہ خشوع، وہ خضوع ہو، اور اخلاص ہو، جب اس طرح نماز پڑھی جائے گی تو اس کا اثر یہی ہوگا کہ جب آدمی برائی کی طرف جانا چاہے گا تو اس کے سامنے نماز آئے گی کہ ابھی تو نماز پڑھ کے آیا ہے، کیا حرکت کرنے جارہا ہے؟ تو یہ آدمی فوراً برائی سے رک جائے گا۔ اس تقریر سے اس سوال کا جواب سامنے آگیا کہ ہماری نماز ہمیں کیوں برائی سے باز نہیں رکھتی؟ معلوم ہوا کہ دراصل ہماری نماز نماز ہی نہیں ہوئی ہے، اگر نماز نماز ہو جائے تو اس کا یہ اثر ضرور مرتب وظاہر ہوگا۔

ایک عبرت ناک حدیث

اور نماز کا یہ اثر مرتب ہونا نماز کے نماز ہونے کی علامت ہے، اور اگر یہ اثر اس کا نہ مرتب ہو تو اس پر حدیث میں وعید آئی ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

”مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلَاتُهُ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْفَحْشَاءِ لَمْ يَزْدَدْ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا بُعْداً“

(جس آدمی کی نماز اسے برائی وبے حیائی سے نہ روکے تو اس کی یہ نماز اللہ سے دوری میں اضافہ کا ذریعہ ہوگی) (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۰۸۶۲)

معلوم ہوا کہ نماز کے نماز ہونے کی پہچان اور علامت یہی ہے کہ وہ برائیوں سے روکتی ہے، اگر نماز برائیوں سے نہ روکے تو وہ نماز نہیں بلکہ اللہ سے بعد ودوری کا

ذریعہ ہے، جب آدمی واقعی نیکیوں پر چلنے لگتا ہے اور نماز کو واقعی طور پر پڑھتا ہے، اس میں اخلاص وللّٰہیت کا، خشوع وخضوع کا اور دلجمعی کا لحاظ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کی حالت پلٹ دیتے ہیں، برا انسان بھی اچھا ہو جاتا ہے، اس کی برائیاں چھوٹنے لگتی ہیں، اس میں روز بروز سدھار ونکھار آتا جاتا ہے۔

نماز برائیوں سے کیسے روکتی ہے، ایک چور کا واقعہ

میرے شیخ ومرشد حضرت مسیح الامتؒ نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ کسی زمانے میں ایک چور تھا، وہ ایک بادشاہ کے محل میں چوری کرنے کے ارادے سے گیا، رات کا وقت تھا اور محل کے ایک کمرے سے بادشاہ اور اس کی بیوی کی گفتگو کی آواز آرہی تھی، وہ کھڑے ہو کر سننے لگا، اگرچہ ایسا سننا ناجائز ہے، حرام ہے، چوری ہے، لیکن چور چوری ہی کرنے آیا تھا تو اسے سننے میں کیا چیز مانع ہوتی ؟ آخر کو وہ چور ہی تو تھا۔ تو اس نے سنا کہ بادشاہ اپنی بیوی سے کہہ رہا ہے اور اس کی بیوی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے کہ میں اپنی بیٹی کی شادی ایسے آدمی سے کرونگا جو نہایت متقی وپرہیزگار ہو، جو بہت بڑا اللہ والا ہو، میں میری بچی کی کسی اور سے شادی نہیں کرونگا۔

جب چور یہ بات سن رہا تھا کہ تو اس کے دل میں آیا کہ کیوں نہ میں ہی کچھ ایسا بن کر دکھاؤں کہ میرے ہی ساتھ شاہزادی کی شادی بادشاہ کردے۔ دل میں ایک حرص پیدا ہوگئی، اب وہ چوری کو تو بھول گیا، لیکن دھوکہ پر اتر آیا اور گھر میں جا کر بہت دیر تک سوچنے لگا کہ کس طرح میں اس بات میں کامیاب ہوسکتا ہوں؟ تو ایک تدبیر اس کی سمجھ میں آئی کہ بادشاہ کے محل کے قریب ایک مسجد ہے، اس مسجد میں جا کر بزرگانہ لباس پہن کر اور ان کی وضع قطع اختیار کر کے وہاں دن رات عبادت میں مشغول ہو کر بیٹھ جاؤں، تو شدہ شدہ بادشاہ تک بات پہونچے گی کہ کوئی آدمی

یہاں ایسا متقی پرہیز گار ہے جو دن رات اللہ کی عبادت میں مصروف ہے، تو ہوسکتا ہے کہ بادشاہ کی نگاہِ انتخاب میرے اوپر پڑ جائے اور میں چن لیا جاؤں اور شاہزادی سے میری شادی ہو جائے۔

بھائیو! یہ اس کا ایک نہایت حقیر اور ذلیل دنیوی مقصد تھا، جس کے لئے اس نے یہ ارادہ کیا، اور اس نے اپنے پروگرام کے مطابق بزرگانہ لباس و پوشاک، وضع قطع اختیار کر کے اس مسجد میں جا کر نمازوں پر نمازیں، ذکر وتلاوت، مراقبہ سب شروع کرلیا۔ اب زمانہ چلتا رہا، لوگوں میں شہرت ہوتی گئی کہ کوئی اللہ کے بہت بڑے ولی یہاں آ گئے ہیں، جو دن رات عبادت کرتے ہیں۔ اب اس کی وجہ سے لوگوں کی آمد ورفت کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ تک خبر پہونچ گئی کہ یہاں کوئی اللہ والے آ کر بیٹھے ہیں، ہیں تو جوان لیکن زہد وعبادت میں لاجواب وتقوی وطہارت میں بے نظیر، جب بادشاہ کو یہ بات معلوم ہوئی تو اپنے ارادے کے مطابق غور وفکر شروع کر دیا کہ شاہزادی کے متعلق جو سوچا تھا، اس کے لئے اسی کا انتخاب کرلیا جائے۔

بادشاہ نے اس سلسلہ میں گفتگو کے لئے اپنے وزیر کو بھیجا، وزیر اس شخص کے پاس مسجد میں پہنچا اور اس نے باادب اس سے کہا کہ میں آپ کی خدمت عالیہ میں بادشاہ جہاں پناہ کی طرف سے آیا ہوں ایک پیغام لیکر۔ اس نے کہا کہ کیا پیغام ہے؟ وزیر نے بتایا کہ بادشاہ نے کئی سال پہلے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنی لڑکی کا نکاح ایک ایسے شخص سے کریں گے جو بڑا ہی متقی و پرہیز گار ہو، اللہ والا ہو، اور وہ اس کی تلاش میں تھے، اب جو نظر گئی تو نظر انتخاب آپ پر آ کر رک گئی ہے، لہذا بادشاہ نے مجھے بھیجا ہے کہ اس سلسلے میں آپ سے گفتگو کروں، اگر آپ اس کے لئے تیار ہوں تو فرمایئے، اگلی نشست کے اندر اس سلسلے کی کوئی کاروائی آگے بڑھائی جائے گی۔

یہ شخص جو دراصل اسی تمنا و آرزو میں یہاں آکر بیٹھا تھا، وہ بہت دیر تک یہ وزیر کی گفتگو سنتا رہا، اس کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، وزیر نے پوچھا کہ کیا بات ہوگئی؟ تو کہنے لگا کہ آج جو پیغام لیکر آپ آئے ہیں، یہ پیغام مجھے منظور نہیں ہے۔ وزیر نے کہا کہ کیوں منظور نہیں؟ اس نے کہا کہ دیکھئے میں صاف صاف بات آپ کو بتاتا ہوں کہ میں اصل میں ایک چور تھا اور میں بادشاہ کے محل میں چوری کے ارادے سے ایک مرتبہ گیا تھا، پھر جو کچھ بھی ہوا اس کو سنایا اور اس کے بعد اس چور نے کہا کہ میں نے تو یہ وضع قطع اسی حرص کی وجہ سے اختیار کی تھی، لیکن جب میں یہاں آکر بیٹھا تو خدا نے مجھے اپنا بنالیا، اب بس اس کے بعد مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ اکبر! جب عبادت عبادت ہوجائے، نماز نماز ہوجائے اور ذکر ذکر ہوجائے اور ہماری دیگر عبادتیں واقعی عبادتیں ہوجائیں تو بے شک یہ نمازیں اور عبادتیں انسان کو برائیوں سے روکتی ہیں۔

اللہ کے عظیم دربار کا تصور کریں

بہ ہر حال مجھے یہ کہنا ہے کہ آج ہمیں ہماری نمازوں کو نماز بنانے کی ضرورت ہے، لہذا میں اس سلسلہ میں چند اہم امور کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس سے ان شاء اللہ نماز کو نماز بنانا آسان ہوجائے گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم نماز کا ارادہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہم وضو کرتے ہیں، تو وضو کے وقت ہی اس کا تصور جمانا شروع کردیں کہ میں وضو کرنے کے بعد اللہ کے عظیم شاہی دربار میں جانے والا ہوں، عظیم خالق کے دربار، احکم الحاکمین کے دربار کے اندر حاضری کے لئے مجھے جانا ہے۔

حضرت زین العابدین علی ابن الحسنؒ کے واقعات میں ہے کہ آپ جب وضوکرنے بیٹھتے تھےتو آپ کے چہرے پرتغیرآ جاتا تھا،ایک رنگ آتا ایک جاتا تھا، چہرے کے تغیرکودیکھ کرلوگ پوچھا کرتے تھے کہ حضرت! آپ وضوکرتے ہیں تو آپ کی حالت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے، چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے،اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ وضوکرنے کے بعد کس کے دربار میں جانا ہے؟ یعنی جب اللہ کے دربار عالی میں جانا ہےتو اس کی ہیبت کی وجہ سے یہ اثرات ہوتے ہیں۔

اس طرح جب اللہ کے دربار میں جانے کا تصور قائم ہوجائیگا اور پھر اللہ کی عظمت و بڑائی اور اس کی جلالت و کبریائی کا تصور بھی کیا جائیگا اور سوچا جائیگا کہ اگر ہم دنیا کے کسی بادشاہ کے دربار میں جائینگے تو ہماری کیا حالت ہوتی ہے؟ کیا کسی شاہی دربار میں آدمی ایسے ہی چلا جاتا ہے؟ بے خبری اور غفلت کے ساتھ اندر چلا جاتا ہے؟ نہیں، بلکہ جب وہاں جاتا ہےتو اسے پورا احساس ہوتا ہے کہ میں ایک بڑے آدمی کے دربار میں جارہا ہوں، بادشاہ کے عظیم دربار میں جارہا ہوں۔ لہذا جب یہ سوچتا ہوا جاتا ہےتو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس پر رعب وجلال کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔

لیکن ہم خدا کے دربار میں جاتے ہیں تو سوچے سمجھے بغیر چلے جاتے ہیں، اس لئے مسجد کو جاتے ہوئے اللہ کے رعب وجلال کا کوئی اثر ہم پر نمایاں نہیں ہوتا۔ اس لئے جب نماز کیلئے جائیں تو سوچ کر سمجھ کر اللہ کے دربار کی عظمت کا تصور کرتے ہوئے جائیں، اور پورے وقار کے ساتھ جائیں، ایسے طریقے سے نہ جائیں جو وقار کے خلاف ہو۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے مسجد میں دوڑ کر جانے سے منع فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ اطمینان کے ساتھ جاؤ، وقار کے ساتھ اللہ کے دربار میں جاؤ، اگر تم کو پوری نماز مل گئی تو الحمد للہ، نہ ملی تو بقیہ نماز اپنے طور پر مکمل کرو، نماز کو پانے کے لئے مسجد میں دوڑتے ہوئے جانا، یہ اللہ کے دربار کے آداب کے خلاف ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "إذا أقيمت الصلاة فلا تأتوها تسعون ائتوها تمشون ، عليكم السكينة ، فما أدركتم فصلوا وما فاتكم فاقضوا" (جب نماز کھڑی ہو جائے تو تم دوڑ کر نماز کو نہ آؤ، بلکہ چل کر آؤ، اس طرح کہ تم پر وقار ہو، پس جو نماز مل جائے اس کو پڑھ لو اور جو نہ ملے تو قضا کرلو)

(بخاری: ۱/۱۲۴، مسلم: ۱/۲۲۰، صحیح ابن خزیمہ: ۱۷۷۲)

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جب نماز کے لئے جاتے تھے تو اس قدر آہستہ آہستہ چلتے تھے جیسے چیونٹی چلتی ہے، حتی کہ ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ چیونٹی بھی چلتی تو وہ اس سے بھی آگے نہ ہوتے۔ (حیاۃ الصحابہ: ۱۲/۷)

الغرض اسی تصور کے ساتھ اگر مسجد میں جائینگے تو نماز کے اندر بھی وہی تصور رہیگا اور اس تصور کو باقی رکھنا آسان ہو جائیگا اور جو آدمی کہ باہر کے خیالات کے ساتھ اور ادھر ادھر کے تصورات کے ساتھ اللہ کے دربار میں کھڑا ہوگا تو اسے کوئی احساس نہیں ہوگا کہ میں اللہ کے دربار میں کھڑا ہوا ہوں، بلکہ دنیا ہی اس کے ذہن میں آتی رہے گی۔ اس لئے یہ سب سے پہلا اصول وادب اور طریقہ ہے کہ نماز کو جانے سے پہلے ہی اللہ کے دربار کا جلال اور اس کی عظمت و بڑائی کا تصور قائم کرلیا جائے۔

مسجد میں داخل ہونے کی نیت و دعا

دوسری بات یہ ہے کہ جب ہم مسجد جائیں تو مسجد میں داخل ہونے کی نیت بھی کریں اور دعاء بھی پڑھیں ،سب گھروں میں آپ بغیر نیت کے جائیں،کوئی مضائقہ نہیں،لیکن اللہ کے گھر میں جاؤ تو نیت کر کے جاؤ کہ میں اعتکاف کی نیت کرتا ہوں۔

اس لئے کہ جب نیت اعتکاف کے ساتھ مسجد میں جائینگے تو جب تک مسجد میں رہیں گے اور وہاں نماز پڑھیں گے، ذکر کریں گے، تلاوت کریں گے اور کوئی نیک کام کریں گے تو ہر ایک کے ثواب کے ساتھ آپ کو اعتکاف کا بھی ثواب مل جائیگا، اور اگر کسی وقت کوئی اور عبادت نہ کر سکیں تب بھی اعتکاف کا ثواب جاری رہے گا، اس لئے اعتکاف کی نیت کر کے جاؤ، نیت کے ساتھ دعاء پڑھو، دعاء کیا ہے؟

" بِسۡمِ اللّٰهِ ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ ، اَللّٰهُمَّ افۡتَحۡ لِيۡ أَبۡوَابَ رَحۡمَتِكَ "(عمل الیوم واللیلۃ: ۱۶۷، الاذکار للنووی: ۴۴)

ایک بات یاد رکھیں کہ دعاء کی جاتی ہے، پڑھی نہیں جاتی، آج ہمارا حال یہ ہے کہ دعاء کرتے نہیں ہیں، دعاء پڑھ لیتے ہیں، یہ بات صحیح نہیں۔ دعاء پر غور کرو کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں؟ اس دعاء کا مطلب یہ ہے کہ "اے اللہ! اپنی رحمت کے دروازے میرے لئے کھولدے"۔ معلوم ہوا کہ مسجد میں آنے پر اللہ کی طرف سے رحمت کے دروازے کھولے جاتے ہیں، ورنہ اس موقعہ پر یہ دعاء کیوں تجویز کی جاتی، یہ مسجد میں داخلے کا وقت رحمت کے دروازے کھلنے وقت ہے، اس لئے اس موقعہ پر یہ دعاء تلقین کی گئی ہے۔ اگر اللہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہوئے یہ دعاء دل کی گہرائیوں سے کرینگے اور دعاء کو دعاء بنا کر کریں گے اور اللہ سے التجاء کی جائے گی تو

رحمت کے دروازے کھل جائیں گے، پھر بتاؤ کہ ہمارا کونسا مسئلہ اٹکا ہوا ہوگا؟ صحت کا، یا کھانے پینے کا یا تجارت کا، ملازمت کا، یا شادی کا، یا کوئی اور مسئلہ؟ اسی طرح دین وآخرت کا کوئی مسئلہ ہو، نجات کا، فلاح کا، کامیابی کا، حساب وکتاب کا، الغرض دین و دنیا کے جو بھی مسئلے حل ہوتے ہیں وہ اللہ کی رحمت سے حل ہوتے ہیں، اگر خدا کی رحمت رک جائے تو پھر انسان زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اس وقت خوب توجہ سے دعاء کرتے ہوئے مسجد میں داخل ہونا چاہئے۔

مسجد میں داخلے کا ادب اور حضرت گنگوہیؒ

جب ہم مسجد جائیں تو سب سے پہلے ہم اپنے جوتے سے بایاں پیر نکالیں اور داہنے پیر سے مسجد میں داخل ہوں، اس لئے کہ یہاں ایک تو جوتے نکالنے کا ادب بھی ہے اور ایک مسجد میں داخل ہونے کا ادب بھی، جوتے نکالنے کا ادب یہ ہے کہ پہلے بایاں پیر نکالو اور مسجد میں داخل ہونے کا ادب یہ ہے کہ پہلے سیدھا پیر داخل کرو۔

ایک عالم صاحب حضرت گنگوہیؒ کے مرید تھے، وہ کہتے ہیں کہ جب میں کتابوں میں یہ پڑھتا تھا کہ مسجد میں جاتے ہوئے پہلے بائیں پیر سے جوتا نکالو اور مسجد میں داہنا پیر داخل کرو تو مجھے اشکال ہوتا تھا کہ یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوسکتی ہیں؟ نکالنا ہے بایاں پیر سے جوتا، داخل کرنا ہے سیدھا پیر، تو وہ کہتے ہیں کہ میں حضرت گنگوہیؒ کے پاس گیا، اور جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں یہ دیکھوں کہ حضرتؒ اس سنت پر کیسے عمل کرتے ہیں؟ جب نماز کا وقت آیا تو حضرت کے ساتھ ساتھ نماز کو گیا اور جب مسجد میں داخل ہوئے تو وہاں دیکھتا رہا کہ حضرت مسجد میں کیسے داخل ہوتے ہیں؟

وہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت گنگوہیؒ کو دیکھ رہا تھا کہ حضرتؒ نے پہلے اپنا بایاں

پیر جوتے سے نکال کر جوتے ہی پر رکھ لیا، پھر اپنا داہنا پیر جوتے سے نکال کر سیدھے مسجد کے اندر رکھا۔اب مجھے سمجھ میں آ گیا کہ اس طریقہ پر دونوں باتوں دونوں سنتوں پر عمل ہوسکتا ہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت پر عمل سیکھنے سے آتا ہے اور وہ سیکھنا اللہ والوں کی صحبت سے میسر ہوتا ہے۔

ادب مسجد اور سفیان ثوری کا واقعہ

بہ ہر حال مسجد میں بھی اسی تصور کے ساتھ ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے جانا چاہئے کہ میں اللہ کے دربار میں داخل ہو رہا ہوں۔ واقعہ سنا ہوگا حضرت سفیان ثوریؒ کا کہ ایک مرتبہ مسجد میں بے خیالی کے ساتھ چلے گئے، اور مسجد میں اپنا داہنا پیر پہلے داخل کرنے کے بجائے بائیں پیر سے داخل ہو گئے تو فوراً الہام ہوا اور اس الہام میں ان سے کہا گیا کہ اے ثور! یعنی (اے بیل) کیا ہمارے دربار میں آنے کا یہی ادب و طریقہ ہے؟ اللہ نے ان کو بیل کہا، اس لئے کہ یہ جو بیل و گدھے ہوتے ہیں، ان کے لئے کوئی اصول نہیں ہوتا، جو چاہے پہلے رکھو اور جو چاہے بعد میں رکھو۔لیکن انسان ہو کر بھی یہی بے اصولی کرے تو یہ بات قابل گرفت ہوتی ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری کو ثوری اسی واقعہ کی وجہ سے کہتے ہیں، مگر اس میں اشکال ہے؛ کیونکہ ثوری میں یائے نسبت لگی ہوئی ہے، اس لئے اس کا معنی تو یہ ہوگا کہ ''بیل والا'' حالانکہ اللہ نے ان کو خود بیل کہا ہے نہ کہ بیل والا، اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ ثوری ان کو ایک قبیلہ کی طرف نسبت کی وجہ سے کہتے ہیں، الغرض جب یہ الہام ہوا تو فوراً اللہ کے سامنے سجدے میں پڑ گئے، رونے اور گڑگڑانے لگے اور معافی مانگنے لگے۔ لہذا مسجد میں داخل ہوتے ہوئے اس ادب کا لحاظ و دھیان ہونا چاہئے۔

نماز ایسی پڑھو جیسے زندگی کی آخری نماز ہو

اب آپ مسجد میں داخل ہو گئے اور نماز پڑھنا چاہتے ہیں، تو نماز شروع کرنے سے پہلے کیا تصور ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں ایک بات حدیث میں آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:" إِذَا صَلّٰى أَحَدُكُم فَلْيُصَلِّ صَلَاةَ مُوَدِّعٍ ، صَلَاةَ مَنْ لَا يَظُنُّ أَنَّهُ يَرْجِعُ إِلَيْهَا أَبَداً"(کنز العمال:۲۰۰۷۷)

اس حدیث کا مطلب یہ ہیکہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو اس کو چاہئے کہ اس طرح نماز پڑھے جیسے کوئی رخصت ہونے والا نماز پڑھتا ہے یعنی جیسے وہ شخص جس کو یہ یقین نہ ہو کہ پھر دوبارہ نماز پڑھ سکے گا۔

یہی بات ایک اور حدیث میں آئی ہے کہ ایک صحابی نے آ کر آپ ﷺ سے درخواست کی۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھ کو نصیحت فرمائیے، لیکن مختصر فرمائیے۔ صحابہ کی بھی عجیب بے تکلفی تھی، تو ان کی درخواست پر اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:" إِذَا قُمْتَ فِيْ صَلَاتِكَ فَصَلِّ صَلَاةَ مُوَدِّعٍ"(جب تم نماز پڑھو تو ایسی نماز پڑھو جیسا کہ رخصت ہونے والا پڑھتا ہے۔(ابن ماجہ:۴۱۷۱، مسند احمد:۲۳۴۸۹، معجم کبیر طبرانی:۱۲۸/۴)

اس حدیث میں ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہم جب نماز پڑھیں تو اس طرح پڑھیں جیسے رخصت ہونے والا نماز پڑھتا ہے، رخصت ہونے والے سے کیا مراد ہے؟ شارحین حدیث نے اس کا ایک مطلب یہ بیان فرمایا کہ اس سے مراد وہ ہے جو لوگوں کو رخصت کرنے والا ہو، تو جس طرح لوگوں کو رخصت کرنے والا رخصت کر کے اپنے کاموں میں پوری طرح منہمک و مشغول ہو جاتا ہے اسی طرح نماز پڑھنے والے کو بھی چاہئے کہ وہ سب کو رخصت کر دے اور دل سے نکال دے

اور اللہ کی جانب پوری طرح متوجہ ہو جائے۔علامہ مناوی نے ایک مطلب یہی لکھا ہے۔(دیکھو:فیض القدیر:۴۸۹/۶)

اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد مرنے والا اور سب کو چھوڑ کر اللہ کے دربار میں حاضر ہونے والا ہے، گویا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نماز اس طرح پڑھو جیسے یہ تمہاری آخری نماز ہو اور اس کے بعد پھر تم کو اس کا موقعہ نہ ملے گا، اور اس کی تائید خود حدیث کے ان جملوں سے ہوتی ہے جیسے اوپر کی حدیث میں فرمایا کہ:"صَلَاۃَ مَنۡ لَا یَظُنُّ اَنَّہٗ یَرۡجِعُ اِلَیۡہَا اَبَداً"(یعنی اس شخص کی سی نماز جس کو دوبارہ نماز پڑھنے کا یقین نہ ہو) اور ایک حدیث میں اس طرح فرمایا کہ:" صلاۃ مودع کأنك لا تصلی بعدھا"(مسند الشھاب:۹۳/۲)

اس سے معلوم ہوا کہ نماز ایسی پڑھنا چاہئے کہ یہ یقین ہو کہ یہ میری زندگی کی آخری نماز ہے اور یہ سمجھو جیسے تمہاری موت آ رہی ہو اور جو نماز تم پڑھنے جا رہے ہو وہ تمہاری آخری نماز ہے۔

اللہ اکبر! کیا عجیب نصیحت کی اللہ کے نبی ﷺ نے، لہذا جب نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوں تو اللہ کے نبی ﷺ کے اس ارشاد مبارک کو بھی ذہن میں لے آؤ کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد مجھے موقعہ نہ ملے، یہی میری آخری نماز ہو، یہی رکوع وسجدہ میرا آخری رکوع وسجدہ ہے، یہ میرا اللہ اکبر کہنا آخری ہے، جب آدمی یہ سوچ کر نماز پڑھے گا تو آپ اندازہ کر لیجئے کہ اس کی نماز کیسی شاندار ہوگی۔

گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو

پھر جب نماز شروع کرو کہ یہ سمجھو کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں یا کم از کم اللہ تو مجھے ضرور دیکھ رہے ہیں۔ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ ﷺ سے

سوال کیا کہ احسان کیا ہے؟ تو اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ''أن تعبد اللّٰه كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك'' (نماز اس طرح پڑھ، عبادت اس طرح کر گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے، اگر اتنی طاقت تیرے اندر نہیں ہے تو یہ خیال کر کہ اللہ تجھ کو دیکھ رہا ہے)(بخاری:۱۲/۱، مسلم:۲۷/۱)

اس حدیث میں نمازی کے دو حال بتائے ہیں، ان دو میں سے ایک حال ضرور ہوگا، ایک یہ کہ نمازی یہ خیال کرے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں، یہ تو بہت مشکل ہے، اسی لئے حدیث میں یہ کہا کہ ''كانك تراه'' (گویا کہ تو اللہ کو دیکھ رہا ہے) ''گویا کہ'' کیوں فرمایا؟ اس لئے کہ حقیقت میں دیکھ تو نہیں رہا ہے، صرف تصور کرنا ہے، اس لئے دیکھنے والے کی طرح ہو گیا ہے، اور اگر اتنا خیال جمانا مشکل ہو تو دوسرا حال یہ ہے کہ خیال کرے کہ اللہ مجھے دیکھ رہے ہیں، میرے عمل کو، میرے سکون کو، میری ہر ادا کو، اٹھنے اور بیٹھنے کو سب کو دیکھ رہے ہیں۔

جیسے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ سے فرمایا ہے ﴿ وَنَرَاكَ حِيۡنَ تَقُوۡمُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِيۡنَ ﴾[الشعراء:۲۱۹]

اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ سے فرما رہے ہیں کہ ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں جبکہ آپ نماز میں کھڑے ہوتے ہیں اور ساجدین میں یعنی نماز پڑھنے والوں میں جو آپ کا تقلب ہو رہا ہے، رکوع، سجدہ، جھکنا اور اٹھنا یہ سب ہم دیکھ رہے ہیں۔

کیا عجیب جملہ ہے، حضور ﷺ سے خطاب ہے کہ اے نبی ﷺ آپ کا اٹھنا اور آپ کا بیٹھنا اور آپ کا رکوع وسجدہ جو نمازیوں کے درمیان ہو رہا ہے۔ یہ اللہ دیکھ رہے ہیں اور اللہ کے علم میں موجود ہے۔ یہ سن کر حضور ﷺ کو کیا مزہ آیا ہوگا؟ جب معشوق ومحبوب دیکھ رہا ہو اور عاشق اس تصور کے ساتھ ہو کہ وہ میرا محبوب مجھ کو دیکھ رہا ہے تو اسوقت

آپ کی نماز میں جو لطف اور مزہ اور کیف پیدا ہو رہا ہو گا، اس کا تو کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔

الغرض اس طریقے پر اللہ تعالیٰ کے دیکھنے کا اور اس کے جاننے کا یقین ہمارے دلوں میں ہونا چاہیئے ،جب نماز شروع کرنے سے پہلے ہم اتنے مراحل سے گزریں گے تو بھائیو نماز میں وہ کیفیتیں پیدا ہونگی جو مطلوب ہیں۔

حاتم اصمؒ کی نماز کی کیفیت

ایک بزرگ تھے حاتم اصمؒ،ان کے پاس ایک آدمی آیا اور آکر کہنے لگا کہ حضرت ! آپ ماشاءاللہ بہت اچھی نماز پڑھتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ میں بھی آپ سے نماز پڑھنا سیکھوں، مجھے آپ بتائیے کہ آپ نماز کیسے پڑھتے ہیں؟اس کی کیفیت بیان کیجئے ؟ تو اس کے جواب میں حضرت حاتم اصمؒ نے کہا کہ جب میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو اللہ کو حاضر و ناظر جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اللہ میرے سامنے ہے اور یہ سمجھتا ہوں کہ میرے داہنی طرف جنت رکھی ہوئی ہے اور میرے بائیں طرف دوزخ رکھی ہوئی ہے اور یہ سمجھتا ہوں کہ میرے پیچھے شیطان مجھے بہکانے کے لئے کھڑا ہے۔اور کہتے ہیں کہ جب نماز شروع کرتا ہوں تو یہ سمجھ کر شروع کرتا ہوں کہ یہ میری آخری نماز ہے،اس کے بعد شاید مجھے موقعہ نہ ملے۔اس طرح میں نماز پڑھتا ہوں۔

اس تصور کے ساتھ نماز پڑھیں گے تو بتائیے کہ نماز میں کچھ مزا اور لطف آئیگا کہ نہیں آئیگا؟ ضرور آئے گا۔

وہی نہیں ہے جس کے لئے نماز ہے

بھائیو!اب تو ہماری نماز کا حال ایسا ہے کہ دماغ میں ساری گندگی بھری ہوئی

ہے، ساری دنیا کی گندگی اس میں ہے، دنیا کی ناپائدار چیزوں کی محبت، الفت، ساری گندگی وغلاظت کو لیکر اللہ کے دربار میں آکر کھڑے ہوگئے ہیں، دور دور تک خدا کا کوئی تصور نہیں، جو نماز اللہ ہی کے لئے ہے، اس نماز میں اللہ کے علاوہ سب کچھ ہے، وہی نہیں ہے جس کے لئے نماز پڑھی جارہی ہے۔

جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا:

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

آج ہماری نماز کا حال تو ایسا ہوگیا جیسے کہ نکاح کی مجلس میں نوشاہ نہ ہو، سارے باراتی جمع ہوگئے، وکیل، گواہ، باپ، بھائی، رشتہ دار سب ہیں اور قاضی صاحب بھی تشریف لاچکے ہیں، لیکن قاضی صاحب کس کا نکاح پڑھائیں نوشاہ ہی نہیں ہے۔

بھائیو! ہماری نماز کا نوشاہ تو خدا ہے وہی خدا جس کے لئے نماز ہے، اگر وہی نہ ہو، باقی سب چیزیں موجود ہوں، تو اندازہ کر لیجئے کہ اس نماز کی اللہ کے یہاں کیا حیثیت ہوگی؟ اس وجہ سے سب چیزوں کو باہر نکالو پھر اس کے بعد پاکیزہ دل کے ساتھ اللہ سامنے کھڑے ہوجاؤ۔

دینار دھورہی ہوں، حضرت عائشہ کا واقعہ

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک بات یاد آگئی، میں نے حدیث کی کتابوں میں تو کہیں نہیں دیکھا، لیکن بعض بزرگوں کے ملفوظات میں پڑھا کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کچھ درہم ودینار دھورہی تھیں، تو نبی اکرم ﷺ تشریف لائے، تو خلاف معمول درہم ودینار کو دھوتا ہوا دیکھا، تو پوچھا کہ اے عائشہ! یہ کیا ہے؟ یہ درہم ودینار

کوتم کیوں دھورہی ہو؟ حضرت عائشہ صدیقہ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ آپ سے میں نے سنا تھا کہ جب ہم کسی غریب سائل کو اللہ کے لئے کچھ دیتے ہیں تو ہم سائل کو نہیں بلکہ اللہ کو دیتے ہیں، بظاہر تو سائل کو دیتے ہیں، لیکن وہ حقیقت میں خدا کو دیتے ہیں، تو میں نے سوچا کہ جو چیز خدا کو دی جارہی ہے، اس میں میل ہو تو اچھا نہیں لگتا، اس لئے میں اس کو دھورہی ہوں۔

اس سے ہم کو اندازہ کرنا چاہئے کہ درہم ودینار ظاہراً تو سائل کو دیئے جاتے ہیں، باطناً اللہ کو دیئے جاتے ہیں، لیکن نماز تو ظاہراً و باطناً دونوں اللہ کو پہونچتی ہے، تو یہ کتنی پاک ہونی چاہئے؟ اسی لئے نماز کے لئے طہارت عظیم الشان شرط ہے، بغیر طہارت کے نماز کا تصور ہی نہیں، سب سے بڑی نماز کی شرط، جسے شرط اعظم کہہ لیجئے وہ ہے طہارت، ظاہری طہارت بھی اور ظاہری طہارت کے ساتھ باطنی طہارت بھی، صرف ظاہری طہارت مراد نہیں، ظاہری طہارت کے ساتھ ساتھ باطنی بھی مراد ہے، جب دونوں طہارتوں کے ساتھ بندہ اللہ کے سامنے کھڑا ہو تو وہ ہے اصلی نماز، اس لئے اپنے دماغ سے ساری گندی چیزوں کو باہر نکالو اور غلاظت کو باہر نکالو اور بزبان حال اللہ سے یہ کہو کہ:

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

تکبیر تحریمہ کی حقیقت

بزرگو، دوستو!

جب نماز شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے تکبیر تحریمہ یعنی "اَللّٰہُ أَکْبَر" کہا جاتا ہے۔ تکبیر تحریمہ شرط نماز ہے، اور خاص "اَللّٰہُ أَکْبَر" کا لفظ کہنا

سنت موکدہ ہے، اوراس کے ساتھ ہاتھ کانوں تک یا کندھوں تک اٹھانا بھی سنت ہے۔ سوچئے کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں؟ یہ بات بہت واضح ہے کہ شریعت میں کوئی بات فضول یونہی مشروع نہیں ہوگئی، بلکہ اس کا کوئی مطلب ہوگا۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس " اَللّٰهُ أَكْبَر " کے کہنے اوراس کے ساتھ ہاتھ اٹھانے میں ایک رمز واشارہ ہے۔ وہ کیا؟ وہ یہ کہ جب ہم ہاتھ اٹھاتے ہیں تو غیر اللہ سے بڑائی کی نفی وانکار کی جانب اشارہ ہوتا ہے کہ کوئی بڑا نہیں، پھر ہم زبان سے " اَللّٰهُ أَكْبَر " کہکر اللہ کی بڑائی و کبریائی کا اقرار کرتے ہیں۔ تو اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ تکبیر تحریمہ دراصل دو چیزوں سے بنتی ہے، ایک لفظ " اَللّٰهُ أَكْبَر " سے اور ایک ہاتھ اٹھانے سے، اور دونوں کو ملائیں تو یہ مطلب ہوتا ہے کہ کوئی بڑا نہیں، بلکہ صرف اللہ بڑا ہے۔ لہذا ہم اسی ایک بڑی وعظیم ذات کے سامنے نماز پڑھتے ہیں، اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی سے مدد مانگتے ہیں، اسی کو حاجت روا ومشکل کشا سمجھتے ہیں، وہی عبادت کے لائق ہے، وہی سجدے کے قابل ہے، وہی ہمارا خالق و مالک ہے۔ اگر اس احساس کے ساتھ تکبیر ہو رہی ہے تو یہ حقیقی تکبیر ہے ورنہ صرف زبانی تکبیر ہے۔

علامہ ابن القیم بڑے عالم ومحدث گزرے ہیں، انھوں نے لکھا ہے کہ:
اگر بندہ " اَللّٰهُ أَكْبَر " کہتے ہوئے اللہ کی جلالت و کبریائی کا تصور کرے اوراس کی زبان کے ساتھ اس کا دل بھی یہ کہے تو اس کے دل میں اللہ ہر چیز سے بڑا ہوگا، لہذا اس کو اللہ کے سوا کوئی اور چیز نماز کے اندر اپنے میں مشغول نہیں کرے گی۔ اور اگر اس کو کوئی اور چیز اللہ کی جانب سے توجہ ہٹا کر اپنے میں مشغول کر رہی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے نزدیک اللہ سے بھی بڑی کوئی چیز ہے، اوراس کا

" اَللّٰهُ أَكْبَر" کہنا صرف زبانی زبانی ہے ،دل کے ساتھ نہیں ہے ۔ (اسرار الصلاۃ:۹)

بعض صوفیاء نے فرمایا کہ یہ ہاتھ اٹھانا اس بات کی جانب اشارہ کے لئے مشروع ہے کہ آدمی نماز کے وقت سب کو اپنے پس پشت ڈال رہا ہے، اور اللہ کی جانب متوجہ ہو رہا ہے، گویا یہ بتا رہا ہے کہ اب میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں، سب کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔ بس جب " اَللّٰهُ أَكْبَر "کہیں تو اس کا دھیان جمائیں کہ اللہ بڑا ہے، اس کے سوا کوئی چیز بڑی نہیں، اور سب چیزیں لات مارنے کے قابل ہیں لہذا مجھے اسی کی جانب توجہ کر کے نماز پڑھنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ سورۂ فاتحہ کا جواب دیتے ہیں

جب نماز میں کھڑے ہوں اور آپ نے یہ تصور باندھ لیا ہو کہ اللہ دیکھ رہے ہیں تو اب یہ بھی خیال کرو کہ میں جو پڑھ رہا ہوں اللہ اس کو سن رہے ہیں اور میرا جواب بھی دے رہے ہیں ۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب بندہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہر آیت کا جوب دیتے ہیں، جب بندہ کہتا ہے:

﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ﴾ (تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام عالموں کا پالنہار ہے) تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں کہتے ہیں "حمدني عبدي " (میرے بندے نے میری حمد بیان کی)

اور جب بندہ کہتا ہے ﴿ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ (نہایت رحم کرنے والا، بڑا مہربان) تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں کہتے ہیں "أثنىٰ عليّ عبدي "(میرے بندے نے میری ستائش کی)

اور جب بندہ کہتا ہے ﴿ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡن ﴾ (یوم جزاء کا مالک ہے)
تو اللہ فرماتے ہیں "مجّدنی عبدی "(میرے بندے نے میری عظمت وبڑائی
اور بزرگی بیان کی ہے)

پھر جب بندہ کہتا ہے ﴿ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡن ﴾ (اے اللہ!
ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں)

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کہتے ہیں "فھذہ بینی و بین عبدی ولعبدی
ماسأل "(یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے، اور بندے کے لئے وہ
ہے جو اس نے مانگا) اس لئے کہ عبادت میرا حصہ ہے اور مدد جو میں کرونگا وہ میرے
بندے کا حصہ ہے۔ پہلے تو اللہ کی حمد، اللہ کی تعریف و بزرگی بیان کرنے کے لئے کہا
گیا ہے، پھر اس کے بعد اپنی عاجزی، تواضع اور اپنی ناتوانی کا اظہار کرنے کے لئے
کہا گیا ہے اے اللہ! میں بندہ ہوں، تیرا غلام اور تیرا ہی محتاج ہوں، اس لیے اے
اللہ! بندہ ہونے کی وجہ سے تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور محتاج ہونے کے اعتبار سے
تجھ ہی سے مدد طلب کرتا ہوں۔ یہ اللہ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار ہے۔

پھر آگے بندہ کہتا ہے: ﴿ اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ
اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ غَيۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ وَلَا الضَّآلِّيۡنَ ﴾

(اے اللہ! ہم کو سیدھے راستے پر چلا، ان لوگوں کے راستے پر چلا جن لوگوں پر کہ
تو نے انعام کیا ہے، ان لوگوں کے راستے پر نہ چلا جن پر کہ غضب کیا گیا ہے
اور جو گمراہ قرار دیئے گئے ہیں)

تو اس کے جواب میں اللہ کہتے ہیں "فھو لاء لعبدی ولعبدی ما سأل "
یہ میرے بندے کے لئے ہے، اور بندہ نے جو مانگا اس کو وہ ملے گا۔(مسلم:

۹۰۴، السنن الکبری نسائی: ۱/۱۹۷، ابوداؤد: ۱۱۹، ترمذی: ۲۹۵۳، ابن ماجہ: ۳۷۸۴)

اب اندازہ کیجئے کہ ہم نماز میں کھڑے ہوکر یہ تصور باندھ کر نماز پڑھیں گے تو ادھر ادھر خیال جانے کا کیا مطلب؟ کوئی خیال اِدھر اُدھر نہیں جائیگا، غیر اختیاری طور پر جائیگا، لیکن قصداً آپ کی پوری توجہ اس جواب کی طرف ہو اور اس وقت آپ یہ سوچ سوچ کر نماز پڑھیں کہ میں یہ کہہ رہا ہوں، اللہ مجھے جواب میں یہ کہہ رہے ہیں، تو پھر اس نماز کی کیفیت وحلاوت ہی کچھ اور ہوگی۔

نماز مناجات کا نام ہے

لہذا یوں سمجھئے کہ نماز درحقیقت اللہ سے مناجات وسرگوشی کا نام ہے، اور حدیث میں یہ بات صراحت کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: "إن أحدكم إذا صلى يناجي ربه" (تم میں سے کوئی جب نماز پڑھتا ہے تو وہ اپنے رب سے مناجات کرتا ہے) (بخاری: ۵۳۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ وہ شخص کامل مومن نہیں جو نماز میں نہ ہونے کی حالت میں غم میں نہ ہو، صحابہ نے پوچھا کہ یہ کس طرح یارسول اللہ! تو فرمایا کہ: "لِأَنَّ الْمُصَلِّيْ يُنَاجِيْ رَبَّهُ وَإِذَا كَانَ فِيْ غَيْرِ صَلَاةٍ إِنَّمَا يُنَاجِي ابْنَ آدَمَ" (کیونکہ نماز پڑھنے والا اپنے رب سے مناجات کرتا ہے اور جب وہ نماز میں نہیں ہوتا تو آدمیوں سے بات چیت کرتا ہے) (معجم کبیر طبرانی: ۳۲/۱۱)

الغرض نماز اللہ تعالی سے مناجات کا نام ہے، اور اللہ تعالی سے راز و نیاز کا موقعہ ہے، لہذا اس کا بہت خیال رکھنا چاہئے کہ ہم نماز میں اللہ سے مناجات میں مشغول ہیں، اس کے خلاف کوئی حرکت ہم سے صادر نہ ہو۔

صحابہ کا ایک واقعہ اور حضور ﷺ کی تنبیہ

ایک دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ رمضان مبارک میں حضرات صحابہ الگ الگ جماعتیں بنا کر مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ ایک کونے میں مسجد کے اعتکاف میں تھے، صحابہ جو قرأت کر رہے تھے اس میں ان کی آواز ایک دوسرے پر بلند ہوگئی، آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ: مصلی تو اللہ سے مناجات کرتا ہے، لہذا ایک دوسرے پر آواز بلند نہ کرو۔ (اتحاف الخیرۃ:۲/۳۷)

دیکھئے اس واقعہ میں عبرت ہے کہ نماز میں کس طرح اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ مناجات کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔

اللہ کی آواز سنائی نہیں دیتی؟ حضرت مدنی کا واقعہ

ہوسکتا ہے کہ بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ اللہ کا یہ جواب ہمیں تو سنائی نہیں دیتا، پھر جواب دینے کا فائدہ کیا ہوا؟

میں کہتا ہوں کہ کیوں سنائی نہیں دیتا؟ ارے سنائی تو دے رہا ہے، ابھی آپ نے سنا کہ نہیں سنا کہ اللہ کہتے ہیں "حمدنی عبدی" یہ سنانے والے محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور ان کو سنانے والے جبرئیل علیہ السلام ہیں اور جبرئیل علیہ السلام کو سنانے والے اللہ رب العزت ہیں، جب اللہ تعالی نے جبرئیل علیہ السلام کو سنایا اور جبرئیل علیہ السلام نے محمد ﷺ کو سنایا اور محمد ﷺ کی یہ حدیث ہم آپ کو سنا رہے ہیں، یہ اللہ ہی کی تو آواز ہے، تو پھر کیوں کہتے ہیں کہ آواز نہیں آرہی ہے؟ آواز تو آرہی ہے، ہاں اتنی بات ہے کہ بلا واسطہ نہیں، بلکہ بالواسطہ آرہی ہے۔

مجھے اس پر ایک قصہ یاد آگیا، ایک دفعہ دارالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کا درس حدیث ہو رہا تھا، آپ مسند درس پر بیٹھے ہوئے ہیں، ایک طالب علم نے حدیث پڑھی، جس کے اندر آتا ہے کہ اللہ کے نبی

ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آخری زمانے میں حضرت عیسی علیہ السلام تشریف لائیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے، اور فلاں فلاں کام کرینگے، کئی کام ان کے اس حدیث میں بتائے گئے ہیں، اس میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ جس وقت وہ تشریف لائیں گے تو "**یضع الجزیة**" (جزیہ جس کو ٹیکس tax کہتے ہیں، اسے وہ ختم کردیں گے)۔

(بخاری:۲۹۶/۱، مسلم:۸۷/۱)

دیکھئے اس حدیث کے اندر آیا ہے کہ حضرت عیسی جزیہ کو ختم کردیں گے، جب یہ حدیث پڑھی گئی تو حضرت شیخ الاسلام نے اسے بیان فرمایا اور تشریح کی، تو ایک طالب علم کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت! یہ حدیث میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے، اس لئے کہ حدیث میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ جزیہ کو منسوخ کردیں گے تو حضور ﷺ کی شریعت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے منسوخ کردیں گے؟

تو حضرت شیخ الاسلام کہنے لگے کون کہتا ہے؟ طالب علم کہنے لگے کہ حضرت جو حدیث پڑھی گئی اسی میں تو آیا ہے، حضرت پھر کہنے لگے کہ ارے کون کہتا ہے وہ منسوخ کردیں گے؟ وہ طالب علم پھر کہنے لگے، حضرت! حدیث میں تو ہے، پھر کہنے لگے ارے کون کہتا ہے؟ محمد ﷺ ہی تو کہتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد ﷺ خود منسوخ کرنے والے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام کہاں منسوخ کرنے والے ہیں؟ عیسیٰ علیہ السلام کا جب وقت آئیگا، ان کا زمانہ آئیگا، تب ان کے زمانے میں منسوخ ہوگا، لیکن منسوخ کرنے والے محمد ﷺ ہی ہیں۔

تو بھائی اسی طریقے پر میں نے کہا کہ آپ کو کیوں سنائی نہیں دیتا؟ ہاں البتہ اللہ کی آواز ڈائریکٹ ہم تک، آپ تک نہیں پہونچے گی، بلکہ محمد ﷺ کی آواز میں ہم تک اور آپ تک یہ پہونچے گی، اور پہنچ رہی ہے، اس لئے کہ اللہ کی آواز براہ راست سننے کے لئے ہمارے اور آپ کے پاس وہ کان ہی کہاں ہیں؟ اگر ہم کو براہِ راست

خدا کی آواز آتی تو سینہ پھٹ جاتا۔

اس لئے اللہ نے ایسا کیا کہ اللہ کے نبی ﷺ کے سینے میں اُتار کر اس آواز کو پھر ہم تک پہونچایا، اس پہونچانے میں جمال پیدا ہو گیا، تو خدا کے جلال کو محمد ﷺ کے جمال میں ڈھال کر ہم تک پہونچایا تو ہم کو سہارا مل گیا۔

نماز میں قرآن کا حق اداء کریں

اس کے بعد نماز میں جب قرآن کریم پڑھیں تو آیتوں کو غور سے سنیں اور ان کے معانی پر غور کرتے رہیں اور ان آیات کے جوابات کا تصور کرتے ہوئے نماز پڑھیں، یہ ہے قرأت کا حق۔

ایک تابعی حضرت مسلم بن مخراق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا کہ ہمارے یہاں کچھ لوگ ہیں جو ایک رات میں دو دو تین تین مرتبہ قرآن پاک ختم کر لیتے ہیں۔ تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ ان لوگوں نے پڑھا تو ہے مگر حقیقت میں نہیں پڑھا ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رات بھر نماز پڑھی ہے آپ کسی بھی امید والی آیت سے گزرتے تو اللہ سے سوال کرتے اور مانگتے اور کسی بھی خوف کی آیت سے گزرتے تو اپنے رب سے اس سے پناہ مانگتے۔ (اتحاف الخیرۃ:۱۶۹۲)

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ رات کے وقت نماز کے لئے کھڑے ہوئے، میں بھی جا کر کھڑا ہو گیا، اللہ کے نبی ﷺ نے سورۃ البقرۃ پڑھی پھر سورۂ آل عمران پھر سورۂ نساء پڑھی، آپ پڑھتے جاتے تھے اور جہاں آیت رحمت آتی تھی، وہاں رک جاتے تھے اور اللہ سے سوال کرتے تھے، اے اللہ! مجھے بھی تیری رحمت عطا کر دے، اور جہاں پر کوئی عذاب کا ذکر آجاتا تھا، وہاں اللہ سے پناہ مانگتے اور التجاء کرتے کہ اے اللہ! مجھے تیرے عذاب سے بچالے۔ (سنن

کبریٰ نسائی:۳/۱۰۱،سنن نسائی مجتبی:۱۰۰۹،ابوداؤد:۱۲۷،صحیح ابن خزیمہ:۶۸۴)

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے حبیب ﷺ ایک دفعہ تشریف لائے حضرات صحابہؓ بیٹھے ہوئے تھے،حضور ﷺ نے ان کے سامنے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت فرمائی، وہ سورۃ الرحمٰن جس کے اندر بار بار یہ آیت دہرائی گئی ہے ﴿ **فبایّ آلاء ربکما تکذبان** ﴾ (اے جن وانس!تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟)

اللہ تعالی نے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور یہ آیت دہرائی ہے،تو حضور ﷺ نے اس سورت کی تلاوت فرمائی اور حضرات صحابہؓ خاموش بیٹھے ہوئے تھے،تلاوت کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''لیلۃ الجن''میں میں نے جنات کے گروہ میں بھی یہی سورت پڑھ کر سنائی تھی تو''**فَكَانُوا أَحْسَنَ مَرْدُوداً مِنكُمْ**''(قرآن کو سمجھ کر قرآن کا جواب دینے میں وہ تم سے اچھے تھے)۔اس کے بعد فرمایا:جب میں یہ آیت پڑھتا تھا،تو وہ جواب میں کہا کرتے تھے:''**لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ**''(اے ہمارے پروردگار!ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلائیں گے،تیرے ہی لئے تعریف ہے)۔(ترمذی:۲/۱۶۴،حدیث:۳۲۹۱)

حضور ﷺ نے فرمایا جواب ایسا ہونا چاہئے،یہ ہے قرأت کا حق،جب قرأت کا حق ادا کرتے ہوئے نماز پڑھیں گے،تو انشاء اللہ نماز کے اندر لطف ومزہ بھی آئیگا اور اسی کے ساتھ اس کے اندر جان وروح بھی پڑ جائیگی۔لیکن قرأت کا حق وہ ادا کرسکتا ہے جو قرأت کرنے پر سمجھتا بھی ہو کہ کیا پڑھا جارہا ہے؟ لیکن بہت سارے لوگ وہ ہیں جو عربی زبان نہیں جانتے،یہ زبان ہماری اخروی زبان ہے،اللہ اور اس کے فرشتوں کی زبان ہے،اس لئے ہم سب لوگوں کو چاہئے کہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش کریں یا کم از کم ترجمہ جان لیں۔

رکوع میں کیا تصور ہونا چاہئے؟

بھائیو! نماز میں آگے بڑھتے ہوئے ہم رکوع کی طرف جاتے ہیں، اللہ کے سامنے جھکنا بہت بڑی عبادت ہے، اللہ کو بہت پسند ہے کہ بندہ بندہ بن کرر ہے، اگر بندہ بندہ نہیں بنتا تو خدا کی نظر میں بہت گندہ ہوتا ہے، رکوع میں جا کر یہ تصور کرے کہ میں جھک رہا ہوں، میں ذلیل ہوں، اور میرا رب بلند ہے، میں اس کے سامنے پست ہوں، ذلیل ہوں۔

اور یہاں ایک بات خاص طور سے قابل غور یہ ہے کہ جب رکوع سے اٹھتے ہیں تو "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" (اللہ نے سن لی اس بندے کی جس نے اس کی تعریف کی) کہتے ہیں، اب جب اٹھتے ہوئے آپ کی زبان پر یہ الفاظ ہوں تو سوچیں کہ اس میں کیا کہا جارہا ہے؟ اللہ کہہ رہے ہیں کہ میں نے سن لی بندے کی، تو میری بھی سن لی ہے، میری آواز کتنی گھٹیا، کیسے گنہگار کی آواز ہے، مجھ جیسے حقیر وفقیر کی آواز اتنے بڑے خالق و مالک کے دربار میں پہنچ گئی ہے؟

اگر کسی کو یہ کہا جائے کہ بھائی! تمہارا جو پیغام ہے، وہ آج وزیراعظم تک پہونچ چکا ہے اور انہوں نے اسے پڑھ لیا ہے۔ اب بتاؤ کہ سننے والے کو کس قدر اپنی بڑائی کا بھی احساس ہوگا اور اسے مزہ ولطف بھی آئیگا، یہاں بھی یہی کہا جارہا ہے کہ اے بندے! تونے جو بھی وظائف نماز کی حالت میں پڑھے تھے، وہ سب اللہ نے سن لیا ہے۔

جب یہ سوچیں گے تو مزہ آئیگا کہ نہیں آئیگا؟ اگر اب بھی نہ آئے تو کب آئیگا؟ اور یہ تو بہت ہی مزے کی بات ہے، اس سے زیادہ مزہ اور لطف کی بات کیا ہوسکتی ہے کہ ہم کو بتایا جارہا ہے کہ تیری یہ آواز خدا کے دربار میں پہونچائی جارہی ہے۔

بندہ خدا کے قدموں میں

رکوع کے بعد سجدہ ہوتا ہے، اور سجدہ سب سے بڑی عبادت ہے، اور مسجد اسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ مسجد کے معنی ہیں سجدہ گاہ، حالانکہ نماز میں رکوع اور قیام، قرأت، جلسہ وغیرہ بھی ہوتے ہیں، اس لئے مسجد کو ''مرکع'' (رکوع کی جگہ) یا ''مقام'' (قیام کی جگہ) یا ''مقرأ'' (پڑھنے کی جگہ) بھی کہا جا سکتا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کے لئے لفظ ''مسجد'' استعمال کیا جاتا ہے، یعنی سجدہ گاہ، اس لئے کہ سجدہ سب سے بڑی عبادت ہے۔

سب سے بڑی عبادت بجالاتے ہوئے آدمی جب سجدہ میں جاتا ہے تو حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

"أقرب ما يكون العبد من ربه وهو ساجد فأكثروا الدعاء" (بندہ جب سجدہ میں ہوتا ہے تو اس وقت اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے، لہذا تم سجدے میں کثرت سے دعا مانگو) (مسلم: ۱/۱۹۱، ابوداؤد: ۱۲۷)

اور ایک روایت کے اندر آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

" الساجد يسجد علىٰ قدمى اللّٰه تعالىٰ فليسئل واليرغب" (بندہ جب سجدہ کرتا ہے تو دراصل وہ سجدہ اللہ کے قدموں پر کرتا ہے، لہذا جو بھی حاجتیں ہوں، اس کا اللہ سے سوال کرے اور اللہ کی طرف رغبت پیدا کرے) (مسلم: ۴۸۲، مسند ابویعلی: ٦٦٥٨، مسند ابوعوانہ: ۱۴۷۱، مسند احمد: ۹۴۴۲)

سوچنے کی بات ہے کہ سجدہ کس قدر عظیم عبادت ہے کہ آدمی اس میں اللہ کے قدموں پر ہوتا ہے، اگر سجدہ میں جا کر اللہ کے قدموں میں سر رکھ کر پھر بھی اس کا دل دنیا میں لگا ہوا ہو تو بتاؤ اس سے زیادہ محروم کون ہوگا؟ پہونچ گیا وہ خدا کے دربار میں،

لیکن پھر بھی دل دنیا میں اٹکا ہوا ہو، اس سے بڑا محروم کوئی نہیں، ایسا سجدہ کریں گویا کہ والہانہ اور عاشقانہ سجدہ ہو، اللہ کے دربار میں سر رکھتے ہوئے یہ سمجھے کہ بس میں تو اللہ سے مل گیا ہوں۔

سجدے کی ایک ظاہری برکت

یہ تو سجدے کی روحانی برکت ہے، ایک برکت اس کی ظاہری سنتے چلئے کہ حضرت اقدس مولانا ذوالفقار صاحب نقشبندی دامت برکاتھم نے لکھا ہے کہ جب حضرت آدم نے ایک خطا کا ارتکاب کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں بھیج دیا تو حضرت آدم سجدہ میں پڑ گئے، اور روتے رہے روتے رہے، اللہ تعالیٰ کو وہ سجدہ بڑا محبوب و پسند آیا، بھوکے بھی تھے کئی دن سے، جنت میں تو لذیذ لذیذ غذائیں ملا کرتی تھیں، لیکن یہاں دنیا میں آئے تو اللہ کے دربار میں روتے پڑے ہیں، کھانے تک کا احساس نہیں، اللہ تعالیٰ نے کئی دن کے بعد ان کو اُٹھایا اور کھانا ان کے منہ میں ڈالا گیا کہ اے آدم! تم نے سر جھکایا تو ہم تمہارے لئے کھانا اوپر اٹھاتے ہیں۔

حضرت فرماتے ہیں کہ اسی لئے انسان کے کھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا سر سیدھا ہوتا ہے، کھانا نیچے سے اٹھا کر اوپر کو لاتا ہے، لیکن جتنے جانور ہیں وہ سب سر نیچے کر کے کھانے کی طرف منہ لے جا کر کھانا کھاتے ہیں، اس لئے کہ اللہ کہتے ہیں کہ اے میرے بندے! تو نے میرے لئے سر جھکایا تو میں کھانے کے لئے تیرا سر جھکنے نہیں دیتا، کھانا تیرے پاس آئیگا تو کھانے کے پاس نہیں جائیگا۔

یہ اللہ کی عنایت ہے اور بندگی کا ثمرہ ہے۔ بہرحال یہ ہے وہ سجدہ جسکی وجہ سے انسان اللہ کے انتہائی قریب ہو جاتا ہے۔

اللہ نے پیار کرلیا

سجدے کی لذت کا حال عاشقوں سے پوچھو، ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادابادیؒ نقشبندی سلسلہ کے بڑے اولیاء اللہ میں سے گزرے ہیں، ایک بار حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی جوانی میں ان کی خدمت میں ملاقات کے لئے گئے، تو حضرت مولانا فضل رحمان صاحب نے ان سے فرمایا کہ ''بیٹا! تم سے ایک بات کہتا ہوں کہ میں جب سجدہ میں جاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ میاں نے گود اٹھا کر پیار کرلیا''۔

اس میں گود سے مراد یہ عرفی گود نہیں، اور نہ پیار سے مراد بوسہ ہے، بلکہ اس سے مراد اللہ کا قرب ہے اور اس کی محبت وشفقت، اور اس میں انھوں نے اس حالت کی لذت ومستی اور کیف کا ذکر کیا ہے۔ اب اندازہ کیجئے کہ جس شخص کو سجدے میں یہ کیف محسوس ہوتا ہے اس کے سجدے کی کیا کیفیت ہوگی، جب سجدہ ایسا تو اس کا کیف بھی ایسا۔

سجدے سے سر کیسے اٹھاؤں؟

ایک بزرگ سے پوچھا گیا کہ آپ بہت لمبا سجدہ کرتے ہیں، کیا بات ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ میں اس لئے لمبا لمبا سجدہ کرتا ہوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ بندہ جب سجدہ میں گرتا ہے تو وہ خدا کے قدموں پر سر رکھتا ہے، اب بتاؤ کہ خدا کے قدموں پر سر رکھ کر پھر سر کیسے اٹھالوں؟ کیا یہ سر اٹھانا مناسب ہے؟ ظاہر بات ہے اللہ کے دربار میں سر رکھ دیا، اور قرب کی آخری منزل میسر آگئی تو اب سر کیسے اٹھاؤں؟

الغرض ہمارا سجدہ بھی اس احساس وجذبے کے ساتھ ہونا چاہئے کہ ہم اللہ کے

قریب ہو چکے ہیں، اوراس کے قدموں پر سر رکھے ہوئے ہیں۔

خلوص وخشوع حقیقت نماز

اب آخر میں ایک اوراہم پہلو کی جانب توجہ کیجئے، وہ یہ کہ نماز میں بھی اور دیگر عبادات میں بھی خلوص وللّٰہیت اور خشوع بہت ضروری ہے اور یوں کہا جائے تو بالکل صحیح کہ یہی درحقیقت نماز کی روح وجان ہیں۔لہذا ان کا بہت اہتمام کرنا چاہئے۔ جہاں تک خلوص وللّٰہیت کی بات ہے یہ سب جانتے ہیں کہ یہ کس قدر اہم وضروری ہے؟ بڑی معروف حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:'' إنما الأعمال بالنيات''(اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے)

اور رہا خشوع کا مسئلہ تو ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ نبی ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جوآدمی اس طرح نماز پڑھتا ہے کہ اس میں خشوع کا،خضوع کا مکمل دھیان رکھتا ہے ،رکوع وسجدہ نہایت اطمنان سے ادا کرتا ہے،تو یہ نماز اللہ کے دربار میں نہایت روشن وسفید ہو کر جاتی ہے اور جب اللہ کے دربار میں جاتی ہے تواس کو یوں دعاء دیتے ہوئے جاتی ہے کہ:'' حفظك الله كما حفظتني ''(اللہ تیری حفاظت کرے جیسے کہ تونے میری حفاظت کی)اور اگرکوئی بندہ نماز کو بے ڈھنگے طریقے پرادا کرے،اور خشوع وخضوع کو ضائع کرتا ہے، اوررکوع وسجدہ کوٹھیک ادانہیں کرتا تووہ نماز بندہ کے پاس سے کالی شکل میں جاتی ہے اور یہ کہتی ہے 'ضيّعك الله كماضيّعتني''(تجھے بھی اللہ غارت کرے جیسے تونے مجھے ضائع کیا) پھراس نماز کو ایک پرانے کپڑے میں لپیٹ کر اس کے منہ پر مار دی جاتی ہے ۔(معجم کبیر طبرانی:۳۲۱۳،شعب الایمان:۱۴۱/۷، کنز العمال:۱۹۰۵۲)

اس حدیث کے بارے میں محدثین نے لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن ہےاور یہ کئی

الفاظ کے ساتھ حدیث کی کتابوں میں درج کی گئی ہے۔

ان سب احادیث میں نبی کریم ﷺ نے امت کو یہی تعلیم دی ہے کہ نماز کو نماز بنائیں، کیونکہ کچھ اُٹھک بیٹھک کر لینے کا نام نماز نہیں ہے، نماز تو ایک اہم ترین عبادت ہے جس کو صحیح طریقے پر ادا کرنا چاہئے۔

کیا اللہ کو ہماری نماز کی حالت کا علم نہیں؟

کیونکہ اللہ ہماری نماز کو، نماز کے ہر رکن وعمل کو دیکھتے ہیں، ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابیؓ آخری صف میں نماز پڑھ رہے تھے، جب نماز ختم ہوئی تو آپ ﷺ نے ان صحابی کو بلا کر بڑے تیز وتند لہجے میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "ألاتتّقی اللّٰه ؟ ألا تریٰ کیف تصلیّ؟ (کیا تجھے اللہ کا ڈر نہیں ہے؟ کیا دیکھتا نہیں کہ تو نماز کیسے پڑھ رہا تھا؟) پھر فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ مجھے تم لوگوں کے حالات کا علم نہیں ہوتا، تمہاری ہر ہر چیز میرے سامنے آشکارا ہوتی ہے۔ (مسند احمد: ۱۰۰۴۹)

اور یہ مضمون ایک نہیں کئی حدیثوں سے ثابت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ میرے پیچھے جو نماز پڑھتے ہیں، ان کی ساری کیفیت میرے سامنے آشکارا ہوتی ہے، کوئی چیز مخفی نہیں ہوتی، حضور ﷺ پیچھے والوں کو بھی سامنے والوں کی طرح دیکھ لیتے تھے۔ اس میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پیچھے نماز پڑھنے والوں کی نماز کی کیفیات اور حالات کا علم جب آپ ﷺ کو ہو رہا ہے، تو بھائیو! کیا اللہ کو علم نہیں ہوگا؟ جبکہ وہ خدا تو علام الغیوب ہے، دلوں میں چھپے اسرار کو جاننے والا ہے، کیا اسے ہماری نماز کی خبر نہیں ہوگی؟ ضرور ہوگی۔ اگر یہ ایک بات ہماری سمجھ میں آ جائے تو ہماری نمازیں درست ہو جائیں۔

یہ چند اہم اشارات ارکان واعمال نماز کے بارے میں ہیں جن کی جانب اگر توجہ دی جائے تو ممکن ہے کہ ہماری نماز میں نکھار وسدھار پیدا ہو جائے اور نماز نماز بن جائے۔ کسی نے بہت خوب کہا ہے کہ:

نشانِ سجود تیری جبیں پر ہوا تو کیا

کوئی ایسا سجدہ کر کہ زمیں پر نشاں رہے

دعا ہے کہ اللہ تعالی ہماری نمازوں کو واقعی نماز بنادے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

بیعت کیا اور کیوں؟

باسمہ تعالیٰ

بیعت کیا اور کیوں؟

الحمد للّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . أما بعد

فقد قال اللّٰہ تعالی فی القرآن الکریم

أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَؤُوْفٌ بِالْعِبَادِ﴾
(لوگوں میں بعض وہ ہیں جو اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں اللہ کی رضا تلاش کرتے ہوئے، اور اللہ کی ذات بندوں پر بڑی رحیم کریم ہے)[البقرۃ:۲۰۷]

محترم بھائیو! آج ایک بات دیکھنے کو ملتی ہے، وہ یہ کہ انسان نے اپنی ذات کو دنیا کی ہر چیز کی لئے بیچنا شروع کر دیا، اور ذات ہی کو نہیں، اپنے ایمان بھی بیچنا شروع کر دیا ہے۔ دنیا حالانکہ بہت حقیر و ذلیل ہے مگر انسان اس حقیر و ذلیل دنیا کے لئے خود اپنی ذات کو بھی بیچ دیتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ایمان کو بھی بیچ دیتا ہے۔

بے ایمانی کا فتنہ

اور آج کے دور میں وہ حدیث پورے طور پر نہ سہی، ایک حد تک تو ابھی صادق آتی دکھائی دیتی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: " یُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِناً وَّ یُمْسِيْ کَافِراً وَّ یُمْسِيْ مُؤْمِناً وَّ یُصْبِحُ کَافِراً "یعنی ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ

آدمی صبح مومن ہوگا تو شام کو کافر اور شام میں مومن ہوگا تو صبح کافر، اس کے بعد فرمایا ایسا کیوں ہوگا؟ فرماتے ہیں کہ " **يَبِيعُ دِيْنَهُ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْيَا قَلِيْلٍ** "(یہ اپنے دین وایمان کو دنیا کے معمولی وحقیر سامان کے عوض بیچ دیگا) اس طرح صبح کا مومن شام کو کافر اور شام کا مومن صبح کو کافر ہوجائیگا۔ (مسلم: ۱/۷۵)

جان کے لئے ڈاڑھی دیدی

ایک صاحب میرے پاس آیا کرتے تھے، اور ان کے ماشاء اللہ اچھی خاصی ڈاڑھی بھی تھی، وہ ایک نیم سماجی ونیم سیاسی جماعت سے وابستہ ہوگئے، ایک بار میرے پاس آئے تو ان کی ڈاڑھی چھوٹی ہوگئی تھی، میں نے پوچھا کہ ڈاڑھی کو کیا ہوا؟ تو کہنے لگے کہ ہمیں اس جماعت کی جانب سے مختلف جگہ جانا آنا پڑتا ہے اور غیر قوموں سے بھی واسطہ پڑتا ہے، لہذا کچھ جان کا خطرہ رہتا ہے اس لئے ڈاڑھی کو چھوٹا کرلیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کی جماعت میں اور ہم میں یہی فرق ہے کہ آپ جان کی خاطر ڈاڑھی دیدیتے ہیں اور ہم ڈاڑھی کی خاطر جان دیدیتے ہیں۔ یہ ہے آج کا حال۔

خود کو اللہ کے لئے بیچ دو

ان حالات میں جبکہ لوگ جان کی خاطر ایمان وخدا کی مرضیات کو بیچ رہے ہیں، ہمارے سامنے قرآن نے ایک دعوت رکھی ہے، وہ یہ کہ تم اللہ کی مرضیات پر اپنے نفس وجان کو بیچ ڈالو، یہ نہیں کہ اللہ کی مرضی کو اپنی جان کی خاطر بیچو۔ اس وقت جو آیت میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے اس میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ: ﴿**وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِئُ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ**

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ لوگوں میں بعض وہ ہیں جو اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں اللہ کی رضا تلاش کرتے ہوئے، اور اللہ کی ذات بندوں پر بڑی رحیم کریم ہے)

خبر میں پیغام ودعوت

بظاہر اس آیت کے اندر ایک خبر دی گئی ہے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ تعالی کی مرضی تلاش کرتے ہوئے اپنے نفس کو بیچ ڈالتے ہیں۔ یہ ایک خبر ہے، لیکن قرآن کا ایک عجیب اصول وطریقہ ہے، وہ یہ کہ وہ خبر تو پیش کرتا ہے، لیکن خود خبر مقصود نہیں ہوتی بلکہ وہ خبر کے ذریعہ ایک دعوت دینا چاہتا ہے، ایک پیغام دینا چاہتا ہے، ایک حکم دینا چاہتا ہے۔ اس لئے علماء نے لکھا ہے کہ ہر خبر کے پیچھے ایک انشاء ضرور ہوتی ہے اور یہ صرف قرآن کے ساتھ خاص نہیں، یہ بلاغت کا قاعدہ ہے، جس کا بھی کلام بلیغ ہو اور وہ بلاغت کا حامل انسان جب کوئی خبر پیش کرتا ہے تو اس کے پیچھے ضرور کوئی انشاء اور دعوت موجود ہوتی ہے۔

اور قرآن تو سب سے زیادہ بلیغ کلام ہے، لہذا قرآن مجید میں بھی جو خبر [Report] آئے گی اس کے پیچھے کوئی دعوت و پیغام [Message] مقصود ہوگا، لہذا اس آیت میں بھی ایک خبر ہے تو اس کے پیچھے بھی اللہ کا یہ منشاء ہے کہ بندوں کو وہ یہ دعوت دینا چاہتے ہیں کہ اے میرے بندو! تم کو بھی اپنے آپ کو ان لوگوں کی طرح بنانا چاہئے جن کی خبر میں تم کو سنا رہا ہوں، لہذا تم بھی اللہ کے لئے اپنے نفسوں کو بیچ دو۔

آیت کا شان نزول

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بعض صحابہؓ کے بارے میں نازل ہوئی

ہے، ان میں متعدد صحابہؓ کے نام ذکر کئے گئے ہیں، حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کا ذکر بھی آتا ہے کہ جب انہوں نے ہجرت کا ارادہ کیا اور اس ارادے سے نکلے تو کافروں نے ان کو ایک جگہ پر گھراؤ میں لے لیا، کہنے لگے: صہیب! تم روم کے آدمی ہو، مکہ کے نہیں، تم مکہ میں آئے تھے تو تمہارے جسم پر کپڑا بھی نہیں تھا، جیب میں ایک پائی بھی نہیں تھی، تم مکہ آئے، یہاں آکر تم نے کمایا اور جمع کیا۔ اب اس کو پونجی بنا کر یہاں سے لے جانا چاہتے ہو؟ یہاں کی ایک پائی ہم باہر جانے نہیں دینگے، اگر تم کو جانا ہو تو تم تنہا جاؤ گے، تمہارے ساتھ کوئی چیز نہیں جائیگی۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے پہلے ان کو دھمکی دی اور کہا: میرے ترکش میں تیر بھرے ہوئے ہیں اور میں بہت بڑا تیرانداز ہوں، تم لوگ مجھے جانتے ہو، اگر تم لوگ میرے قریب آئے تو تیروں کی بوچھار کر دونگا اور اتنے تیر برساؤنگا کہ تم میں سے کوئی باقی نہیں رہے گا، اس پر وہ لوگ سہم گئے، اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ یہ بہت بڑے تیرانداز ہیں، لیکن دور ہی کھڑے رہے، جانے کا راستہ نہیں دے رہے تھے۔

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے کہا: میرا بہت سا مال میں اپنے ساتھ نہیں لے جارہا ہوں، جو مکہ میں چھوڑ دیا ہے، فلاں فلاں جگہ پر میں نے جمع کر کے رکھ دیا ہے، میں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم سب وہ سارا مال لے لو، بس یہ سن کر سارے کافر وہاں سے چلے گئے، اور واقعتاً انہوں نے مال چھوڑا بھی تھا۔ چنانچہ کفار و مشرکین اسے لینے چلے گئے اور حضرت صہیب رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ پہونچ گئے، اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (تفسیر قرطبی: ۲۰/۳)

بعض روایات میں کچھ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نام ہیں کہ ان کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی، مختلف نام ذکر کئے گئے ہیں، بہر حال مختلف صحابہؓ کے حالات پر اللہ تعالیٰ

نے یہ آیت نازل کی، اور نقشہ کھینچا کہ یہ لوگ ایسے لوگ ہیں، جنہوں نے اللہ کے نام پر اپنی جان و مال کو بیچ دیا اور اپنے مال و جان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

لفظ ''شَرٰی'' کی تحقیق اور آیت کا خلاصہ

اس آیت میں ایک لفظ ''یَشْرِیْ'' آیا ہے، یہ ''شَریٰ یشری '' سے بنایا گیا ہے، اس کے عربی میں دو معنی آتے ہیں: بیچنے کے بھی آتے ہیں، خریدنے کے بھی آتے ہیں، بعض لوگوں نے یہاں خریدنے اور بعض لوگوں نے بیچنے کے معنی لئے ہیں، جمہور نے اسے بیچنے کے معنی میں لیا ہے، اور خریدنے کے معنی میں بھی آنے کی تائید ایک آیت سے ہوتی ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **''اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ''** (بیشک اللہ نے مسلمانوں کے جانوں اور مالوں کو ان سے خرید لیا، اس بات کے عوض میں کہ انہیں جنت دیگا) (التوبۃ:۱۱۱)

اس آیت میں ''اشتری'' خریدنے کے معنی میں لیا گیا ہے، اور اس آیت میں بھی وہی مضمون ہے جو پہلی آیت میں ہے، لہٰذا دونوں آیتوں کا خلاصہ اور مطلب یہ ہوا کہ بندہ اللہ کی مرضی تلاش کرتے ہوئے اپنے نفس کو بیچ دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کو بندہ سے خرید لیتے ہیں۔

علماء نے لکھا ہے کہ یہ اللہ کیلئے اپنے نفس کو بیچ دینا کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ نفس ہماری ملکیت نہیں، نفس کو پیدا کرنے والا، یعنی ہماری ذات کو بنانے والا اللہ ہے، اللہ خود اس کا مالک ہے، ہمارے پاس تو محض امانت کے طور ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ کی رحمت پر قربان جایئے کہ اللہ تعالیٰ یہ نفس بنا کر ہمیں گویا مالک بنادیا ہے کہ تم اب اس کے مالک ہو اور تم اس میں تصرف کرنے کے مجاز ہو۔ پھر اس کے

بعد کہا کہ تمہاری یہ چیز مجھے بیچ دو، میں اس کا خریدار ہوں، اور میں اس کے بدلہ میں تمہیں جنت عطا کرونگا۔ اندازہ کیجئے کہ کتنی بڑی اللہ کی رحمت ہے، کہ اپنی مملوک چیز کو اولاً ہماری کہہ کر ہماری نفسیاتی الجھن کو دور کردیا، حالانکہ ہم اس کے مالک نہیں، بلکہ خود اللہ ہی اس کے مالک ہیں، پھر اس کو ہم سے خرید کر اس کے بدلہ میں جنت کا وعدہ فرمایا، اپنی ہی چیز ہم سے لیکر اس پر جنت عطا کرنا کیا عین رحمت وکرم نہیں ہے؟

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باپ اپنے بچے کو دو روپیہ دیتا ہے، اس کے بعد دوسرے دن اس کو کہتا ہے کہ بیٹا! تمہارے وہ دو روپے تم ہم کو دیدو، تو دس روپے ہم تم کو دیتے ہیں۔ اب وہ دو روپے جو پہلے سے بیٹے کے پاس تھے وہ کس کے ہیں؟ باپ ہی کے تو ہیں، اب وہی باپ مزید دینا چاہتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ وہ دو روپے ہم کو دیدو، اس کے بدلہ میں ہم دس روپے دیں گے، اب بچہ خوشی سے دو روپے دیکر دس روپے لے لیتا ہے، حالانکہ وہ دو روپے اور یہ دس روپے دونوں ہی باپ کے ہیں۔

اسی طرح یہ جان بھی اللہ کی اور جنت بھی اللہ کی ہے، لیکن اللہ نے جان دیکر کہا کہ تم اپنی سمجھ لو اور مجھے دیدو، میں جنت تمہیں دیدونگا۔

نفس کو بیچنے کا حاصل

اب یہ سمجھنا ہے کہ اللہ کو نفس بیچنے کا مطلب کیا ہے؟ اللہ کو نفس و جان بیچنے کے متعدد مطالب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ جہاد میں اپنی جان و نفس کی قربانی دی جائے، اور ایک یہ ہے کہ ہمارے تمام کام و اعمال، ہمارے اخلاق، ہماری خواہشات ولذات، یہ ساری چیزیں اللہ کی مرضی کے مطابق ہوتی رہیں، ہماری مرضی کے مطابق نہیں؛ بلکہ غور کریں تو جہاد بھی اسی لئے قابل لحاظ وقابل تعریف عمل ہے کہ اس

میں اللہ کی مرضی پر اپنی جان دیدی، اگر اللہ کی مرضی پر جان نہ دی جائے بلکہ اس میں اپنے نفس کی کسی خواہش کا دخل ہو تو وہ جہاد بھی قابل تعریف نہیں رہتا اور اس کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ لہذا خلاصہ یہ ہوا کہ اپنی ہر چیز اللہ کی مرضی پر استعمال کی جائے اور اس کی مرضی پر اپنی مرضی کو قربان کر دیا جائے، یہ ہے اللہ کے نام اپنے کو بیچ دینا۔

کیونکہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز آپ دوسرے آدمی کو بیچ دیتے ہیں تو وہ چیز اس کی ہو جاتی ہے، اس کی ہو جانے کے بعد آپ اپنی مرضی اس میں نہیں چلا سکتے، اسی طرح جب ہم نے اپنی جان و مال اللہ کو بیچ دیا اس میں ہم اپنی مرضی نہیں چلا سکتے بلکہ اللہ کی مرضی اس کے اندر چلنی چاہئے۔

ایک گھر آپ نے بنایا، بنانے کے بعد آپ نے [sale] کا آفر [Offer] دیا، لوگ خریدنے کے لئے آئے، آپ نے ایک صاحب کو وہ مکان بیچ دیا، اور مکان آپ نے اس کے حوالہ کر دیا۔ اب بتائیے کہ اس مکان میں آپ کی مرضی چلے گی یا اس کی جس نے اسے خریدا ہے؟ اسی طرح جب ہم نے اپنے نفس کو اللہ کے نام بیچ دیا ہے، اور اللہ نے اس کو خرید لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہماری مرضی نہیں چلے گی، بلکہ اللہ کی مرضی کے مطابق اس کو استعمال کرنا ہوگا۔

لہذا ہم اپنی مرضی سے آنکھ استعمال نہیں کر سکتے، اپنی مرضی سے کان استعمال نہیں کر سکتے، اپنی مرضی سے دل استعمال نہیں کر سکتے، ہر عضو کے استعمال کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے پوچھنا پڑے گا کہ کیا میں اس جگہ استعمال کر سکتا ہوں؟ اگر اجازت ملے تو کر سکتے ہیں، ورنہ نہیں کیونکہ یہ ساری چیزیں اب آپ کی نہیں، بلکہ اللہ کی ہیں۔

جدھر میرا مولیٰ ادھر شاہ دولہ

ایک بزرگ کی حکایت یاد آئی کہ شاہ دولہ ایک بزرگ تھے، ان کا قصہ ہے کہ شاہ دولہ کے وطن میں ایک مرتبہ طوفان بپا ہوا، اوران کے وطن کے قریب ایک بہت بڑی نہر بہتی تھی، طوفان کی وجہ سے اس نہر کا رخ شہر کی طرف ہونے لگا، تو سارے لوگ گھبرا گئے، اور کہنے لگے کہ اگر ایسا ہوا تو پھر سارا شہر ڈوب جائے گا، اس لئے چلو کسی اللہ والے سے دعا کروالیں، وہاں شاہ دولہ بزرگ موجود تھے، لوگ ان کی خدمت میں آکر کہنے لگے کہ حضرت! اس وقت نہر کا رخ شہر کی طرف ہے اور خطرے کی یہ صورت ہے، اگر ایسا ہوا تو پھر سارا شہر ڈوب جائیگا، اللہ تعالیٰ سے آپ دعا کر دیجئے کہ وہ ہم سب کو بچالے۔

توانہوں نے آنے والوں سے کہا کہ تمہارے پاس پھاوڑے ہیں؟ تو کچھ لوگوں نے کہا کہ ہاں ہیں، کہا کہ جاؤ پھاوڑے اٹھا لاؤ، لوگ پھاوڑے لیکر وہاں پہونچے، اور شاہ صاحب کے ہاتھ میں تھما دئے، شاہ دولہ ان کو لیکر نہر کے اس کنارے پہونچ گئے جہاں سے پانی آنے کا اندیشہ تھا اور کہنے لگے کہ یہ جو مینڈ لگی ہوئی ہے، اس کو کھودو تا کہ پانی ادھر کو آجائے۔ لوگ کہنے لگے کہ حضرت! یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم تو یہ کہنے کیلئے آئے تھے کہ اس سے بچیں، یہ تو ہم سے وہ کام کروا رہے ہیں جس سے کہ شہر ڈوب جائے گا، کہا کہ حضرت یہ کیا؟ اس سے تو شہر ڈوب جائیگا۔

اس پران بزرگ نے ایک جملہ کہا کہ ''جدھر میرا مولیٰ ادھر شاہ دولہ'' یعنی جو میرے مالک کی مرضی ہے وہی شاہ دولہ کی مرضی ہے، میں کوئی کام میرے رب کی مرضی کے خلاف نہیں کرونگا۔ دیکھئے کس طرح اللہ والے اپنی مرضیات کو اللہ کی مرضی

کے تابع کردیتے ہیں؟ یہ ہے اپنے نفس کو اللہ کے نام پر بیچ دینا۔

بڑا نفع بخش کاروبار

بھائیو! یہ کاروبار جو اللہ سے بندہ کرتا ہے یہ بہت بڑا کاروبار ہے، معمولی کاروبار نہیں ہے، اس میں ایک جانب بندہ اپنی جان و مال پیش کرتا ہے اور دوسری جانب اللہ ایک تو جنت پیش کرتا ہے، اور دوسرے جہنم سے نجات کا وعدہ کرتا ہے۔ جنت کا وعدہ تو اوپر کی آیت میں آپ نے سن لیا، اور جہنم سے نجات کا وعدہ اس آیت میں ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾ (کیا میں تمہیں ایسی تجارت کا پتہ نہ دوں جو تجارت کہ تمہیں جہنم کے عذاب سے بچانے والی ہے) (الصّف:۱۰)

جہنم کے دردناک عذاب سے بچانے والی، یہ ہے وہ تجارت جس میں آدمی اپنے خواہشات کو اپنے اندر کے جذبات وخیالات کو اپنے تصورات تک کو اللہ کے نام بیچ دیتا ہے، کتنی عظیم تجارت ہے۔

بیعت کی حقیقت

اس کے بعد مجھے اس وقت یہیں سے ایک مضمون سمجھانا ہے، آیت کی تفسیر میں نہیں لیکن اس کی تفسیر سے نکالا ہوا ایک مضمون۔ وہ یہ کہ جب اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ خود کو اللہ کے نام بیچنے کی تعلیم فرمائی گئی ہے تو صوفیہ اور بزرگوں کے یہاں جو ایک سلسلہ چل رہا ہے، جس کا نام ہے ''بیعت''، اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ وہ کس طرح؟ میں اس وقت اسی کو سمجھانا چاہتا ہوں۔

پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ بیعت کا معنی کیا ہے؟ یہ لفظ ''بیعت'' ''بَاعَ يَبِيْعُ'' کا ماخذ

ہے، جس کے معنی ہیں ''بیچنا'' جو معنی ''شریٰ یشری'' کے ہیں، وہی اس کے بھی ہیں، لفظ کا فرق ہے، لیکن معنی وہی ہے، تو بیعت کے معنی ہیں بیچنا۔

جب آدمی کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ کو واسطہ بنا کر اللہ تعالی سے خرید وفروخت کا ایک معاملہ کرتا ہے، یعنی اپنی نفس کو اللہ کے ہاتھ بیچتا ہے اور اللہ تعالی اس کو جنت عطا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ ہے ''بیعت'' جو مشائخ کے یہاں جاری ساری ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بیعت میں اصل اللہ سے معاملہ ہوتا ہے اور شیخ صرف درمیان میں واسطہ ہوتا ہے، لہذا بیعت بھی دراصل اللہ کے نام اپنی جان ونفس کو بیچنا ہی ہے، اور اس کا حکم اور اس کی ترغیب پہلے معلوم ہو چکی، لہذا بیعت بھی اسی سے ثابت ہوگئی، کیونکہ اس حکم ہی کی ایک صورت وشکل یہ بھی ہے۔

شیخ کی حیثیت

اب رہا یہ سوال کہ پھر شیخ کی کیا ضرورت ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اصل تو اللہ ہی سے یہ معاملہ ہے مگر جیسے دنیوی کاروبار میں بھی ماہر لوگ ''کاروباری ایجنٹ'' ہوتے ہیں جو آپسی معاملہ طے کراتے اور اس کی باریکیاں سمجھاتے ہیں اور اس میں رہبری ورہنمائی کرتے ہیں، اسی طرح بیعت یہ ہے کہ جو معاملہ بندہ اور اللہ کے مابین ''بیعت''، یعنی نفس کو بیچنے وخریدنے کا ہو رہا ہے، اس میں شیخ ایک واسطہ ہوتا ہے، بندے اور اللہ کے درمیان ہونے والی عظیم تجارت کا۔ یوں سمجھئے کہ شیخ گویا ایجنٹ [Ajent] ہوتا ہے، اس لئے کہ شیخ کو اس میں مہارت ہوتی ہے، وہ اللہ تعالی کی مرضیات ونامرضیات سے بخوبی واقف ہوتا ہے، اس راہ کی باریکیوں سے واقف ہوتا ہے۔

اب اس تجارت کے درمیان جو کچھ معاملے ہوتے ہیں، شیخ کو اس کی اطلاع دیتے رہنا ہے کہ جناب میں نے بیچ تو دیا ہے، لیکن اب جی نہیں چاہ رہا ہے، وہ کہے گا بے وقوف! بیچ تو دیا، اب جی نہیں چاہ رہا ہے، یہ معاملہ فسخ نہیں ہوگا، اس کو ٹھیک کر کے چلاؤ۔ تم نے بیچ تو دیا پیسے تو لے لئے یعنی جنت اس لئے کسی طرح نبھاؤ۔ اب وہ سکھاتا رہیگا، بتاتا رہیگا، وقت وقت پر مشورے دیتا رہیگا تا کہ معاملہ ٹھیک چلتا رہے۔

میں نے جو کہا کہ شیخ صرف واسطہ ہے اور اصل معاملہ تو اللہ سے ہے اس کی دلیل بھی سن لیجئے، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیعت کا ذکر کیا ہے اور اس میں اللہ کے نبی ﷺ جو لوگوں کو بیعت لیا کرتے تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ، يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ﴾

(اے محمد ﷺ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں یہ حقیقت میں اللہ سے بیعت کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے) (الفتح:۱۰)

عربی پڑھنے والے جانتے ہیں کہ "اِنَّمَا" حصر کا مفہوم دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اے نبی ﷺ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں وہ صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں کسی اور سے نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے بیعت کو اپنی جانب منسوب کیا ہے، حالانکہ ظاہراً وہ نبی ﷺ کے ہاتھ پر ہو رہی تھی۔ اسی طرح اس سلسلہ میں جو لوگ شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں تو سمجھنا چاہئے کہ وہ اللہ سے بیعت ہو رہے ہیں، معاملہ اللہ سے ہو رہا ہے۔ گویا بندہ کہہ رہا ہے کہ اے اللہ! میں بیچتا ہوں تو خریدتا ہے اے اللہ! اب یہ جان میری نہیں، مال

میرا نہیں، اس لئے اے اللہ! اس میں اب میری نہیں، آپ کی مرضی چلے گی، میں اپنی آنکھ کو تیری مرضی کے خلاف نہیں استعمال کرونگا، نہ ہاتھ پیر کو، نہ میرے کسی عضو کو، تیری مرضی کے خلاف کوئی عمل نہیں کرونگا۔ یہ ہے حقیقت بیعت کی۔

شیخ کی ضرورت

اس سے شیخ کی ضرورت بھی سمجھ میں آ گئی، کہ شیخ اس راہ کا ماہر ہونے کی وجہ سے ہماری رہبری کرتا ہے۔ ورنہ بہت سے لوگ اللہ سے معاملہ کو توڑ دیتے اور اس کے تقاضوں کے خلاف چل کر اس کو فاسد کر لیتے ہیں۔ نیز شیخ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ہمیں ہمارے ان اعضاء کو کس طرح اللہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرنا چاہئے جنھیں ہم نے اللہ کے نام پر بیچ دیا ہے، اور چونکہ شیطان ہمارے پیچھے لگا ہوا ہے اور وہ ہمیں غلط مشورے دیتا ہے اور ہماری بیعت و معاملہ کو توڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اس لئے بھی شیخ کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ ہمیں وقتاً فوقتاً رہبری کرتا رہے۔

بیعت کی برکت اور حضرت گنگوہی کا واقعہ

اور دوسری بات یہ ہے کہ بیعت ہونے سے بزرگوں کے سلسلہ کی برکات بھی نصیب ہوتی ہیں، اور انسان کے لئے مجاہدہ و عمل آسان ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ تھے اور ان کو خلافت صرف چالیس دن میں ملی، صرف چالیس دن میں وہ منزلیں طے کرتے کرتے نسبت مع اللہ کی دولت سے مشرف ہو گئے تھے، ان کا قصہ عجیب ہے، حضرت حاجی صاحبؒ تھانہ بھون کی خانقاہ میں رہتے تھے، رشید احمد گنگوہیؒ جوان آدمی تھے، جوانی کا بڑا جوش و جذبہ تھا، تھانہ بھون میں ایک بہت بڑے عالم شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ رہتے تھے،

کسی مسئلہ میں ان بزرگ سے مولانا کواختلاف تھا،توان سے مناظرہ کرنے کی نیت سے وہ تھانہ بھون گئے،راستے میں حضرت حاجی امداداللہ صاحب کی خانقاہ نظر آئی،توسوچنے لگے کہ حاجی صاحب یہاں رہتے ہیں،بزرگ آدمی ہیں،ملاقات کرلینا چاہئے،تو ملاقات کرنے چلے گئے،حاجی صاحب نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو؟ کہا کہ گنگوہ سے آیا ہوں،پوچھا کیوں آئے؟ کہا کہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب سے فلاں مسئلہ میں مناظرہ ومباحثہ کرنے کیلئے آیا ہوں۔

حاجی صاحب نے کہا کہ بھائی! وہ تو تمہارے سے بڑے عالم ہیں،مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ تم ان سے مناظرہ کرو،لہذا یہ خیال ترک کردو۔حضرت حاجی صاحب کی بات ان کے دل میں آگئی تو کہا کہ ٹھیک ہے،جب ایک بزرگ کہہ رہے ہیں تو مان لیتا ہوں،کہ ان سے مناظرہ نہیں کروں گا۔پھر وہیں خانقاہ میں رات میں ٹھیر گئے۔جب صبح سحری کا وقت ہوا تو دیکھا کہ حاجی صاحب کے مریدین اور بہت سارے ذاکرین،شاغلین،طالبین موجود ہیں اور ذکر ودعاء،نماز وتلاوت وغیرہ عبادات میں مشغول ہیں،اور ایک عجیب کیفیت وسماں نظر آنے لگا،جب یہ دیکھا تو دل میں یہ خیال آیا کہ مجھے بھی بیعت ہوجانا چاہئے،پھر حاجی صاحب سے بیعت کی درخواست کی کہ حضرت مجھے بیعت کرلیجئے۔حضرت نے کہا کہ بہت اچھا اور بیعت کرانے تیار ہوگئے۔اس لئے کہ حاجی صاحب سے جو بھی بیعت کی درخواست کرتا تو اسے فوراً قبول کرلیتے تھے۔

پھرنے اور پھر جانے والے نہیں چاہئیں

بزرگوں کے الگ الگ معاملات واصول ہیں،بعض ایسے ہیں جو بہت پھراتے ہیں،پھراتے کیوں ہیں؟اس لئے کہ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ پھرنے والا یا پھر

جانے والا تو نہیں؟ پھرنے والا وہ ہے جو ایک جگہ اطمینان سے یکسوئی سے نہیں رہتا، بلکہ شیخ بدلتا رہتا ہے، آج یہاں اور کل وہاں، اور پھر جانے والا وہ ہے جو پھر آتا ہی نہیں، بس ذرا سا جزبہ ابھرتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا مشائخ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ پھرنے یا پھر جانے والا تو نہیں، بلکہ یہاں تو پھر آنے والا ہونا چاہئے، پھر جانے والا نہیں، اس لئے اسے پھراتے ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ بیعت کی درخواست کی تو فوراً قبول کرلیا، حاجی صاحب کا بھی یہی معاملہ تھا۔ کسی کے پوچھنے پر کہ حضرت! آپ ہر ایک کو فوراً کیوں بیعت کر لیتے ہیں؟ فرمایا کہ ہاں! اس لئے کر لیتا ہوں کہ معلوم نہیں کون سا اللہ کا بندہ نیک اور مقبول ہوگا، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیگا تو میری مغفرت ہو جائے گی۔ اللہ اکبر! کیا عاجزی، کیا سادگی ہے۔

الغرض حاجی صاحب نے بیعت کی، اب بیعت کے وقت بزرگوں کا معمول ہے کہ وہ کچھ معمولات بتاتے ہیں، حاجی صاحب بتانے جا رہے تھے کہ مولانا رشید احمد صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! میری ایک درخواست ہے، وہ یہ کہ مجھے صبح تہجد کے لئے اٹھا نہیں جاتا، اس لئے وہ ایک کام چھوڑ کر دوسرا جو چاہے حکم کیجئے۔ حضرت نے کہا ٹھیک ہے جو تم کر سکتے ہو کر لینا، لیکن میں نے تمہاری ایک شرط مان لی، تم بھی میری ایک شرط مان لو، وہ یہ کہ میرے پاس چالیس دن قیام کرو۔ مولانا رشید احمد صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ اب چالیس دن کی نیت کر کے خانقاہ میں رہ گئے، جب دوسرے دن صبح ہوئی تو سالکین ذکر وفکر میں اور رونے دھونے میں مشغول ہیں، کوئی نماز پڑھ رہا ہے، کوئی ذکر کر رہا ہے، کوئی دعاء میں ہے کوئی تلاوت کر رہا ہے۔ اب ان کو نیند کہاں آئیگی؟ دو چار منٹ بستر پر پڑے کروٹیں بدلتے رہے، پھر ان کو بھی شرم آنے لگی کہ سب تو ذکر وعبادت میں ہوں اور تو پڑا

رہے! تو خود ہی اٹھکر تہجد پڑھنے لگے اور ذکر میں مشغول ہوگئے، اب روز ایسا ہی ہونے لگا، اور دو چار دن بعد خود ہی طبیعت کے اندر داعیہ پیدا ہونے لگا کہ صبح اٹھو اور عبادت کا چسکہ پاؤ۔ لہذا سب سے پہلے اٹھنا شروع کر دیا، حالانکہ بیعت کے وقت تو یہ شرط لگائی تھی کہ صبح کو نہیں اٹھونگا، لیکن صحبت اولیاء کی برکت سے سب سے پہلے اٹھنا شروع کر دیا، پہلے تو جبراً اٹھتے تھے، لیکن پھر قصداً اٹھنا شروع کر دیا، جب اسی طرح چالیس دن گزگئے تو حاجی صاحب نے خلافت عطا کر دی۔

جب تھانہ بھون سے رخصت ہوئے اور اپنے وطن گنگوہ پہنچ گئے تو کئی مہینے ہوگئے، اور حاجی صاحب کو ان کے حالات کا کچھ پتہ ہی نہ چلا، نہ خیر نہ خیریت، نہ حال واحوال، تو حاجی صاحب نے مولانا کے نام ایک خط بھیجا، اس میں لکھا کہ تمہاری کوئی خبر نہیں معلوم ہوئی، بندہ کو تشویش ہوئی، اس لئے اپنے حالات سے مطلع کیجئے، یہ خط پہونچا تو اس کو پڑھا اور جواب لکھا کہ حضرت! میں نے اپنے حالات اس لئے نہیں لکھے کہ بندہ کا کوئی حال ہے ہی نہیں تو کیا لکھوں؟ اس کے بعد لکھا کہ بس اتنا میں اپنے اندر محسوس کرتا ہوں کہ کسی کی کوئی مدح وذم کا کوئی اثر بندہ پر نہیں ہوتا، دوسری بات یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں آئی ہوئی تعلیمات میں کسی جگہ کسی قسم کا شک نہیں ہوتا۔

بھائیو! بیعت کی برکت اور اہمیت وضرورت کا ااندازہ کرو کہ بزرگوں کی نظر انسان کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔

مرید کی تعریف، حضرت گنگوہی کا قصہ

مگر ایک بات یاد رکھئے کہ شیخ کی باتوں کو بغیر چوں وچرا مان کر چلیں گے تو فائدہ ہوگا، اور اگر شیخ کی چلانے کے بجائے خود اپنی چلانے لگے اور شیخ کے

مشوروں کو عمل میں نہ لائے تو اس کو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اسی لئے مرید کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اپنی رائے نہ چلائے ، اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا کہ ایک طالب علم سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں آ کر کہنے لگا کہ حضرت! میں آپ سے مرید ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ مرید ہونے آئے ہو؟ اچھا یہ بتاؤ کہ مرید کے معنی کیا ہے؟ طالب علم تھا، عربی صرف پڑھا ہوا تھا، اس نے گردان شروع کر دی، ''أَرَادَ ، یُرِیْدُ ، اِرَادَةً فھو مُرِیْدٌ'' اس نے کہا کہ حضرت! کسی کام کے ارداہ کرنے والے کو مرید کہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ غلط ہے، صحیح نہیں، اب بیچارہ سوچنے لگا کہ اس میں کیا غلط ہے، ہمارے اساتذہ نے یہی پڑھایا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ ''فصول اکبری'' بھی پڑھی ہے؟ فصول اکبری عربی صرف کی ایک کتاب ہے، اس کے اندر بہت سے مضامین کے ساتھ خاصیات ابواب کا بیان بہت تفصیل کے ساتھ آیا ہے، تو اس طالب علم نے جواب دیا، جی ہاں پڑھی ہے ، فرمایا کہ ''باب افعال'' کی خصوصیات کیا ہیں؟ اب اس نے گنانا شروع کیا، اس میں ایک خصوصیت یہ گنائی کہ ''سلب ماخذ''۔ حضرت نے کہا کہ کیا مطلب ہے؟ کہا کہ ماخذ کو سلب کر لینا اور ماخذ کی نفی کر دینا، کہا کہ ٹھیک ہے، اب اس خصوصیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرید کا معنی یہ ہوتا ہے ارادہ کو سلب کر لینا یعنی ارادہ نہیں کرنا۔ تو مرید کے معنی ہوئے ارادہ نہیں کرنے والا۔ حضرت نے کہا کہ مرید کون ہوتا ہے؟ جو ارادہ نہیں کرتا یعنی اپنی مرضی و ارادہ سے کوئی کام نہیں کرتا، اس لئے کہ اس نے اللہ کی مرضی پر سب کچھ چھوڑ دیا ہے، جس نے بیعت کرتے ہوئے سب کچھ اللہ کی مرضی پر چھوڑ دیا، اس نے گویا یہ کہہ دیا کہ اے میرے

مالک وخالق میں نے اپنی جان ومال کو تیرے حوالہ کردیا اور تجھے بیچ دیا، اب اس میں میری مرضی نہیں چلے گی جو چلے گا وہ تیرا ارادہ اور تیری مشیت چلے گی۔

فرمایا کہ یہ معنی سمجھ کر جو بیعت کرتا ہے کہ مجھے کسی کام کا ارادہ نہیں کرنا ہے، بلکہ شیخ کی جانب سے اس راہ کے بارے میں جو کہا جائے اس پر عمل کرتے رہنا ہے، وہ ہوتا ہے حقیقی مرید، اور جو ارادے پر ارادے کرتا ہے، شیخ ایک کہتا ہے اور اس کا ارادہ الگ ہوتا ہے، قرآن وحدیث ایک کہتی ہے، اس کا ارادہ الگ۔ تو بھائی یہ مرید نہیں ہے یہ تو مراد ہو گیا۔

الغرض جو شخص کسی سے بیعت ہو کر اپنی اصلاح کرانا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ اپنے شیخ کی اتباع کرے اور اس کے مشورے پر قائم رہے۔

نفس کو بیچ دینے کے بعد تین باتیں ضروری ہیں

اب آخر میں ایک بات اور سن لیں کہ جب اللہ کے نام ہم اپنے آپ کو بیچ دیں تو اس میں تین باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ جب ہم نے نفس کو اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے تو اب اگر اللہ حکم دے کہ نماز پڑھو تو پڑھنا پڑے گا، اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو پھر اللہ تعالیٰ ہم سے پوچھے گا کہ تمہاری مرضی تم نے کیوں چلائی؟ ہماری مرضی کیوں نہ چلائی؟ اگر اللہ روزہ رکھنے کا حکم دے تو اسے ماننا ضروری ہوگا۔ اسی طرح جتنے احکامات ہیں سب کے بارے میں یہی حکم ہے، زکوۃ ہے، حج ہے، ذکر وتلاوت ہے وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کہے گا کہ یہ میری مشین ہے جسے تم نے بیچ دیا ہے، اب اس میں میرا تصرف چلے گا تمہارا نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن جن باتوں سے دور رہنے اور پرہیز کرنے کو کہہ دیا ہے ان سے پرہیز کرنا بھی ضروری ہے، اس نے کہہ دیا کہ شراب

نہیں پینا، زنا نہیں کرنا، جھوٹ نہیں بولنا، دھوکہ نہیں دینا، جھوٹ وغیبت میں یہ زبان جس کا میں مالک ہوں، اس میں اس کو استعمال نہیں کرنا، ہاتھ کو چوری کیلئے اور پیروں کو غلط جگہ جانے کیلئے استعمال نہیں کرنا، یہ اللہ نے قانون بنا کر ہم کو بتا دیا کہ یہ ہے قانون۔ اگر قانون کی خلاف ورزی ہوئی تو بیع کے وعدے کے خلاف عمل ہونے کی وجہ سے بیع ٹوٹ جائے گی، فسخ ہوجائے گی، اب بغیر سزا جنت کیسے ملے گی؟ جنت کا تو مدار اسی پر تھا کہ جو تم نے دیدیا ہے وہ دیدو اس میں اپنا کچھ تصرف نہ کرو، اگر تم نے تصرف کردیا تو پھر جنت کا کیا سوال؟ لہذا ممنوعات سے اجتناب ضروری ہے۔

تیسری بات بڑی اہم ہے وہ یہ کہ یہ نفس ہم نے بیچ دیا، مالک اللہ ہے، وہ اگر اس میں کچھ تصرف کرنے لگے۔ مثلاً بخار داخل کردی، پیٹ و سر میں درد ہونے لگا یا اور کوئی بات پیش آگئی، جس کو حوادث و پریشانیاں آفتیں و مصائب کہتے ہیں، یہ سب کا سب وہیں اوپر سے ہوتا ہے۔ اور ہم کہنے لگیں کہ اللہ نے مجھے کیوں بخار دیدی، یا اللہ نے ہمارے کسی رشتہ دار کو موت دیدی، انتقال ہوگیا، تو اس میں ہمیں کوئی حق نہیں کہ کچھ بولیں، بلکہ سب کچھ اس کا ہے اور اسی کا چلتا ہے۔

یہ تین چیزیں "یشری نفسه" میں داخل ہیں، جب بندہ یہ تینوں کام کرے گا تو سمجھو کہ اس نے اپنے نفس کو بیچ دیا، جب بیچا تو عوض میں اللہ اسے جنت دیگا۔

اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالی ہمیں بھی ان مقربین میں شامل کرلے جنھوں نے اللہ کے لئے اپنے نفسوں کو بیچ کر اس کے عوض جنت خرید لی۔ آمین یارب العالمین۔

اطاعت مومن کی حیات ہے

باسمہ تعالیٰ

اطاعت مومن کی حیات ہے

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ . امابعد
فقد قال اللّٰہ تعالی فی القرآن الکریم
أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم ، بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم
﴿یاأَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْااسْتَجِیْبُوْالِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَایُحْیِیْکُمْ﴾

دینی بھائیو!

یہ سورۂ انفال کی ایک آیت ہے ،جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشادفرماتے ہیں کہ:

''اے ایمان والو! جب اللہ اوراس کارسول تمہیں دعوت دے اور بلائے اس چیز کی طرف جوتمہیں زندگی بخشنے والی ہےتوتم اللہ اوراللہ کے رسول کی دعوت پر لبیک کہو''اورآج کل چونکہ انگریزی زبان رائج ہےتو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا Reply دواور Response دو۔

مذکورہ آیت میں ایک خاص قسم کامضمون ہے،سب سے پہلی بات جو یہاں قابل غور ہے،وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ''جب اللہ اوراللہ کارسول دعوت دےتوتم اسکی دعوت کوقبول کرو''،ظاہر بات ہے کہ جب کوئی دوسراآدمی ہم کودعوت دےتوحکم ہے کہ ہم اس کی دعوت کوقبول کریں۔

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ ایک مومن کے دوسرے مومن پر پانچ حق ہیں، ان میں سے ایک حق یہ ہے کہ وہ دعوت دے تو اس کی دعوت کو قبول کرے۔ (مسلم: ۳۷۶۴)

جب ایک عام مومن کی دعوت قبول کرنے کا حکم ہے تو کیا خیال ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ہم کو دعوت دے اور ہم اس کو ٹھکرا دیں؟ کیسے ہوسکتا ہے؟ دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ دعوت کئی قسم کی ہوتی ہے، کوئی کھانے کی دعوت پر بلاتا ہے، کوئی چائے کی دعوت دیتا ہے اور کوئی جلسہ کی دعوت دیتا ہے، اس طرح لوگ دنیا میں مختلف قسم کی دعوتیں دیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول کس بات کی دعوت دیتے ہیں؟ اس آیت میں اس کا جواب دیا گیا، فرمایا کہ ''لِمَا يُحْيِيكُمْ'' کہ اللہ اور اس کا رسول تمہیں اس چیز کی دعوت دیتے ہیں جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین دراصل مومن کی حیات و زندگی کا سامان ہے، لہذا دعوتِ دین کو، اور پیغامِ الٰہی و پیغام نبوی کو قبول کرنے ہی میں ہماری زندگی ہے اور اگر اس دعوت دین و پیغام الٰہی کو قبول نہیں کریں گے تو زندگی نہیں ملے گی۔

دین ہے تو انسان زندہ ہے

اسی وجہ سے قرآن کریم نے کافر کو مردہ کہا ہے، چنانچہ ایک جگہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿أَوَمَنْ كَانَ مَيْتاً فَأَحْيَيْنَاهُ﴾ (کیا وہ جو مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ کیا) (الأنعام: ۱۲۳)

علماء لکھتے ہیں کہ اس آیت میں مردہ سے مراد کافر ہے اور زندہ کرنے سے مراد ایمان عطا کرنا ہے، معلوم ہوا کہ ایمان دراصل زندگی ہے اور کفر دراصل موت

ہے، اسی بات کو پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دوسرے الفاظ میں کہا کہ جو چیز کہ تم کو زندگی دینے والی ہے، اس چیز کو تم قبول کرلو، اگر تم اس کو قبول نہیں کروگے تو مردہ رہوگے، زندہ نہیں رہوگے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو اور اپنے احکامات کو اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو ''لِمَا یُحْیِیْکُمْ'' سے تعبیر کیا۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ زندگی دراصل دین کے اندر ہے، اگر دین ہے تو انسان زندہ ہے اگر دین نہیں ہے تو انسان مردہ ہے۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں ''اَلدِّیْنُ هُوَ الْحَیَاةُ '' (دین تو حیات کا نام ہے) یا یوں کہہ سکتے ہیں'' اَلدِّیْنُ هُوَ رُوْحُ الْاِنْسَانِ''(دین انسان کی روح ہے) جب انسان کے اندر وہ روح یعنی دین آئیگا تب ہی وہ زندہ رہیگا اور اگر وہ روح نکل گئی تو سمجھو کہ وہ مردہ ہوگیا۔

مردہ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی

بھائیو! آج ہم لوگ بہت ساری شکایتوں کی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ دنیا میں ہماری کوئی بات نہیں چلتی اور لوگوں کی نگاہوں میں ہمارا کوئی مقام نہیں، ہماری کوئی شان وشوکت نہیں، لیکن کبھی اس پر بھی غور کیا کہ مردہ کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟ کیا مردہ کو اسٹیج پر لاکر بٹھایا جاتا ہے یا قبر میں دفن کیا جاتا ہے؟ انسان کی حیثیت اسی وقت تک ہے جب تک کہ وہ زندہ ہے، ظاہری زندگی میں بھی یہی ہے کہ جب تک ظاہر میں زندہ ہے، لوگ اس کی حیثیت کو مانتے ہیں، اگر اس کے اندر سے روح نکل جائے، تو وہ اینٹ پتھر اور مٹی کی طرح بے حیثیت ہوجاتا ہے، لیکن جب تک اس کے اندر روح ہوتی ہے اور وہ کام کرتا ہے، دیکھتا ہے، بولتا ہے اور سنتا ہے اور دیگر کام انجام دیتا ہے تو اس کی ایک پوزیشن ہوتی ہے، اسکی ایک حیثیت ہوتی ہے، اس کی بات مانی جاتی ہے، اس کو اسٹیجوں پر بٹھایا جاتا ہے، اس کی خدمت کی جاتی ہے، لیکن

جن انسان مرجاتا ہے اور مردوں میں شامل ہوجاتا ہے تو وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو، اس کے مرنے کے بعد کوئی اسے بادشاہ نہیں کہے گا اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، اس کا حکم نہیں چلے گا، اس کی بات مانی نہیں جائے گی۔ اور مرنے کے بعد جو حیثیت اس کی سمجھی جاتی ہے وہ بھی دراصل دنیا کی زندگی کی وجہ سے ہے، جیسے کوئی بڑا آدمی مرجاتا ہے تو تین دن رکھ کر شوبازی کی جاتی ہے، بینڈ بجارہے ہیں، ناچ رہے ہیں اور اسے سلامیاں دی جارہی ہیں، جیسے کسی وزیراعظم کا انتقال ہوجائے، یا کوئی چیف منسٹر چل بسے تو یہ سب کچھ ہوتا ہے، لیکن اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ مرگیا ہے، بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے زندہ تھا، تو اس کی زندگی کی حیثیت اور نسبت کی وجہ سے یہ سب کیا جاتا ہے، اب جب مرگیا ہے تو وہی سلوک اس کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے جو دوسروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

باطنی زندگی اور باطنی موت

یاد رکھیں کہ جیسے ایک انسان کی ظاہری زندگی اور موت ہوتی ہے، اسی طریقہ پر اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی ایک باطنی زندگی اور باطنی موت بھی ہوتی ہے اور یہ ایک اتنا بنیادی و اساسی مسئلہ ہے کہ جگہ جگہ قرآن کریم میں اور محمد رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں اس کا ذکر ملتا ہے، جیسا کہ میں نے ابھی آپ کو قرآن کے حوالہ سے بتایا کہ قرآن میں کافر کو مردہ کہا ہے۔

پھر جیسے ظاہری زندگی بعض وجوہات کے سبب ہوتی ہے کہ کھانا، پینا، وغیرہ کہ کھانے، پینے سے یہ ظاہری حیات وابستہ ہے، اسی طرح کی اور کئی قسم کی چیزوں سے استفادہ کرتا ہوا انسان زندہ رہتا ہے، اور جب موت کا وقت آتا ہے تو انسان ختم کردیا جاتا ہے، اسی طرح باطنی موت وحیات کا تعلق بھی کچھ باطنی چیزوں پر ہے، وہ

کیا چیزیں ہیں؟ وہ دین ودینی امور ہیں، کہ جب انسان دین قبول کریگا اور اس کے مطابق اپنی زندگی میں چلے گا تو انسان کو باطنی زندگی ملے گی اور اگر دین کو قبول نہیں کرے گا یا اس کے مطابق اپنی زندگی میں نہیں رہیگا تو انسان ظاہری اعتبار سے زندہ رہنے کے باوجود بھی مردوں میں شامل ہوجاتا ہے۔ یہی ہے وہ حقیقت جسے قرآن کریم نے'' لِمَا يُحْيِيْكُمْ'' میں بتایا ہے۔

صحابہ زندہ تھے اور آج ہم مردہ ہیں

حضرات صحابہ میں اور آج کے دور کے مسلمانوں میں یہی فرق ہے کہ حضرات صحابۂ کرام، اللہ اور رسول کی دعوت کو قبول کرنے کی وجہ سے ظاہراً و باطناً زندہ تھے، اور ہم لوگ، اللہ اور اس کے رسول کی دعوت کو قبول نہ کرنے یا قبول کرنے کے بعد اس کے مطابق نہ چلنے کی وجہ سے ظاہراً زندہ ہونے کے باوجود باطنی طور پر مردہ ہیں۔

جس کی وجہ سے آج ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے، کوئی مقام نہیں ہے، کوئی پوزیشن نہیں ہے، اس لئے کہ مردہ کا کوئی مقام نہیں ہوتا، آج ہمارا حال اتنا برا ہوگیا ہے کہ ہرا یرا غیرا، گھٹیا کمزور اور ضعیف تر انسان بھی مسلمانوں کے خلاف زبان چلاتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، قرآن کے خلاف لب کشائی کرتا ہے، اسلامی قوانین میں دخل اندازی کرتا ہے، لیکن مسلمان آج کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے؛ کیوں؟ اس لئے کہ ہماری باطنی روح یعنی حب الٰہی، اطاعت رسول، سنتوں سے محبت نکل چکی ہے، اور ہمارا باطن مر چکا ہے۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ مردے لاکھوں ہوں یا کروڑوں ہوں، وہ نہ ہونے کے برابر ہیں، کیا ایک لاکھ مردے کوئی معمولی سا کام بھی کر سکتے ہیں؟ کیا ان سب کو ملا کر کھڑا کر دینے سے کوئی مضبوط طاقت وجود میں آسکتی ہے؟ ہم کو معلوم ہے

کہ لاکھوں مردے مل کر ایک مکھی کو بھی نہیں مار سکتے۔اس لئے اگر ہماری بات میں کوئی اثر نہیں اور ہماری جمعیت میں کوئی طاقت نہیں تو کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے ،کہ یہ عین سنت الٰہی کے مطابق ہے کہ مردے میں کوئی طاقت نہیں ہوتی ۔لہذا ہم میں بھی روحانی اعتبار سے کوئی طاقت نہیں ہے۔

اس کے برخلاف صحابۂ کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے ،معلوم ہوگا کہ روحانی زندہ انسان کیسا طاقتور ہوتا ہے ،اس کی کیا پوزیشن ہوتی ہے ،اس کا کیا مقام ہوتا ہے۔صحابہ کے نعروں میں وہ طاقت تھی کہ شاہی محلات میں زلزلہ بپا ہوجاتا تھا، اورساٹھ صحابہ ساٹھ ہزار کو شکست فاش دینے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔

بدر کے معرکہ میں تین سو تیرہ صحابہ کے سامنے جن کے پاس اسلحہ تک موجود نہ تھا، کافر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوگئے اور میدان جنگ سے ناکام ونامراد راہِ فرار اختیار پر مجبور ہوئے ، یہ صحابہ وہ تھے کہ دریا میں بےخوف وخطر گھوڑے ڈالدیتے تھے،اور سمندر پار کر جاتے تھے ،جنگل میں جاکر اعلان کرتے تو سارے جانور جنگل خالی کر دیتے تھے۔(دیکھو حضرت جی حضرت مولانا یوسف صاحب کاندھلوی کی عجیب وعظیم کتاب: حیاۃ الصحابہ)

صحابہ کا یہ مقام اور پوزیشن ، رعب ودبدبہ صرف اور صرف اطاعت رسول کی وجہ سے تھا، اگر وہ حیثیت وپوزیشن اپنے اندر لانا ہے تو پھر ضروری ہے کہ اللہ کے دین کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے ،اللہ سے تعلق قائم کیا جائے ،سنتوں کو گلے سے لگایا جائے۔

کیا ہم مسلمان نہیں؟ ایک سوال کا جواب

یہاں پر ہوسکتا ہے کہ کوئی سوال کرنے لگے کہ ہم سب تو ماشاء اللہ مسلمان

ہیں، دین کو مانتے ہیں، اللہ کو مانتے ہیں، رسول اللہ کو مانتے ہیں، ہمارا قرآن پر ایمان ہے، اس سے زیادہ ہم کیا کریں؟ اور پھر بھی آپ ہم کو مردہ کیوں کہہ رہے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں! ہم الحمدللہ مسلمان ہیں، ہمارا ماشاءاللہ قرآن پر ایمان ہے، ہم دین کو مانتے ہیں، اللہ کو مانتے ہیں، رسول اللہ کو مانتے ہیں، لیکن جیسا کہ میں نے اشارہ کیا کہ شریعت کے بہت سے اجزاء ہیں، ہم نے کچھ اجزاء کو مانا اور کچھ کو چھوڑ دیا ہے، ہر آدمی اپنے اعتبار سے غور کرے کہ وہ شریعت کی کتنی چیزوں کی اتباع کرتا ہے اور کتنی چیزوں کو چھوڑ دیتا ہے؟ کچھ لوگوں کو کچھ چیزیں شریعت کی پسند آتی ہیں تو وہ ان کو لے لیتے ہیں اور کچھ چیزیں پسند نہیں آتیں تو ان کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

یہ ہے وہ صورت جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہودیوں کی صفت میں بیان فرمایا ہے: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ (کیا تم اللہ کی کتاب کے بعض حصہ کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کر دیتے ہو) (البقرۃ:۵۸)

اسی آیت کے آگے ایک اور جگہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ: " اَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ " (کیا جب کبھی تمہارے پاس کوئی پیغمبر وہ چیز لیکر آیا جو تمہارے نفسوں کو پسند نہیں تھی تو تم نے اس کے ماننے سے تکبر کیا) (البقرۃ:۸۷)

اسی طرح ہم نے بھی بعض وہ حصہ لے لیا جو اپنے نفس کو پسند آیا، جس کے اندر آسانی نظر آئی، جس میں مفاد سمجھ میں آ گیا اور جو اپنے مزاج و نفس کے خلاف ہوا، جو اپنے مفاد کے خلاف تھا؛ اور جو مشکل نظر آیا، اس کو ٹھکرا دیا۔

بھائیو! یاد رکھو کہ اللہ کے دین کے بہت سے اجزاء ہیں، عقائد ایک جزء ہے،

عبادات ایک جزء ہے، اخلاقیات ایک جزء ہے، معاشرت ایک جزء ہے، معاملات ایک جزء ہے، اسی طرح سیاست بھی ایک جزء ہے، ان سارے ہی اجزاء کو مذکورہ آیت میں اللہ تعالی نے'' لِمَا يُحۡيِيۡكُمۡ'' کے اندر رکھ دیا ہے، اس لئے یہاں کسی خاص چیز کا نام نہیں لیا گیا، ''ما '' عربی میں عموم کے لئے آتا ہے، جس کی طرف بھی اللہ وراس کا رسول دعوت دے، اس میں ہماری حیات ہے، چاہے وہ شریعت کے ظاہری اجزاء ہوں یا باطنی اجزاء، اسی طرح وہ عقیدہ وعبادات سے تعلق رکھنے والے ہوں یا معاملات سے متعلق ہوں، تعلیم وتہذیب سے ان کا تعلق ہو یا اخلاق سے ہو، یا کچھ اور، تمام قسم کی تعلیمات '' لِمَا يُحۡيِيۡكُمۡ'' کے اندر پوشیدہ ہیں لہذا ان سب میں ہماری حیات ہے۔

ایک منافق کے متعلق حضرت عمرؓ کا فیصلہ

ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو نماز روزہ و دیگر عبادات میں تو قرآن و حدیث پر عمل کرتے ہیں، لیکن جب مسئلہ مال و دولت کا اور اپنے ذاتی یا خاندانی مفادات کا آتا ہے تو وہاں نہ اللہ یاد آتا ہے، نہ رسول کی پرواہ ہوتی ہے، نہ لوگوں ہی سے کوئی شرم وحیاء ہوتی ہے، بلکہ سب سے بالاتر ہوکر وہ اپنے مفاد کے لئے کوشش کرتے ہیں، چاہے اللہ راضی ہو یا نہ ہو، اللہ کا رسول خوش ہو یا ناخوش ہو۔ یہاں مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے جو ایک منافق و یہودی کے درمیان پیش آیا تھا، اس میں بھی وہی ہوا تھا کہ منافق نے اپنے مفاد کے لئے خدا کو دیکھا نہ رسول اللہ کو، بس اسے تو اپنا مفاد پیارا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک منافق اور یہودی کے درمیان ایک زمین کے مسئلہ میں اختلاف وجھگڑا ہو گیا، یہودی کا کہنا تھا کہ یہ زمین میری ہے اور منافق کا دعوی تھا کہ

میری ہے، یہودی نے کہا کہ تم مسلمان ہو تو چلو تمہارے نبی کے پاس ہی فیصلہ کرا لیتے ہیں، اب دونوں یہ مسئلہ لیکر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے، اور اپنے مابین اس زمین کے متعلق فیصلہ طلب کرنے لگے تو آپ ﷺ نے دونوں کی گفتگو سننے اور دونوں کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد یہودی کے حق میں فیصلہ کیا کہ یہ زمین یہودی کی ہے، اس مسلمان کی نہیں۔

آپ ﷺ کا یہ فیصلہ منافق کو پسند نہیں آیا۔ وہ یہودی سے کہنے لگا کہ یہ فیصلہ صحیح نہیں ہوا، لہذا ہم حضرت عمرؓ کے پاس اس کا دوبارہ فیصلہ کرائیں گے، اس پر بھی یہودی تیار ہو گیا۔ منافق دراصل یہ سمجھ رہا تھا کہ حضرت عمر چونکہ کافروں، یہودیوں کے متعلق سخت ہیں، وہ اس یہودی کو برداشت نہیں کریں گے اور معاملہ سنتے ہی میرے حق میں فیصلہ کریں گے۔

چنانچہ دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں پہنچے اور اپنے مسئلے کی تفصیل سنائی اور فیصلہ چاہا، اور یہودی نے یہ بھی کہہ دیا کہ حضرت! اس کا فیصلہ آپ کے نبی ﷺ میرے حق میں کر چکے ہیں، مگر پھر بھی یہ مسلمان (منافق) ماننے کو تیار نہیں، اور اس نے دوبارہ آپ سے فیصلہ کرانے کے لئے مجھے یہاں آپ کے پاس لایا ہے۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کیا حضور علیہ السلام نے فیصلہ کر دیا ہے؟ جواب دیا گیا کہ ہاں! حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم لوگ یہیں بیٹھے رہو، میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت عمر اندر گئے اور تلوار لا کر اس منافق کی گردن اڑا دی، اور فرمایا کہ جو آپ ﷺ کے فیصلہ سے راضی نہ ہو، اس کے حق میں عمر کا فیصلہ یہی ہے۔

اس کے بعد منافقوں نے شور مچایا کہ حضرت عمرؓ نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا، حضور کی خدمت میں شکایت لیکر آئے، اسی واقعہ کے متعلق اس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ:

﴿ فَلاَ وَرَبِّکَ لاَیُؤْ مِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِی أَنْفُسِھِمْ حَرَجاً مِمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً ﴾

(پس آپ کے رب کی قسم ہے کہ وہ لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ اپنے جھگڑوں میں حکم نہ مانیں اور آپ کے فیصلہ سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں اور بلا چوں و چرا قبول نہ کرلیں) (تفسیر ابن کثیر: ۱/۵۲۱)

معلوم ہوا کہ دین کی بعض باتوں کو ماننا اور بعض کا انکار کرنا منافقوں کی علامت ہے۔

حضور کے زمانے میں پیدا ہوتے تو!

آج ہم شریعت کی کتنی باتوں کو نہیں مانتے پھر بھی مسلمان کہلاتے ہیں، یہ اللہ کا احسان ہے کہ ہمیں اس زمانہ میں پیدا کیا، اگر صحابہ کے زمانے میں ہوتے تو منافقوں میں شمار ہوتے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ کاش ہم بھی حضور ﷺ زمانے میں ہوتے تو کتنا اچھا تھا۔ حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ لوگ بے خبری میں یہ جملہ کہہ دیتے ہیں، لیکن میں اس کو سنتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں، اس لئے کہ اگر ہم لوگ اُس زمانے میں ہوتے تو ہمارا حال بھی ابو جہل، ابولہب جیسا ہوتا، یہ اللہ نے بڑا اکرم کیا کہ اس زمانے میں ہم کو رکھ دیا، لیکن اُس زمانے میں ہوتے تو کوئی بات ہم نہ مانتے، ایک بھی بات نہ مانتے تو سوچو کیا حال ہوتا؟ کتنی باتیں آج ہم رد کرتے ہیں ظاہر میں باطن میں، حلال و حرام کے مسائل میں، تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔

اللہ و رسول کا ہر حکم ماننا ضروری، حضرت زینبؓ کا قصہ

الغرض دین کے تمام اجزاء کو ماننا ضروری ہے خواہ وہ کسی بھی معاملہ سے متعلق

ہو، حتیٰ کہ شادی بیاہ میں بھی موت وغمی کے مسائل میں بھی۔

قرآن میں حضرت زینب بنت جحش وحضرت زید بن حارثہ کا ایک قصہ آیا ہے جو اس سلسلہ میں ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ایک آیت ہے: ﴿مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْراً أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ (کسی مومن مرد وعورت کے لئے اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کا فیصلہ آجانے کے بعد اپنا اختیار استعمال کرے) (الأحزاب:۳۶)

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جبکہ اللہ کے نبی ﷺ کی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحشؓ کے نکاح کا مسئلہ درپیش تھا، حضرت زینبؓ اپنے علاقہ میں انتہائی خوبصورت مانی جاتی تھیں، خاندان بھی اعلیٰ وارفع یعنی قریش کا، اللہ کے نبی ﷺ کا خاندان عرب میں سب سے اونچا خاندان تھا، اسی اثناء میں اللہ کے نبی ﷺ نے ایک رشتہ بھیجا، وہ رشتہ کیا تھا؟ حضور ﷺ کے ایک منھ بولے بیٹے تھے، جن کا نام حضرت زید ابن حارثہؓ تھا، یہی وہ زید ہیں جن کا قرآن میں نام آیا ہے، ان کے سوا کسی اور صحابی کا نام قرآن میں نہیں ہے، اگر چہ کہ ان سے بڑے بڑے صحابہ ہیں، حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی وغیرہ، مگر کسی کا نام قرآن میں نہیں ہے، صرف حضرت زید کا نام قرآن میں آیا ہے، تو حضور ﷺ نے حضرت زینب کے لئے ان کا رشتہ بھیجا اور ان کے بھائیوں کو اس سلسلہ میں متوجہ کیا۔

لیکن ان کے گھر والوں کو یہ رشتہ پسند نہیں آیا، اس لئے کہ حضرت زید ایک تو تھے غلام، جن کو حضور ﷺ نے آزاد کر دیا تھا، دوسرے یہ کہ ان کا کوئی خاص نسب نہیں تھا اور عرب میں نسب کا بہت اعتبار ہوتا تھا اور تیسرے یہ کہ وہ کوئی بہت

خوبصورت حسین وجمیل بھی نہیں تھے، ان تینوں اعتبار سے حضرت زینبؓ ان سے بہت ہی اعلیٰ وارفع تھیں، اس لئے ان کے خاندان والوں کو یہ رشتہ پسند نہ آیا، اور تذبذب میں پڑ گئے کہ مانیں کہ نہ مانیں؟

اس وقت اللہ نے قرآن میں یہ آیت نازل فرمائی کہ کسی بھی معاملہ میں چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی چاہے وہ تمہاری عبادت سے متعلق ہو یا معاملات میں سے ہو، کسی بھی قسم کا معاملہ ہو، دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا کوئی مسئلہ ہو، جب اس میں اللہ اور اللہ کے نبی کا کوئی حکم آجائے تو کسی کو کوئی اختیار نہیں کہ اپنا بس چلائیں اور اپنی مرضی پر چلیں۔

دیکھئے یہاں شادی کا مسئلہ تھا، پسند ناپسند کا مسئلہ تھا، رسول اللہ نے کہہ دیا کہ یہ رشتہ ہے، اس کو قبول کرو، دوسری جانب سے کچھ تذبذب کا معاملہ آ گیا تو قرآن میں آیت نازل ہوگئی کہ اللہ کے رسول کی طرف سے ایک بات تجویز ہوا اور ان کی تجویز کو تم ٹھکرا دو اور اپنی مرضی پر تم چلنا چاہو تو اس کا مومن کو بالکل اختیار نہیں ہے۔

شادی میں دین کو مقدم رکھو

ہوسکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال آئے کہ جب اللہ کے رسول موجود تھے، اور آپ نے کوئی بات رشتہ کی کہی، تو اس کو نہ ماننا تو واقعی جرم ہے مگر جب آج اللہ کے رسول ہم میں نہیں ہیں تو ہم پر کیا ذمے داری ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کی شریعت میں جو احکام ہیں ان کو ماننا ہمارے لئے ضروری خواہ وہ کسی بھی باب سے متعلق ہوں، شادی کے متعلق ہوں یا کاروبار کے متعلق ہوں یا کسی اور چیز کے بارے میں ہوں۔ مثلاً حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا انتخاب حسب ونسب، مال وزر اور حسن وجمال کی بنا پر نہیں، بلکہ دین کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "تنکح المرأة لأربع :لمالها ولحسبها و لجمالها و لدينها ، فاظفر بذات الدين"' (عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال، اس کے نسب، اس کے جمال اور اس کے دین کی وجہ سے، تو دین والی کو اختیار کر کے کامیاب ہو جا) (مشکاۃ:۲۶۷)

اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "عورت سے اس کے حسن کی بنا پر نکاح نہ کرو کہ ممکن ہے کہ اس کا حسن اس کو ہلاک کر دے اور اس کے مال کے لیے بھی اس سے نکاح نہ کرو، کہیں اس کا مال اس کو سرکشی پر نہ ابھار دے اور اس کے دین کی بنا پر اس سے نکاح کرو، پس ایک دیندار کالی کلوٹی باندی بے دین حسین و جمیل عورت سے بہتر ہے۔ (سنن سعید:۱۲۵/۳)

غور کیجئے ان احادیث میں ،ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا انتخاب مال و دولت، حسب و نسب، حُسن و جمال کی بنیاد پر نہیں کرنا چاہئے ، بلکہ دین و دیانت، تقویٰ و پرہیز گاری، ایمان و اسلام، اعمال و اخلاق کی بنیاد پر ہونا چاہئے اور یہ حکم جس طرح مردوں کو ہے، اسی طرح عورتوں کو بھی ہے کہ وہ اپنے لیے دیندار شوہر پسند کریں۔ اسی طرح مرد و عورت کے ذمہ دار و سرپرستوں کو بھی اس کا حکم ہے کہ وہ اپنے لڑکے یا لڑکی کے لیے دیندار بیوی یا شوہر کا انتخاب کریں۔ اب اگر کوئی اس کے خلاف جمال کو یا مال کو نکاح میں معیار بناتا ہے تو کیا وہ رسول اللہ کے خلاف چلنے والا نہیں؟

جوڑا جہیز کا مطالبہ

اسی طرح اور بھی چیزیں ہیں، میں یہاں نکاح میں ہونے والے تمام خرافات

پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ دیکھئے، یہ حدیث تو بتا رہی ہے کہ نکاح کا مقصد مال و دولت نہیں، بلکہ یہ ہونا چاہئے کہ عفت وعصمت حاصل ہو، اور اس لئے رشتوں کے انتخاب میں دینداری کو مقدم رکھنا چاہئے، مگر کیا ہو رہا ہے؟ لوگ مال دولت سے اپنی حرص ولالچ کے پیٹ کو بھرنے کے لیے نکاح کرتے ہیں، مگر اس سے بھی ان کا یہ پیٹ بھرتا نہیں، بلکہ حرص ولالچ کی آگ اور بھڑک جاتی ہے اور کبھی کبھی کیا بلکہ بہت دفعہ یہ آگ بہت سی معصوم لڑکیوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ مگر اس پر بھی اس حریص ولالچی کو قرار نہیں آتا، بلکہ وہ دوسرے شکار کے لیے بے چین ہو کر تلاش شروع کر دیتا ہے۔ اللہ کے نبی نے سچ فرمایا: ''اگر آدمی کے پاس مال سے بھرے ہوئے دو جنگل ہوں تب بھی وہ تیسرے کی تلاش کرے گا اور آدمی کے پیٹ کو سوائے (قبر کی) مٹی کے کوئی چیز نہیں بھرتی'' (مشکوۃ:۴۵۰)

کیا اس سے بھی بڑا کوئی ظلم انسانیت پر ہو سکتا ہے؟ یہ سب کون ہیں جو کرتے ہیں، ہم مسلمان ہی تو یہ سب کر رہے ہیں۔

یہ تو ایک دو باتیں مثال کے طور پر میں نے عرض کر دی ہیں، ورنہ تو شادی کا مسئلہ اس وقت قیامت بنا ہوا ہے، اس لئے شادی کو آج ہم قیامت صغری کہیں تو بجا ہے۔

ہماری معاشرت کی تباہیاں

اسی طرح ہماری معاشرت کی جو حالت ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے، کہ انتہائی بری و تباہ کن ہو چکی ہے۔ کسی کا کوئی لحاظ وادب تو ایک جانب، ہم تو لوگوں کے حقوق بھی نہیں جانتے۔ ماں باپ کا حق کیا ہے، رشتوں کے کیا حقوق ہیں، پڑوسیوں کا کیا حق بنتا ہے؟

افسوس کہ آج ہماری معاشرت ایسی ہے کہ کسی کو کسی سے اطمینان وسکون

میسر نہیں، اگر میاں، بیوی کے حقوق ادا کرتا ہے تو بیوی اس کے حقوق ادا نہیں کرتی، اور اگر بیوی ادا کرتی ہے تو شوہر ادا نہیں کرتا، پھر ہر ایک صرف اپنا حق مانگتا ہے، دوسرے کے حقوق کی کمی کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ ایسی صورت حال میں آپسی جھگڑے و نزاعات کی فضاء قائم نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا؟ اسی لیے آج طلاقوں کی بھرمار ہے، خلع کی بھرمار ہے، اگر زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرے تو سرے سے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

اسلامی معاشرت میں بڑوں کا ادب

اب ذرا یہ بھی تو دیکھئے کہ اسلام نے کس طرح کی حسن معاشرت کی تعلیم دی ہے؟ اس کی چند جھلکیاں بھی دیکھتے چلئے۔ اسلامی معاشرت میں ایک چیز بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت بھی ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم و توقیر نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔ (الادب المفرد: ۷۵)

بڑوں کے ادب کا معاملہ خود اللہ کے رسول ﷺ کس طرح کرتے تھے؟ اس کے بارے میں صحابیِ رسول حضرت ابو طفیلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے مقام جوانہ میں رسول اللہ ﷺ کو گوشت تقسیم کرتے ہوئے دیکھا، ناگہاں ایک عورت آئی اور آپ علیہ السلام کے قریب ہوگئی، آپ نے اپنی چادر اس عورت کے لیے بچھائی اور وہ اس پر بیٹھ گئی، حضرت ابو طفیلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون عورت ہے، لوگوں نے بتایا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی وہ ماں ہیں، جنہوں نے آپ کو دودھ پلایا تھا۔ (مشکوۃ: ۴۲۰)

اسی طرح آپ نے دوسروں کو بھی اپنے بڑوں کا لحاظ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے والد حضرت ابو قحافہؓ فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے،

اور کافی بڑی عمر کے آدمی تھے، ان کے ایمان لانے کا واقعہ کتب سیرت میں تفصیل سے آیا ہے، اس میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے والد کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ یہ میرے والد ہیں اور ایمان قبول کرنے کے لیے آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس موقع پر فرمایا کہ ابوبکر! آپ نے ان کو کیوں تکلیف دی، میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔ (سیرت ابن ہشام: ۲/۴۰۶)

یہ ہے بڑوں کے بارے میں اسلام کی تعلیم اور ہمارا حال اس کے برعکس یہ ہے کہ بڑوں کے نام سے چڑ ہے، ان کی نافرمانی ہے، ان کے ساتھ گستاخیاں ہیں۔

پڑوسیوں سے حسن معاشرت

اسی طرح اسلام نے حسن معاشرت کی تعلیم دی تو اس میں پڑوسیوں کے ساتھ سلوک و برتاؤ کا حکم دیا ہے، کیونکہ پڑوس سے رابطہ و تعلق ہر آن ولحہ برقرار رہتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے ان سے سابقہ پڑتا ہے۔ لہٰذا معاشرت میں لطف و حسن پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ قرآن پاک میں حکم دیا گیا ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ احسان کرو اور لفظ احسان میں ہر بھلائی و خوبی نظر آجاتی ہے اور احادیث میں تو اس سلسلہ میں نہایت سخت تاکیدی احکامات آئے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ آپ سے پوچھا گیا کہ کون یا رسول اللہ؟ فرمایا کہ وہ جس کی ایذاؤں اور تکلیفوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہیں ہے۔ (بخاری: ۲/۸۹)

اسی طرح آپ نے پڑوسی کی خبر گیری کرنے اور اس کا تعاون کرنے کا حکم

دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ وہ مومن (کامل) نہیں ہوسکتا جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔ (الادب المفرد: ۲۹)

غور کریں اس کا کیا مطلب ہے؟ مطلب یہ ہے کہ پڑوسی کی خبر گیری کرنا چاہئے اور اگر وہ بھوکا ہو تو اپنے کھانے میں سے اس کو بھی دینا چاہئے، اگر کوئی ایسا نہیں کرتا اور خود سیراب ہوتا ہے تو فرمایا کہ وہ کامل ایمان والا نہیں ہوسکتا۔

اسی لیے آپ نے صحابہ کو تعلیم دی ہے کہ اپنے سالن میں ذرا پانی زیادہ کرو اور اپنے پڑوسیوں کو اس میں سے حصہ دو۔ (بخاری، ریاض الصالحین: ۱۴۵)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ حسن معاشرت کا تاکیدی حکم شریعت نے دیا ہے کہ ان سے سلوک اچھا ہو، ایذا و تکلیف نہ پہنچائی جائے ان کی خبر گیری کی جائے، اپنے کھانے میں سے ان کا بھی حصہ نکالا جائے، ضرورت پر اپنا دروازہ ان کے لیے بند نہ کرے۔

میں نے معاشرت کا ذکر ذرا وضاحت سے اس لئے کیا کہ لوگ اس کو اسلام کا جزء ہی نہیں سمجھتے، بلکہ لوگوں نے اس کو اسلام سے ہی خارج کر دیا ہے۔ جب اسلام سے ہی خارج کر دیا تو اس پر عمل کیا خاک کریں گے؟ اس لئے اس میں بڑی ہی کوتاہی ہے۔

معاملات کی دنیا کی ابتری

اس کے بعد ذرا اس پر بھی نظر ڈال لو کہ ہمارے معاملات کا کیا حال ہے؟ لوگ اس کو بھی اسلام سے خارج سمجھتے ہیں حالانکہ یہ دین کا بہت اہم شعبہ ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک بزرگ حضرت یوسف بن اسباطؒ کہتے ہیں کہ جب کوئی جوان عبادت میں لگتا ہے تو ابلیس (اپنی ذریت سے) کہتا ہے کہ دیکھو اس کا کھانا کیا

ہے؟ اگر اس کا کھانا حرام ہوتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کو نہ چھیڑو، تاکہ وہ مجاہدہ کرتا رہے اور تکلیف اُٹھاتا رہے، کیونکہ وہ حرام کھانے کی وجہ سے خود ہی اپنی ہلاکت کے لیے کافی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حرام و حلال کی تمیز نہیں ہوتی تو اس کی نیکیاں وعبادتیں بھی بیکار ہیں، اس لئے شیطان بھی اس کی عبادت کو کوئی قابل ذکر چیز نہیں سمجھتا تو اللہ کے یہاں اس کا کیا اعتبار ہوگا؟

ایک اور بزرگ حضرت اسحاق الانصاری کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ مرعشی نے لوگوں کو صف اول کے لیے دوڑتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ مناسب ہوتا کہ یہ لوگ حلال کے حاصل کرنے کی طرف ایسا ہی دوڑتے۔

اور حضرت فضیل بن عیاض کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری سے پوچھا گیا کہ صف اول کی فضیلت کیا ہے؟ فرمایا کہ تیری روٹی کا وہ ٹکڑا جو تو کھاتا ہے اس کو دیکھ کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟ پھر آخری صف ہی میں کھڑا ہو جانا۔

لہٰذا دین والے کو معاملات کی دنیا بھی صحیح کرنا چاہئے، مگر لوگوں نے اس کو دین سے خارج کر دیا اور اس وجہ سے اس میں من مانیاں کرتے ہیں، نہ حلال و حرام کی تمیز باقی رہی، نہ اچھے و برے کا کوئی فرق، نہ معاملات کی صفائی کا کوئی لحاظ رہا۔

حالانکہ حرام سے پرہیز کرنا بھی اللہ و رسول اللہ کی تعلیم ہے، ہم اس سے پرہیز کئے بغیر دین والے کیسے ہو سکتے ہیں۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''جو شخص حرام مال حاصل کرے گا اور اس سے صدقہ دے گا تو وہ صدقہ قبول نہیں کیا جائے گا، اور جو اس سے (اپنی ضرورت) میں خرچ کرے گا، اس میں برکت نہ ہوگی اور ترکہ میں اس کو چھوڑ کر مرے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہوگا''۔ (مشکوۃ:۲۴۲)

یہ حدیث حرام مال کی دنیوی واخروی نحوست کو صاف وصریح انداز میں بتارہی ہے۔اخروی نحوست تو یہ ہے کہ صدقہ قبول نہ ہوگا اور یہ حرام مال اس کا توشۂ جہنم بنے گا اور دنیوی نحوست یہ ہے کہ اس مال کو خرچ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت نہ دے گا۔

چنانچہ مشاہدہ بھی ہے کہ حرام مال میں برکت نہیں ہوتی، وہ مقدار میں زیادہ ہونے کے باوجود وہ نفع نہیں دیتا جو حلال مال دیتا ہے۔ چنانچہ آج لوگوں کے پاس مال تو بے حد ہے، مگر مال سے جو مقصود ہے یعنی راحت وسکون وہ حاصل نہیں، بلکہ مال میں اضافہ کے ساتھ ساتھ بے چینی میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے، یہی سب سے بڑی بے برکتی ہے۔ نیز ایک بے برکتی یہ بھی ہے کہ اس مال سے جو کام کرنا چاہتے ہیں وہ ہوتے ہوتے رک جاتا ہے اور کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ نیز مال حرام استعمال کرنے والے کی دعائیں قبول نہیں کی جاتیں۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''ایسا شخص جو دور دراز سے سفر کرکے (کسی متبرک جگہ) آئے اس طرح کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہوں اور سر سے پاؤں تک وہ غبار میں اٹا ہوا ہو، اور وہ خوب گڑگڑا کر دعا کرے اور کہے: اے میرے رب! اے میرے رب! لیکن اس کا کھانا پینا حرام مال سے ہو، اس کا لباس حرام ہو، اور اس کی پرورش حرام سے ہوئی ہو، تو اس حالت میں اس کی یہ دعا کیونکر قبول ہوگی؟ (مسلم ۱۶۸۶، ترمذی ۲۹۱۵)

حضرات صحابہ کی حرام سے احتیاط

ہمارے اسلاف کی زندگیوں میں حرام وحلال کی تمیز، اور حرام سے بچنے کا کیا حال تھا؟ تاریخ وسیرت کی کتابیں دیکھنے سے اس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ

حضراتِ صحابہ اور سلف صالحین حرام چیزوں سے نہایت درجہ احتیاط کرتے تھے۔ میرا لکھا ہوا ایک رسالہ ''تلاش حلال'' میں اس سلسلہ میں تفصیلات موجود ہیں۔

مثلاً حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت کا ایک غلام تھا، وہ ایک دن کچھ کھانا لایا، حضرت نے اس میں سے ایک لقمہ کھالیا، پھر آپ کو معلوم ہوا کہ یہ کھانا حرام ہے، کیونکہ غلام نے بتایا کہ وہ جاہلیت میں لوگوں کو غیب کی باتیں بتاتا تھا، یہ کھانا اسی کے عوض میں ملا ہے۔ حضرت صدیق اکبر نے فرمایا کہ تجھ پر تف ہے؛ تو نے مجھے ہلاک کر دیا۔ پھر آپ نے منہ میں ہاتھ ڈال کر قے کرنا چاہا، مگر قے نہ ہوئی۔ لوگوں نے کہا پانی پینے سے قے ہوگی۔ آپ نے پانی منگوایا اور آپ پانی پیتے جاتے اور قے کرتے جاتے، یہاں تک کہ پورا کھانا نکل آیا۔

لوگوں نے کہا کہ اس ایک لقمہ کے لیے آپ نے اتنی مشکل اٹھائی؟ فرمایا کہ اگر اس کے لیے میری جان بھی چلی جاتی تو بھی میں ضرور اس کو نکالتا، کیونکہ میں نے اللہ کے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جو جسم حرام سے پلا ہو وہ دوزخ کے زیادہ لائق ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ حضرت عمر بن الخطاب ؓ کی خدمت میں بحرین سے مشک و عنبر آیا، آپ نے کہا کہ واللہ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اچھی طرح تولنے والی عورت ہو جو اس مشک و عنبر کو تولے، تاکہ میں اس کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کروں، یہ سن کر آپ کی زوجہ حضرت عاتکہ بنت زید نے عرض کیا کہ مجھے اچھی طرح تولنا آتا ہے، دیجئے میں تول دوں، آپ نے فرمایا کہ نہیں، انہوں نے پوچھا کہ کیوں؟ فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس سے تم کچھ لے لو، اس طرح کہ تم اپنی گردن پوچھو اور اس کو یہ لگ جائے۔

ایک اور واقعہ سنئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کبھی کبھی اپنی بیوی کو بیت المال کا

عطر (مشک وعنبر) دیتے، وہ اس کو فروخت کرتی تھیں، ضرورت پر اس کو اپنے دانتوں سے توڑتی تھیں، اور اس میں سے کچھ ہاتھوں پر لگ جاتا، ایک دفعہ ایسا ہی ہوا تو انھوں نے اپنے دو پٹہ سے پوچھ لیا، حضرت عمر گھر آئے تو فرمایا کہ یہ کیا خوشبو ہے؟ ان کی زوجہ نے واقعہ بتایا، تو فرمایا کہ مسلمانوں کا عطر اور تم نے اس کو استعمال کر لیا؟ پھر ان کا دو پٹہ اتارا اور پانی سے دھوتے جاتے اور سونگتے جاتے تھے، جب تک وہ خوشبو رہی، برابر اس کو دھوتے رہے۔

ہماری دعا کیوں قبول نہیں ہوتی؟ ایک واقعہ

بعض بلکہ اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ ہم بڑی دعائیں کرتے ہیں، مگر برسہا برس ہوگئے، قبول نہیں ہوتیں، آخر ہماری دعا قبول کیوں نہیں ہوتی؟ حدیث نے اس کا جواب دے دیا کہ حرام غذا اور حرام لباس اختیار کرنے والوں کی دعا قبول نہیں کی جاتی، آج بہت سے مسلمان بلکہ نمازی، حاجی اور بڑی بڑی دینی خدمات میں لگے ہوئے لوگ حرام سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتے، پھر کیوں کر دعا قبول ہوگی؟

ایک بزرگ کہیں جارہے تھے، راستہ میں ایک شخص نے نہایت اصرار سے ان سے عرض کیا کہ میرے ساتھ بیٹھ کر آپ کھانا کھائیں، بزرگ نے اس کی درخواست پر اس کے ساتھ کھانا کھالیا پھر آگے چل پڑے، کچھ دور جانے کے بعد وہ اپنے راستہ سے بھٹک گئے اور باوجود کوشش کے ان کو راستہ کا علم نہ ہوسکا۔ بار بار اللہ سے دعا کی مگر دعا قبول نہ ہوئی، بڑے پریشان ہوئے جنگل کا بیابان راستہ، رات کا تاریک ماحول، وحشت ناک سناٹا، مگر راہیں بند ہیں، آخر کار ایک اور بزرگ کا ادھر سے گذر ہوا اور انہوں نے بتایا کہ تم نے جو کھانا فلاں آدمی کے ساتھ کھایا تھا وہ حرام تھا، اس لیے تمہاری دعا قبول نہیں ہو رہی ہے، پہلے اس کی تلافی استغفار کے ذریعہ

کرو، تو پھر راستہ کھول دیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ الغرض دعا کی قبولیت کے لیے حرام سے بچنا لازم ہے۔ ورنہ دعا قبول نہیں ہوتی۔

میراث میں خیانت

بات آئی ہے تو یہ بھی عرض کردوں کہ بہت سے نمازی و حاجی لوگ بھی اپنے والدین کی میراث میں صحیح تقسیم نہیں کرتے، اور بعض لوگ اپنی بہنوں کا یا بھائیوں کا حصہ دبا لیتے ہیں۔ یہ بھی حرام ہے کہ میراث سے کسی وارث کو محروم کردیا جائے، اور اس کا حصہ نہ دیا جائے، اور اس پر خود قابض ہو جائے، آجکل یہ وبا بھی عام ہوتی جارہی ہے کہ ایک وارث سب مال میراث پر قابض ہو جاتا ہے اور دوسروں کو محروم کردیتا ہے، اور بعض لوگ وارث بھی نہیں ہوتے اور وہ دوسروں کی جائیداد پر قبضہ کر لیتے ہیں اور وارثین کو محروم کردیتے ہیں، اور بعض جگہ یہ رواج ہے کہ بھائی لوگ میراث کا کل مال لے لیتے ہیں اور اپنی بہنوں کو اس سے محروم کردیتے ہیں۔ یہ سب دین و دنیا دونوں کی ہلاکت کا سامان ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ "مَنْ قَطَعَ مِيْرَاثًا فَرَضَهُ اللّٰهُ قَطَعَ اللّٰهُ مِيْرَاثَهُ مِنَ الْجَنَّةِ "(جس نے اللہ کے فرض کردہ کسی کی میراث کا حصہ کاٹ لیا اللہ تعالے جنت کی میراث سے اس کا حصہ کاٹ دیں گے)(شعب الایمان:۶/۲۲۴، سنن سعید:۱/۹۶)

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: "مَنْ أَبْطَلَ مِيْرَاثًا فَرَضَهُ اللّٰهُ فِيْ كِتَابِهِ أَبْطَلَ مِيْرَاثَهُ مِنَ الْجَنَّةِ "(جس نے کسی کی میراث جو اللہ نے اپنی کتاب میں فرض کی ہے اس کو باطل کرے گا تو اللہ اس کی جنت کی میراث کو باطل کردے گا)(مصنف ابن ابی شیبہ:۶/۲۴۰)

الغرض میراث پر خود قابض ہو جانا اور وارثین کو اس سے محروم کر دینا اور اس میں اللہ کے مقرر کردہ حصوں میں وارثین کی رضا کے بغیر کمی بیشی کرنا سب حرام و ناجائز ہے۔ بہ ہر حال دین سب شعبوں کا نام ہے اس لئے ہمیں سب امور دین پر عمل کرنا چاہئے، صرف نماز پڑھ لینے کا نام دین نہیں، صرف حج پر حج کر لینے کا نام دین نہیں۔ آخر سوچئے کہ ان سب تعلیمات پر ہم عمل نہیں کریں گے تو کون ان پر عمل کرے گا؟ اور اللہ ورسول کا کس سے مطالبہ ہے کہ ان پر عمل کرو، ہم بندوں ہی سے تو ہے اور بالخصوص ان بندوں سے جو اس کے دین کو ماننے کا دعوے کرتے ہیں، لہذا اس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

عبرت ونصیحت

دوستو! ایک بات یاد رکھو کہ جب اللہ کے نبی ﷺ کی کسی بات کو ٹھکراؤ گے تو ضرور کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھاؤ گے، ٹھکرانے والے کو ٹھوکر ضرور لگے گی، اس لئے یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارا ہر طرز عمل اللہ اور اس کے رسول کے موافق ہو۔ آج ہماری قوم قومی اعتبار سے مردہ قوم ہے، اگر زندہ قوم کو دیکھنا چاہو تو دیکھو حضرات صحابہؓ کو، وہ تھے دراصل زندہ۔

حیاۃ الصحابہ میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ جہاد میں حضرات صحابہ جا رہے تھے، ایک علاقہ میں اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہیں تو وہاں کے بادشاہ کے محل میں زلزلہ آ جاتا ہے، صرف ''اللہ اکبر'' کی صدا میں بادشاہ کے محل میں زلزلہ آ گیا۔ آج کی اذان میں وہ طاقت نہیں، کیوں؟ وجہ وہی ہے کہ مردہ آواز میں طاقت نہیں ہوتی۔

اطباء لکھتے ہیں کہ جو انگور کی بیل قبرستان کی ہو اور اس سے شراب بنائی جائے تو اس میں نشہ نہیں ہوتا؛ کیوں؟ اس لئے کہ مردہ زمین سے آئی ہے، جب مردہ زمین

میں بوئے جانے والے ایک پھل کا یہ اثر ہو تو جب ہم خود مردہ ہو جائیں تو ہمارے اندر کیا طاقت ہو گی۔

اس لئے آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو زندہ بنانے کی فکر کریں، اور ہماری زندگی اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول میں پوشیدہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اطاعت الٰہی اور اطاعت رسول کی دولت عطاء فرمائے۔